مسلمانوں کا روشن مستقبل
سید طفیل احمد منگلوری

مسلمانوں کا روشن مستقبل

مؤلفہ

سید طفیل احمد منگلوری علیگ

◎

حماد الکتبی - شیش محل روڈ ○ لاہور

ضابطہ

نام کتاب ——— مُسلمانوں کا روشن مستقبل

تعداد ——— ایک ہزار

مطبع ——— بدر رشید پرنٹرز ۔ لاہور

اِنتساب

میں اس کتاب کو

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب

مرحوم و مغفور

سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے نام نامی پر

معنون کرتا ہوں

جن کے ساتھ میری عمر کے چالیس سال گزرے اور جن کے فیض صحبت
سے اور جنکی رہنمائی میں میرے قومی اور سیاسی خیالات کا نشوونما ہوا

طفیل احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

از خان بہادر مولوی محمد بشیر الدین صاحب

اسلامی سلطنت کا آفتاب غروب ہو جانے پر انگریزی سلطنت کا دَور شروع ہوا اور ۱۸۵۷ء میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہوا جس میں مسلمانوں کی بڑی تباہی ہوئی، اُن کی فلاح و بہبود کے لئے ۱۸۶۷ء سے سر سیّد احمد خاں صاحب نے مذہبی اور تمدنی اصلاح کا کام شروع کیا اور تعلیم کے لئے ایک اسکیم بنائی جس کے مطابق مئی ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی علی گڑھ کالج کا اثر روز بروز قوم میں بڑھتا گیا اور وہ نہ صرف مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کا بلکہ تمام ہندوستان کی اسلامی سیاست کا مرکز بن گیا۔ علی گڑھ کی اس تحریک کو شروع ہوئے اب ۷۶ سال ہوئے ہیں۔ اس مدت مدید میں ہندوستان میں بہت کچھ حالات بدل چکے ہیں اور نئی نئی صورتیں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔

نئے نئے لوگ نہایت نیک نیتی اور جوش کے ساتھ اصلاح کے لئے قدم اُٹھاتے ہیں مگر پچھلے حالات سے ناواقفیت کی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ کم از کم ایک صدی کی مفصل قومی تاریخ ہمارے نوجوانوں کے سامنے موجود ہو اس ضرورت کو محسوس کر کے مولوی سیّد طفیل احمد منگلوری نے نہ صرف ایک صدی بلکہ گزشتہ تین صدیوں کی قوم و ملک کی مذہبی و اقتصادی تعلیمی و سیاسی تاریخ مرتب کردی ہے اس تاریخ کے متعلق اظہار رائے کرنے سے قبل میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس اہم کام کی اہلیت مصنف مذکور میں کہاں تک تھی۔ مولوی طفیل احمد مدرسۃ العلوم کے ابتدائی کلاس میں ۱۸۷۹ء میں داخل ہوئے جب اس کو

قائم ہوئے صرف چار سال ہوئے تھے۔ میں نے انہیں پہلی بار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ۱۸۹۰ء میں دیکھا۔ جب کہ وہ ڈیوٹی کی دوکان میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ قومی کاموں میں اُن کے شریک کار طلبار کی امداد کے لئے یہ مفید جماعت اُسی سال قائم ہوئی تھی۔ مولوی طفیل احمد نے اپنی عمر کا ایک حصّہ علی گڑھ کالج کے اولڈ بوائز کو متحد کرنے اور ان کی ڈائرکٹری مرتب کرنے میں صرف کیا۔ ان کا یقین تھا کہ علی گڑھ کے سابق طلبار ہی سر سید کے مشن کی تکمیل کر کے مسلمانوں کو ہندوستان میں معزز بنا ئیں گے۔ وہ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی مسلم یونیورسٹی کورٹ کے رکن اور اس کی اگزکیٹو کاؤنسل کے ممبر اور بارہ سال تک آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری جوائنٹ سکریٹری رہے۔ جس سے انہیں مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا پورا پورا علم اور تجربہ ہوا۔ مختلف مقامات میں اسلامیہ اسکول قائم کرانے کے علاوہ خود انہوں نے علی گڑھ میں غریب طلبار کے لئے مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول قائم کیا جو مسلم یونیورسٹی کے تحت میں اٹھارہ سال سے چل رہا ہے اور یہ اس کے مینیجر ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک سے مولوی سید طفیل احمد اٹھاون سال سے تعلق رکھتے ہیں۔

تعلیمی کاموں کے علاوہ مسلمانوں کے عام افلاس کو محسوس کر کے انہوں نے دس سال تک اپنی تصانیف اور رسالہ "سود مند" کے ذریعہ مسلمانوں کو کفایت شعاری روپیہ کے کاروبار اور تجارت کی طرف متوجہ کیا۔ اس کام کی وجہ سے انہیں مسلمانانِ ہند کی مالی حالت معلوم کرنے کا اچھا موقعہ ملا۔ پھر چار سال تک صوبہ متحدہ کی کونسل کے ممبر رہ کر اُنہوں نے سیاسیات کا عملی تجربہ حاصل کیا اور اس مضمون پر ایک کتاب "حکومتِ خود اختیاری" لکھی جو ملک میں مقبول ہوئی۔ پس قومی مسائل میں اس ہمہ گیری اور مسلمانوں کی بے لوث، بے ریا اور بلا معاوضہ خدمت کرنے کی وجہ سے وہ اس کے مستحق ہیں کہ مسلمان اُن کی اِس تصنیف کو توجّہ کے ساتھ پڑھیں۔ مصنّف کے اس قدر

تعارف کے بعد اب میں چند الفاظ خود کتاب کے بارہ میں لکھتا ہوں۔

عام خیال یہ ہے کہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی مسلمانوں کی قوم کمزور اور مضمحل ہو گئی تھی۔ مگر اس کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سلطنت جانے کے بعد مسلمانوں میں بیسویں صدی کے شروع میں ایسے رہنما پیدا ہوئے جنہوں نے اصلاحِ تعلیم اور مذہب کے ساتھ قوم کی تنظیم کی جس سے سنہ [illegible] تک مسلمانوں نے اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد جدید تعلیم کا دور شروع ہوا جس میں مسلمانوں کو اپنی قومی حالت پر نظر ڈالنا ضروری تھا۔ اس میں مسلمانوں کو ان کے گزشتہ عروج و اقبال کی یاد تازہ کرنے کے لئے قومی مرثیہ خوانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اگرچہ عارضی طور پر یہ نسخہ مفید ثابت ہوا لیکن مستقل طور پر اس کو عمل کرنے سے مسلمانوں پر افسردگی اور پژمردگی چھا گئی۔ جس سے ان کے قوائے عمل مضمحل ہو گئے اور یہ کیفیت ہو گئی کہ عرصہ سے انہیں اپنے میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ مصنف نے اس قسم کے یاس انگیز خیالات کو قوم کے دل سے نکالنا چاہا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ کس حد تک ان میں ترقی کی قابلیت پیدا ہو گئی ہے اور ایسے سامان مہیا ہو گئے ہیں کہ وہ ترقی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ امید ہے کہ یہ نظریہ قوم کی ہمت بڑھا کر انہیں دلدل سے نکالنے کا موجب ہو گا۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اوّل دس بنیادی حقوق کو تفصیل سے بیان کر کے تاریخ کے ہر دور کی جانچ انہیں بنیادی حقوق کے ذریعہ کی ہے جس سے ہر زمانہ کی دینی، تعلیمی اور سیاسی حالت مثل آئینہ کے واضح ہو گئی ہے۔ یہ کتاب دس بابوں پر مشتمل ہے اور تقریباً ہر باب ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مگر مصنف نے مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی پر ایسا مواد جمع کر دیا ہے کہ جسے پیشِ نظر رکھ کر ہماری یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور قوم کے نوجوان قابل اب مزید تحقیقات کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی واقفیت اور راہنمائی کے لئے

مفید معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ ماحصل کلام یہ ہے کہ یہ کتاب اُن واقعات کو عالم فراموشی میں پڑے ہوئے تھے روشنی میں لاتی ہے اور تمام پیچیدہ مسائل کی خواہ وہ تمدنی ہوں یا اقتصادی، سیاسی ہوں یا تعلیمی عقدہ کشائی کرتی ہے۔ اس لئے مجھے اُمید ہے کہ وہ مقبولیت کا وہی درجہ حاصل کرے گی جس کی وہ مستحق ہے۔

خاکسار

محمد بشیر الدین

اٹاوہ

۳۰ نومبر ۱۹۳۷ء

طبع اوّل: میں بچپن سے یہ سنتا آیا ہوں کہ مسلمان ہر اعتبار سے دیگر اقوام سے پسماندہ ہیں۔ ان کی حالت روز بروز گرتی جاتی ہے اور وہ ایک لاعلاج مرض میں مبتلا ہیں۔ مگر اس کے ساتھ میں دیکھتا ہوں کہ جاں بازی اور مالی قربانی کے وقت وہ کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ اس کی وجہ سے بعض وقت مجھے خیال آتا تھا کہ مسلمان مہلک مرض میں نہیں بلکہ کسی عارضی بیماری میں مبتلا ہیں۔ میں اسی کشمکش میں رہتا تھا کہ مجھے ایک بار مسلمانوں کے ایک سیاسی جلسہ میں شرکت کی نوبت آئی۔ اس کے مباحثوں اور تقریروں سے مجھ پر یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں کا اونچا طبقہ شدت خوف اور ہیبت میں مبتلا ہے۔ اور اس کا کم و بیش اثر تمام قوم پر ہے۔ تب سے میں اسی جستجو میں رہا کہ ان کے اس مرض کی تحقیق کروں۔ اس کے لئے مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی کا مطالعہ کیا اور متعدد تاریخیں اور قومی انجمنوں اور اداروں کی روئدادیں پڑھیں۔ ان سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمان نہ سلطنت جانے سے پست ہوئے تھے اور نہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بربادی سے مضمحل یا افسردہ ہوئے تھے۔ البتہ انیسویں صدی کے آخر میں کچھ ایسے سامان پیدا ہوئے جن سے وہ ایک خیالی خوف میں مبتلا ہو گئے اور ان کی ذہنیت مردہ ہو گئی۔ اس نے ان کے قوائے عقلی اور جسمانی کو مضمحل کر دیا مگر چونکہ ان کا قومی جسم صحیح تھا اور کسی خطرناک مرض میں مبتلا نہ تھا اس لئے بالآخر ان سے خوف و خطر کی ذہنی کیفیت دور ہونے لگی۔ اور خدا کے فضل و کرم سے وہ اب اپنی اصلی حالت پر آتے جاتے ہیں اور ان کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ میں نے جو رائے قائم کی ہے وہ گزشتہ تین سو سال کے واقعات اور حالات پر مبنی ہے جنہیں میں اس کتاب کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

میں اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں وہ بہ لفظہٖ درست ہے۔ لیکن اس قدر ضرور عرض کر سکتا ہوں کہ میں نے قیاس اور اٹکل سے خیالات قائم نہیں کئے بلکہ واقعات کے مطالعہ کے بعد کئے ہیں۔ اسی لئے بزرگانِ قوم کی خدمت میں مستدعی ہوں کہ وہ ان واقعات کا مطالعہ توجہ کے ساتھ فرمائیں جن کی بنا پر میں نے یہ رائے قائم کی ہے۔

یہ کتاب ہرگز پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتی اگر مولوی نظام الدین حسین صاحب بدایونی میری مدد نہ کرتے۔ ان کے علاوہ دیگر احباب و اعزا نے مختلف صورتوں میں میری اعانت کی جن کی مہربانیوں اور توجہات کا میں دلی شکرگزار ہوں اُن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

بدایوں میں:- مولوی سبطین احمد صاحب۔ مولوی مبین احمد صاحب۔ منشی قمر الحسن صاحب قمرؔ اور اصید الدین صاحب مہتمم نظامی پریس۔

علی گڑھ میں:- مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی۔ پروفیسر محمد حبیب صاحب۔ سید الطاف علی صاحب علیگ۔ اور سید حزار حسن صاحب کاظمی۔

سہارنپور میں:- حاجی مولوی منظور النبی صاحب۔ اور سید محمد احمد صاحب کاظمی (حال وکیل ہائی کورٹ الہ آباد)۔

حفیظ احمد منگلوری

ولایت منزل۔ علی گڑھ

۲۰ نومبر ۱۹۳۲ء

۹۔ مجلس احرار کی پالیسی کی توضیح کی قراردادیں بشمول حکومتِ الہیہ کے منصوبے کے۔

۱۰۔ پاکستان کے منصوبہ کی نوعیت۔

طفیل احمد منگلوری

ولایت منزل۔ علی گڑھ

دسمبر ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اوّل

تمہید

بنیادی حقوق پر ایک نظر

تنزل کے احساس کی ابتدا

عام طور پر سمجھا جاتا ہے جو صحیح بھی ہے کہ مسلمانانِ ہند کا آفتابِ عروج و اقبال اس وقت سے زائل بہ انحطاط ہوا جب سے کہ ہندوستان میں اُن کی حکومت پر زوال آیا۔ گویا حکومت کا خاتمہ اُن کے تنزل کا آغاز ہے مگر مسلمانوں کو اپنے تنزل اور پستی کا واقعی احساس اب سے تقریباً ستر سال قبل سنہ ۱۸۶۵ء کے قریب ہوا اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سر سید احمد خان مرحوم نے اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت مسلمانوں نے پہلی دفعہ یہ محسوس کیا کہ اُن کی اصلاح و ترقی کی جو ذمہ داریاں پہلے حکومت پر تھیں۔ وہ اب اُن کی طرف منتقل ہو گئی ہیں۔ اور آیندہ اُن کی ترقی محض اپنے زورِ بازو اور قوتِ عمل پر منحصر ہے۔ غرض سر سید کی تحریک نے مسلمانوں میں ایک گونہ احساس پیدا کیا۔ اور انہوں نے اپنے از دست رفتہ عروج اور وقار کے حاصل کرنے کے لئے اپنے محدود وسائل کے مطابق کوشش شروع کر دی جس کا آغاز سب سے پہلے شمالی ہند میں اس طرح ہوا کہ سنہ ۱۸۷۵ء میں سر سید کی سعی و ہمت سے علی گڑھ میں محمڈن کالج قائم ہوا۔ اور اُس کے گیارہ برس بعد سنہ ۱۸۸۶ء

تعلیمی کانفرنس قائم کی گئی۔ نیز اسی زمانہ میں صوبہ پنجاب میں انجمن حمایت اسلام لاہور
وجود میں آئی۔ اور اس نے اپنی تعلیمی جدوجہد کا آغاز کیا اور پہلے ایک درس گاہ قائم
کرکے رفتہ رفتہ تمام پنجاب میں اپنی تعلیمی تحریک کو پھیلا دیا۔ اسی طرح بمبئی و سندھ
مدراس و بنگال میں اسلامی انجمنیں قائم ہوئیں۔ جنہوں نے اسکول اور کالج قائم کئے
اور ابتدائی تعلیم کی اشاعت میں عملی طور پر سرگرمی ظاہر کی۔ ان انجمنوں نے نہ صرف
انگریزی تعلیم کے لئے اسکول جاری کئے بلکہ عربی مدارس و یتیم خانے بھی قائم
کئے۔ اس کے علاوہ ترقی کی دوسری راہوں پر بھی توجہ کی۔ اور مسلمانوں کی اصلاح و
فلاح کے لئے بہت سی مذہبی و سیاسی تحریکیں بروئے کار آئیں اور ہر جگہ کچھ نہ
کچھ ہونے لگا۔

قومی مرثیہ خوانی کا اثر ذہنیت پر

مگر مسلمانوں کی یہ نہایت عجیب اور افسوسناک بدنصیبی ہے کہ قوم کی تباہی و بربادی کا
جو مرثیہ ۱۸۵۷ء میں شروع ہوا تھا اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے بلکہ اس میں روز
بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ہماری ہر قومی مجلس ایک ماتم کدہ بنی ہوئی ہے اور ہر طرف رونے دھو
نے اور شیون کی صدائیں بلند ہیں۔ جدھر جاؤ یہی رونا ہے کہ مسلمان تعلیمی، مالی اور
سیاسی حیثیت سے دوسری قوموں کے مقابلہ میں پست ہیں اور ان کی تمدنی و
اقتصادی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ گویا آج صفحۂ ہستی پر ان سے زیادہ کمزور و بدنصیب
و برگشتہ قسمت کوئی دوسری قوم نہیں ہے۔ اس قسم کے یاس انگیز اور ہمت شکن
خیالات خواہ وہ کس قدر مبنی بر حقیقت کیوں نہ ہوں مگر مسلمانوں میں مایوسی اور پست
ہمتی کے جذبات پیدا کر رہے ہیں۔ اس سے ان میں اعتماد علی النفس اور خودداری باقی نہیں
رہی اور ان کے قوائے عمل میں انحطاط اور اضمحلال پیدا ہو گیا اور کوئی حوصلہ اور
ولولہ باقی نہیں رہا۔ ان کی کمزوری اور بے کسی کی داستان اس قدر بار بار دہرائی گئی

ہے کہ وہ واقعی طور پر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہندوستان میں ان کی قومی زندگی خطرہ میں ہے، اس لئے آٹھ کروڑ ہونے پر بھی وہ سہمے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دوسری قومیں رفتہ رفتہ انہیں ختم کر دیں گی یا اپنے میں جذب کر کے ان کی مستقل ہستی کو مٹا دیں گی۔ یہ امر ہماری قومی حیات اور زمانہ مستقبل کے لئے حد درجہ خطرناک ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی اس عام ذہنیت کا اثر نوجوانوں اور بچوں کو کمزور بزدل اور خوف زدہ بنا رہا ہے۔ گویا ترقی کے تمام ولولے اور شریفانہ جذبات فنا ہو گئے ہیں۔ اب نہ دلوں میں اُمنگ ہے اور نہ جوش و خروش بلکہ افسردگی سب پر چھائی ہوئی ہے۔ اس ذہنیت کا ایک افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود اپنی نظروں میں حقیر ہو گئے اور اپنے کاموں کو کسی قسم کی اہمیت نہیں دیتے وہ سمجھتے ہیں کہ دوسری قومیں جو کچھ کر رہی ہیں اُس کے سامنے ہمارے سارے کام اور ہماری ساری جدوجہد ہیچ اور ناقابل التفات ہے اور گزشتہ ساٹھ ستر برس میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ محض سعی لاحاصل اور کوشش بے ثمر ہے یہاں تک کہ اخلاقی حیثیت سے بھی وہ دوسروں کو اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ جرأت اور ہمت، دوراندیشی اور دلیری، وسعت نظری اور ذہنی صفات میں بھی دوسری قومیں ہم سے بلند و برتر ہیں اور ان کے کارنامے ہر لحاظ سے شاندار اور لائق ستائش ہیں۔ اس ذہنیت نے ان کے دست عمل کو مفلوج اور قوائے عقلی کو شل کر دیا ہے۔

مسلمانوں میں امنگ پیدا کرنے کی ضرورت

ایک طرف تو مسلمانان ہند کے متعلق یہ کیفیت ہے دوسری طرف دیگر اقوام کی طبیعتوں میں ترقی کا ایک جوش ہے اور ان کے سامنے آزادی کامل کے حصول کا منصوبہ ہے جس میں صرف ایک

حصہ نہ لے۔ مسلمان شریک ہیں۔ پس وقت کی سب سے بڑی اور مقدم ضرورت ہے کہ
مسلمانوں کے پچھلے کاموں کا جائزہ لیا جائے اور اگر واقعی انہوں نے کچھ کیا ہے
تو یہ وقت اُن کی غفلت اور کوتاہ عملی پر ملامت کرنے کی جگہ ان کے کاموں کو
نمایاں کیا جائے تاکہ اُن میں از سرِ نو کام کرنے کا ایک ولولہ اور اُمنگ پیدا ہو۔ وہ دوبارہ
ایک تازہ جوش و ہمت کے ساتھ کام کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں جب
وہ محسوس کریں گے کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے تو ان کا حوصلہ بڑھے گا۔ اور دوسری قوموں
کی برتری و غلبہ کا خوف اُن کے دلوں سے دُور رہے گا۔ اُن کے قوائے عمل میں
جنبش پیدا ہوگی۔ اُن کی ذہنیت میں تبدیلی ہوگی اور وہ سمجھیں گے کہ جسمانی دماغی بلکہ
روحانی قوتوں کے لحاظ سے وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ اس طرح اپنے مستقبل کے
متعلق انہیں مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہ ہوگی۔

بنیادی حقوق کی تفصیل

گزشتہ سطور میں لکھا گیا ہے کہ سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے پچھلے کاموں کا
جائزہ لیا جائے۔ مگر جائزہ لینے سے پہلے یہ ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ تاریخ
کے ہر دور میں انسانی افراد کا سیاسی اتحاد چند بنیادی حقوق کی حفاظت اور ان کے
استحکام کی خاطر قائم ہوا اور قدیم سے قدیم زمانوں کی حکومتیں اُن حقوق کا تحفظ اپنا
فرض اور اپنے وجود کی غایت سمجھتی رہی ہیں۔ تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ان
حقوق کی نوعیت اور تعداد بدلتی اور بڑھتی رہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا
کہ حکومت کی ہر شکل خواہ وہ جمہوریت یا بزورِ شمشیر قائم کی ہوئی شخصی سلطنت ہو، محکوم
افراد کے چند حقوق تسلیم کرتی رہی ہے۔ مثلاً رعایا کے جان و مال کی حفاظت اور مظلوم
کی داد رسی ہر حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے۔ غزنی کے سلطان محمود کو ایک شخص نے [illegible]
[illegible] میں [illegible] رکھنے کی قسم میں سکتا [illegible] تو نہیں فتح ہی کیوں

کیا تھا ظاہر کرتا ہے کہ یہ حقوق کس قدر عام مسلّمات میں داخل تھے۔ اور جوں جوں زمانہ
گزرتا گیا حکومتوں کا دائرۂ عمل وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ انسانی کاروبار اور معاشرتی
زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ رہا جس کو حکومت کے دائرہ اثر سے باہر کہا جا سکے۔ نتیجہ
یہ ہوا کہ حکومتوں کی ذمہ داریاں بڑھتی گئیں۔ بہ الفاظ دیگر وہ حقوق جو محکوم حاکم سے
اور رعیت راعی سے طلب کر سکتی تھی تعداد میں زیادہ ہوتے گئے مثلاً جہالت،
ناداری اور بیماریوں کا انسداد سب کے سب حاکم وقت کے فرائض میں داخل
ہو گئے۔

ان ہی حقوق کی حفاظت کا انتظام اور ان ہی فرائض کو پورا کرنے کا نام
سیاست ہے۔ یوں تو ان حقوق کی فہرست بہت طویل ہو سکتی ہے لیکن ہم یہاں
صرف دس منتخب حقوق کا ذکر کرتے ہیں جن کو ہم بنیادی حقوق قرار دے سکتے
ہیں۔ ان ہی حقوق کو معیار قرار دے کر ہم اپنے گزشتہ اور جدید آئین کا جائزہ
لیں گے اور دیکھیں گے کہ ہماری قدیم و جدید دور حکومتیں ان کو محفوظ رکھنے میں کس حد
تک کامیاب رہی۔ وہ حقوق یہ ہیں:۔

روٹی کا مسئلہ اس زمانہ میں سب سے اہم مسئلہ روٹی کا ہے اور
اسی لئے ایک شائستہ اور آئینی حکومت کا یہ ایک
اہم فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ عام افراد کے لئے قوت لایموت یعنی اس قدر غذا بہم
پہنچائے کہ وہ اپنی روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھ سکیں۔ بعینہٖ اسی طرح عہد قدیم
میں بھی قوم کے سرداروں یا بادشاہوں کا یہ فرض سمجھا جاتا تھا کہ وہ رعایا کے لئے
خوراک کا بندوبست کریں۔ حالانکہ آج ہم انہیں وحشی اور ناتربیت یافتہ قوموں کی صف
میں جگہ دیتے ہیں۔ عہد قدیم میں قوم کے سرداروں کے متعلق عقیدہ تھا کہ وہ خدا کی
کی تائید سے بارش لاتے ہیں۔ عمدہ فصلیں پیدا کرتے ہیں اور بیماریوں کو دور رکھنے

کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان کو یہ بھی یقین تھا کہ ان پیشواؤں کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھنے اور ہر قسم کی حاجت روائی کرنے کی قدرت حاصل ہے اور ان سب امور کا سرانجام دینا ان کا فرض منصبی ہے جس کے لئے وہ مامور ہیں۔ اسی بنا پر ان کی پرستش خدا کی طرح کی جاتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ یہ دستور اور رواج بھی چلا آتا تھا کہ اگر ان کا سردار بارش کرانے اور قحط سالی دور کرنے اور اسی طرح کے دوسرے انسانی مصائب دفع کرنے میں ناکام رہے اور اپنے فرائض ادا نہ کر سکے تو اس کے پرستار و معتقدین ایک تاریخ معین کر کے اس کو ہلاک کر دیتے تھے۔ لیکن اس عقیدے کی بنا پر کہ اس کی ہستی مقدس و متبرک ہے اس کا گوشت آپس میں تقسیم کر کے کھا لیتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے قتل کے ذریعے اپنے سردار کو عالم بالا میں بھیج دیا۔ جو وہاں سے خدا تعالےٰ سے سفارش کر کے بارش برسوائے گا اور قحط دور کرائے گا۔ یہ کوئی افسانہ اور خود تراشیدہ قصہ نہیں بلکہ زمانہ قدیم کے لوگوں کے اوہام و عقائد اور غیر متمدن انسانوں کے واقعی خیالات و عقائد کا صحیح خاکہ ہے۔

مثلاً ملک میکسیکو کا بادشاہ تخت نشینی کے وقت قسم کھاتا تھا کہ وہ مینہ برسائے گا، دریا بہائے گا اور نباتات معین پر زمین سے پھل اور غلہ پیدا کرے گا۔ مغربی افریقہ میں یہ دستور ہے کہ جب بادشاہ کی خدمت میں دعائیں اور نذرانے پیش ہونے کے باوجود وہ بارش کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو اس کی رعایا کے لوگ اسے رسیوں میں باندھ کر اس کے بزرگوں کی قبروں پر لے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کی امداد سے بارش کرے۔

قدیم سیتھین بھی قحط کے زمانہ میں اپنے بادشاہوں کو قید رکھتے تھے۔ مغربی افریقہ کی نیگرو قوم کے لوگ خوش حالی کے زمانہ میں تو اپنے بادشاہ کے لئے تحفوں

کے انبار لگا دیتے ہیں۔ اور مویشیوں کے گلے جمع کر دیتے ہیں۔ مگر جب خشک
سالی یا کثرتِ بارش سے زیادہ نقصان ہوتا ہے تو اپنے بادشاہ کو اس وقت تک
مارتے اور ذلیل کرتے رہتے ہیں جب تک کہ موسم بدلے۔ برگنڈی کے لوگ اپنے
بادشاہ کو فصل خراب ہونے پر تخت سے اتار دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ
بعض قومیں خشک سالی کے زمانہ میں اپنے بادشاہوں کو جان سے مار ڈالتی ہیں۔

چنانچہ ملک سویڈن کے بادشاہ ڈون لڈے کے زمانہ میں ایک شدید قحط پڑا
تھا جو کئی سال تک رہا۔ آخر مقام اپسالا میں ایک بڑی اسمبلی کے اجلاس میں قرار پایا کہ خود
بادشاہ اس قحط کا موجب ہے، اس لئے اس کی قربانی کی جائے۔ چنانچہ اسے قتل
کر کے اس کے خون سے دیوتاؤں کے چبوترہ کو رنگ دیا گیا۔

ابتدائی زمانوں کا یہ عقیدہ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا ہوا برابر چلا آیا تھا کہ مشرقی ملکوں
کے وہ بادشاہ جو آج کل کی تاریخوں میں جابر اور ظالم سمجھے جاتے ہیں وہ بھی رعایا
کو غذا پہنچانے کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے اور بعض سلاطین تو ملک کی
آمدنی کو اپنی ذات پر صرف کرنا گوارا کرتے تھے اور اسے رعایا کا حق سمجھتے تھے۔
قباد بادشاہ کی نسبت مشہور ہے کہ اس کے عہد میں سات سال قحط پڑا تھا۔ اس کے
حکم سے خود اس کے ماتحت حکام غلہ بیچا کرتے تھے اور غریبوں کو صدقہ دیتے تھے۔
اور بیت المال اور سرکاری خزانوں سے ضرورت مندوں کی مدد کرتے تھے حتیٰ کہ اس
سات سال کے قحط میں اس ملک میں کوئی شخص بھی بھوک سے نہ مرا تھا۔ عہدِ قدیم میں
تو یہ فرض رواجی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر بعد میں اس نے قانونی شکل اختیار کرلی۔ چنانچہ
انگلستان میں ۱۶۰۱ء میں ملکہ الزبتھ کے عہد میں یہ قانون پاس کیا گیا کہ نادار

ب۔ خونریزی کے عقیدہ معبود نذریزی مولفہ [illegible] صفحات ۸۲، ۸۸

جانے لگی تاکہ ضرورت کے وقت ملک کے تمام جوان العمر اشخاص اپنی قوم و ملت کی حفاظت کر سکیں تا آنکہ یہ امر اُن کے بنیادی حقوق میں شامل ہو گیا۔ متحدہ امریکہ کے آئین ۱۷۹۱ء کے حقوق کی دفعہ کا یہ مضمون ہے۔

"چونکہ آزاد سلطنت کی حفاظت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک مرتب شہری فوج رہے اس لئے عوام الناس کے اس حق کی کہ وہ ہتھیار رکھ سکیں کبھی خلاف ورزی نہ کی جائے گی۔"

خود ہندوستان میں باوجود غیر ملکی سلطنت ہونے کے روشن خیال انگریزوں نے ہندوستانیوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ سر ولیم ونسنٹ ممبر ہوم کونسل وائسرائے ہند نے کونسل کی ایک تقریر میں فرمایا تھا:

"اگر میں اسمبلی کا غیر سرکاری ممبر ہوتا تو ہمیشہ اس بات پر زور دیتا کہ ہندوستانی افواج کو ترتیب دے کر اُس کے افسر ہندوستانی مقرر کئے جائیں کیونکہ حقیقتاً ملک کی آئندہ سیاسی زندگی کا انحصار بہت کچھ اسی پر ہے۔"[1]

۳۔ عدل و انصاف اہمیت کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر عدل و انصاف کا انتظام ہے۔ زمانۂ قدیم کی سوسائٹی میں یہ دستور تھا کہ جب دو شخص آپس میں لڑائی جھگڑا کرتے تو جو شخص اس جماعت میں سب سے زیادہ طاقتور ہوتا اور با اقتدار ہوتا وہ ظلم و زیادتی کرنے والے کو سزا دیتا تھا۔ گویا رفتہ رفتہ یہ با اختیار شخص کے فرائض میں یہ بات داخل ہو گئی کہ وہ مظلوم و ستم رسیدہ کی حمایت اور فریاد رسی کرے۔ اور ظالم و جابر کو اس کی بداعمالی اور ظلم و ستم کی سزا دے

---

[1] از خطبۂ صدارت سر سید رضا علی صدر جلسہ مسلم لیگ ۱۹۲۶ء ص ۱۷

کے سامنے پیش ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح دفعہ ۷ کی رُو سے دیوانی کے معاملات کی سماعت، جب کہ جائیداد متنازعہ فیہ کی مالیت ۲۰ ڈالر یعنی ۶۰ روپیہ سے زیادہ ہو، صرف جوری کر سکتی ہے۔

۴۔ مذہبی حفاظت

مندرجہ بالا تمدنی حقوق کے بعد مذہبی حفاظت کا حق ہے۔ مشرقی ممالک میں یہ دستور رہا ہے کہ حکومت کا جو رعایا سے محصول لیتی ہے، فرض ہے کہ بلا لحاظ حکمراں کے ذاتی عقیدہ کے وہ تمام رعایا کے جملہ مذاہب کے اداروں کی اعانت کرے اور ان کے قیام میں ان کی امداد کرے۔ چنانچہ ہندوستان میں خاندانِ تیمور سے لے کر مسلمانوں کے آخری تاجدار تک، اور ہندوؤں میں آخری راجہ مہاراجوں تک مشکل سے کوئی ایسے حکمراں گزرے ہوں گے، جنہوں نے حقیقی معنوں میں اپنی رعایا کے لوگوں کے مذہبی حقوق کی حفاظت نہ کی ہو۔

اب رہے مغربی ممالک، اُن میں اختلافِ عقائد کی بنا پر گزشتہ چند صدیوں تک سخت کشت و خون ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ مذہبی اختلافات سیاسی جدوجہد میں منتقل ہو گئے اور مذہبی امور میں رواداری یہاں تک تسلیم کر لی گئی کہ ہر شخص اپنے عقائد اور خیالات کی اشاعت اس حد تک کر سکے جس حد تک کہ وہ دوسروں کے لئے تکلیف دہ نہ ہو۔ حتیٰ کہ یورپ میں اقلیتوں اور جماعتوں کو بھی اجازت ہے کہ وہ اپنی انجمنیں قائم کر کے اُن کے جلسے منعقد کریں اور اپنے عقائد کی کتابوں و اخبارات کے ذریعہ اشاعت کریں۔ یورپ میں اقلیتوں کی حفاظت کا ایک خاص مسئلہ تھا جو وہاں کی حکومتوں کو پیش آیا اور اس کا سلسلہ ۱۸۱۵ء سے شروع ہو کر ۱۸۵۶ء کی پیرس کی کانفرنس پر ختم ہوا۔ جنگِ عظیم کے بعد زیکوسلوویکیا و پولینڈ سے معاہدات کئے گئے، جن میں مختلف مذہب، زبان اور تہذیب کے افراد

قومیں رہتی تھیں اور جدید حالات پیدا ہونے کی وجہ سے اُن میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ ان تمام ملکوں کی اقلیتوں کے مذہب، زبان و تہذیب کی حفاظت کے لئے قواعد بنا دیئے گئے ہیں۔

(۵) **تہذیب و زبان کا مسئلہ** زمانۂ سابق میں تہذیب و زبان کا مسئلہ زیادہ اہم نہ تھا۔ البتہ ۱۹۱۹ء کی پیرس کی صلح کانفرنس سے اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور یورپ کے اُن ممالک میں جن کا تذکرہ گزشتہ دفعہ کے تحت میں کیا گیا ہے، مذہبی حفاظت کے ساتھ اقلیتوں کی زبان کی حفاظت کا حق بھی تسلیم کر دیا گیا۔

(۶) **تعلیم** علیٰ ہذا ہر قوم کے افراد کو تعلیم پانے کے یکساں مواقع اور سہولتیں حاصل ہونا بنیادی حقوق میں داخل ہے اور مہذب و شائستہ حکومتوں کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ ہر قوم کے افراد کو تعلیم یافتہ اور مہذب و شائستہ بنانے کی خود کوشش کریں اور اس کے لئے مواقع بہم پہنچائیں۔ اسی اصول کے تحت انگلستان میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا پورا انتظام حکومت کی طرف سے مفت اور بافراغت کیا جاتا ہے۔

(۷) **حقوق ملازمت** اسی طرح بلا امتیاز مذہب و ملت رنگ اور نسل کے سب کو یکساں طور پر سرکاری عہدے اور ملازمتیں دیا جانا بنیادی حقوق میں شامل ہے۔

(۸) **یکساں شہری حقوق و مساوات** اس سے مراد یہ ہے کہ بلا امتیاز مذہب و ملت رنگ اور نسل کے سب کو یکساں طور پر ہر قسم کے شہری حقوق حاصل ہوں اور تمام پبلک چیزوں کا استعمال یکساں طریقہ سے ہو سکے۔ زمانۂ حال میں اس حق میں مذہب کی آزادی اور پُر امن طریقہ پر جمع ہو کر

تقریر کرنا اور رفع شکایات کے لئے گورنمنٹ کو درخواستیں دینا شامل ہیں۔

۹۔ حقوقِ ملکیت میں آزادی یعنی ہر باشندۂ ملک کو یہ حق ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ تمام ملک میں کاروبار کر سکے اور جائیداد پیدا کر سکے اور اس کی جائیداد اندھادھند ضبط یا قرق نہ کی جا سکے۔ یہ چند امور ایسے ہیں۔ جنہیں حقیقی معنوں میں اساسی یا بنیادی حقوق کہا جا سکتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بہت سے امور ہیں جن کو بنیادی حقوق کی فہرست میں رکھا جاتا ہے مگر دراصل وہ مندرجہ بالا مدات میں سے کسی نہ کسی مد کے تحت میں آجاتے ہیں۔

۱۰۔ سیاسیات ان کے علاوہ ایک اور اہم حق ہے اور وہ حکومت میں رعایا کا حصّہ ہے۔ حکومت میں حصّہ ہونے کی غرض وغایت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ بنیادی حقوق محفوظ رہیں۔ زمانۂ سابق میں جب کوئی حکومت اپنا فرضِ منصبی ادا نہ کرتی یا نہ کر سکتی تھی تو اس کا علاج وہی کیا جاتا تھا جو حق نمبر ایک کے تحت میں لکھا گیا ہے۔ یعنی بادشاہ کو ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ یا اُسے تخت سے اُتار دیا جاتا تھا یا یہ گوارا کیا جاتا تھا کہ کوئی دوسرا حملہ آور ایسے حکمران کو اپنا فرضِ منصبی ادا نہیں کرتا علیحدہ کر کے اُس کی جگہ خود لے لے۔ اس طریقے کی جگہ موجودہ زمانہ میں بنیادی حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے کا نام "سیاست" ہے جو انتخابی جماعتوں کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ اور جن کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ کثرتِ رائے سے کابینۂ وزارت کو برخاست کریں۔ کونسلوں اور اسمبلیوں کو توڑ دیں اور جدید انتخاب کرا کے نیا کابینۂ وزارت قائم کریں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انتخابی اور حکمران جماعتیں بنیادی حقوق کے قائم رکھنے کے ذرائع ہیں۔ اور ان کی کامیابی کا معیار یہی ہے کہ ان کے ذریعہ کس حد تک بنیادی حقوق محفوظ

رہتے ہیں۔

مندرجہ بالا بنیادی حقوق کی روشنی میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ زمانۂ سابق میں اس ملک کے رہنے والوں کی جن میں مسلمان بھی شامل ہیں کیا حالت تھی اور آیندہ کیا توقعات ہیں۔

اسی نظریہ کے پیشِ نظر اب ہم اس زمانہ پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کا چراغ ٹمٹمانا شروع ہوگیا تھا۔ اور جس کو آیندہ باب میں ہم نے مسلمانوں کے دورِ آخر سے موسوم کیا ہے۔

بابِ دوم

مسلمانوں کا دورِ آخر

۱۔ ملک کی عام حالت

مسلمانوں کے دورِ آخر سے مراد وہ زمانہ ہے جب کہ مغلیہ سلطنت کی شوکت ختم ہو رہی تھی اور یورپین کمپنیوں کا اس ملک میں تسلط شروع ہو رہا تھا۔ اس زمانہ کی حالت بھی عجیب تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگ مادرِ ہند کے سپوت ہیں۔ جہانگیر کا باپ اکبر مسلمان تھا تو اس کی ماں ہندو تھی۔ خود اس کی ایک بیوی مسلمان تھی تو دوسری بیویاں ہندو تھیں۔ گویا ہندوستان کے شہنشاہ کی ذات میں بھی دونوں قومیں اسی طرح مدغم ہو گئی تھیں جس طرح کہ ہندوستان کی سرزمین پر مل جل کر رہتی تھیں۔ اگر سرزمینِ ہند مسلمانوں اور ہندوؤں کی مادرِ وطن تھی تو اس کے بادشاہ میں بھی یہی صفات موجود تھیں۔ بادشاہ کے علاوہ جس کو درحقیقت شہنشاہ کہنا چاہیئے، راجے مہاراجے بھی ملک کے مختلف حصوں پر حکومت کرتے تھے۔ ان کے علاوہ منصبدار جابجا پھیلے ہوئے تھے اور اپنے اپنے علاقہ کا انتظام کرتے تھے اور وہ سب شہنشاہ ہند کو حسب قاعدہ مالیانہ ادا کرتے تھے اور امن قائم رکھنے اور لڑائی کے وقت فوج مہیا کرنے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ فوج مہیا کرنے میں سہولت اس وجہ سے تھی کہ تمام رعایا ایسی تھی جس کو معین فوج کے علاوہ ملک کی ایک بے قاعدہ فوج کہنا چاہیئے۔ اس شخصی حکومت کے زمانہ میں جب کہ جمہوری حکومت کے طرز پر نیابتی اداروں کے وجود سے پبلک آشنا

نہ تھی بلکہ جتنی مستقل انسان بادشاہوں کو آئین حکمرانی کے حدود اختیار سے باہر نہ ہونے دیتی تھیں۔ جب ایسا ہوتا تو بادشاہ سے ناراضی کا جذبہ بغاوت اور سرکشی کی صورت میں نمودار ہو جاتا۔ اس طرح یہ خود مختار سلاطین جو شخصی حکومت کے علم بردار کہے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت رعایا کی رضامندی کے تابع رہتے تھے۔ زمانہ حال کی جمہوری حکومت اور زمانہ سابق کی شخصی حکومت میں فرق صرف اس قدر تھا کہ آج کل رعایا کا میلان آئینی جماعتوں کے ذریعہ معلوم کیا جاتا ہے اور پچھلے زمانہ میں مشیروں، درباریوں، مصاحبوں اور رعایا کے عام رجحانات اور خواہشات سے کیا جاتا تھا۔ یہ خواہشات بنیادی حقوق کی حفاظت پر مبنی ہوتی تھیں اور بادشاہ وقت ان کا احترام کرتے ہوئے رعایا کی ضروریات کو شفقت پدری سے پورا کرتا تھا۔ جب اس میں کوتاہی کرتا تو اس کی راہ میں مشکلات پیدا کی جاتیں کہ اس کا سنبھالنا دشوار ہو جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ سلطنت کرنے کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے مگر اس زمانہ میں مستقل قوت رعایا کی رضامندی سے حاصل ہوتی تھی اور جنگی قوت محض عارضی ہوتی تھی اور جنگ کے ختم ہوتے ہی فوجوں کے زیادہ تر آدمی اپنے کاروبار میں لگ جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانی تاریخوں میں زمانہ جنگ کی فوجی تعداد کا تو پتہ چلتا ہے مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ امن کے زمانہ میں مستقل طور پر کس قدر فوج رہتی تھی۔

بنیادی حقوق کا محاسبہ

مسلمانوں کی حکومت کے آخر زمانہ کے اس قدر حالات بیان کرنے کے بعد اس امر کا اندازہ کرنا مناسب ہے کہ باعتبار بنیادی حقوق کی حفاظت کے ان دنوں رعایا کی حالت کیا تھی۔ اس کے لئے ذیل میں ہر مد کے تحت میں اس زمانہ کے حالات درج کئے جاتے ہیں۔

روٹی کا مسئلہ روٹی کے مسئلہ سے مراد ملک کی مالی حالت ہے۔ اس کی بابت فرانس کے مشہور سیاح ڈاکٹر برنیر نے ایک چٹھی میں مسٹر کالبرٹ کو ہندوستان کی نسبت یہ شکایت لکھی تھی کہ وہ ایک ایسی بڑی سی خلیج ہے جس میں دنیا بھر کے سونے اور چاندی کا بڑا حصہ ہر طرف سے آکر جمع ہو جاتا ہے۔ اور بمشکل ایک طرف سے باہر کو نکلتا ہے۔[1]

اسی طرح عبداللہ وصاف مورخ نے لکھا ہے:

"حضرت آدمؑ کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک شرق سے لے کر غرب تک اور جنوب سے لے کر شمال تک کوئی ملک ایسا نہیں جس میں باہر کے ملکوں سے سونا چاندی اور قیمتی سامان اور جنس آتی ہو اور اُس کے بدلے میں کاٹنے۔ جڑی۔ بوٹی۔ مٹی۔ سنگریزے اور مختلف قسم کی جڑیں باہر جاتی ہوں اور جہاں سے سامان کی خریداری کے لئے کسی ملک کو کبھی روپیہ نہ گیا ہو۔"

پھر چودھویں صدی کے مشہور سیاح ابن بطوطہ نے لکھا ہے:

"شاہ تغلق اپنے ملک سے باہر روپیہ جانے کی کبھی اجازت نہ دیتا اور مشہور تھا کہ اگر کوئی شخص کبھی روپیہ لے جاتا تو ضرور کسی نہ کسی مصیبت میں پڑ جاتا۔"

ہندوستان سے باہر روپیہ نہ جانے کا اثر یہ تھا کہ ملک نہایت خوشحال تھا۔ چنانچہ میجر باسو نے لکھا ہے:

"رعایا کی خوشحالی، سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا

---

[1] جب ہندوستان نے اپنی آزادی کے لئے کس وجہ جدوجہد کی ڈاکٹر زکی مسز بی ڈیسنٹ

دور حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ دولتمند
اور آرام اور چین کا جو نقشہ شاہجہان کے وقت میں دیکھنے میں آتا
تھا بلا شبہ بے مثل و بے نظیر تھا۔

اسی دولت ہندی کی وجہ سے یہاں کے شہر عظیم الشان تھے جن سے انگلستان
کے لوگ مرعوب ہوتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں شہر آگرہ لندن سے بڑا تسلیم کیا
جاتا تھا۔[1]

یہ حالت مغلوں کی حکومت کے عروج کے وقت کی تھی۔ اب اس
زمانے کی مالی حالت پر نظر ڈالی جائے جب کہ دہلی کی حکومت کے پاش پاش ہو جانے
پر ملک میں طوائف الملوکی ہو گئی تھی۔ اس زمانے کی بابت لارڈ میکالے نے
لکھا ہے:

"باوجود مسلمان نوابوں اور مرہٹہ لٹیروں کی موجودگی کے مشرقی ممالک
میں صوبہ بنگال باغ ارم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی آبادی بے حد و نہایت بڑھتی
تھی۔ غلہ کی افراط سے دور دراز کے صوبہ جات پرورش پاتے تھے اور
لندن اور پیرس کے امیر خاندانوں کی بیبیاں یہاں کے کرگھوں کے
نازک ترین کپڑے زیب تن کرتی تھیں۔"

دولت کی یہ کیفیت تھی کہ بنگال کے "جگت سیٹھوں کا کاروبار بینک آف انگلینڈ
کے برابر پھیلا ہوا تھا۔"[2] جو انگلستان کا سب سے بڑا بینک ہے اور بقول کپتان
ہملٹن سورت کے ایک تاجر مسمی عبدالغفور کا سرمایہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے

---

[1] چیپٹرز نے کی رتیاں ... (انگریزی)، از ڈبری، ص ۲
[2] مستدرک آف بنگال زمیندار (انگریزی) ص ۱۵۲

ختم ہونے پر اپنے کاموں میں لگ جاتی تھی۔

عدل وانصاف

اس زمانہ میں عدل وانصاف کے دو طریقے تھے۔ ایک رعایا کی طرف سے دوسرا بادشاہ کی طرف سے اور دونوں طریقوں میں روپیہ کا ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوتا۔ رعایا کی طرف سے گاؤں گاؤں پنچایتیں قائم تھیں جو بلحاظ حکومت خود مختیار کے تھیں۔ اُن کے بارہ میں سر ٹامس منرو نے جو دوامی بندوبست کی تحقیقات کے لئے مقرر ہوئے تھے لکھا ہے:

"ہر موضع معہ اپنے پرگنوں کے مثل ایک چھوٹی سی ریاست کے بنے جس میں اس کے مقدم پٹیل یا ادنیٰ بطور اس کے صدر کے ہیں۔ ہندوستان اسی قسم کی ریاستوں کا ایک بڑا مجموعہ ہے۔ جنگ کے زمانہ میں باشندوں کی نظر اپنے گاؤں کے سردار کی طرف ہوتی ہے جب تک کہ ان کا موضع محفوظ اور سالم رہے گا، گاؤں کے باشندے سلطنتوں کے ٹوٹنے و تقسیم کے بارہ میں اپنے آپ کو تکلیف نہیں دیتے وہ اس امر کی پروا نہیں کرتے کہ ملک کس کے ہاتھ میں منتقل ہوتا ہے۔ ہر صورت میں اندرونی نظم بغیر مبدل رہتا ہے۔ ان تمام حالات میں گاؤں کا سردار بدستور اپنے گاؤں کا کلکٹر، مجسٹریٹ اور کاشتکاروں کا سردار رہتا ہے۔"

ان پنچایتوں کی نوعیت مختلف صوبجات میں مختلف تھی۔ مگر تقریباً سب ایک حیثیت رکھتی تھیں۔ ان پنچایتوں میں بالعموم ہر پیشہ کا ایک ایک آدمی لیا جاتا تھا۔ اور سب مل جل کر مقدمات طے کرتے تھے اور کبھی کسی کے ذہن میں بھی نہ آسکتا تھا کہ پنچایت کی گدی پر خدا کا سایہ ہوتا ہے جہاں کوئی شخص ایمان اور ضمیر کو بیچ

[illegible]

سکتا ہے۔ پنچایتوں کا یہ نظام ہندوستان میں ہزاروں سال چلا آتا تھا۔ اور مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں بھی بجنسہ قائم رہا۔

رعایا کی طرف سے انصاف کے انتظام کے بعد چند الفاظ شاہی عدالتوں کی نسبت لکھنے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ یہ عدالتیں نام کو تو شاہی تھیں مگر ان پر بادشاہ کا اثر نہ تھا ان میں مسلمانوں کے معاملات قرآن شریف کی رو سے اور ہندوؤں کے معاملات دھرم شاستر کی رُو سے طے ہوتے تھے۔ اور اُن کی طاقت کی یہ کیفیت تھی کہ ذاتی امور میں بادشاہ بھی مفتیوں کے فتووں اور شرعی فیصلوں کے تابع ہوتے تھے۔ اس مضمون کو انگلستان کے مشہور مقرر اڈمنڈ برک نے پارلیمنٹ کی ایک تقریر میں خوب واضح کیا تھا جس کے چند الفاظ یہ ہیں:

"جناب والا میں ایشیا کی حکومتوں کی نسبت جرأت سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے کسی کو خودسری کے اختیارات حاصل نہ تھے۔ اگر کسی کو تھے تو وہ انہیں کسی دوسرے کو سپرد نہ کر سکتا تھا۔ میں پُر زور الفاظ میں کہتا ہوں کہ مشرقی ممالک کی حکومتیں خود مختارانہ اختیارات کا نام تک نہیں جانتیں۔ ایشیا کا بڑا حصہ مسلمان حکمرانوں کے تحت میں ہے اور اسلامی حکومت کے معنی ہی قانونی حکومت کے ہیں۔ عیسائی بادشاہوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے قانون میں بدرجہا زیادہ مضبوطیاں ہیں ان کا اپنے قانون کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس لئے رعایا سے لے کر بادشاہ تک سب کے سب یکسانیت کے ساتھ قانون اور مذہب دونوں کے پابند ہیں اگر کوئی شخص قرآن کی ایک آیت بھی اس مضمون کی دکھا دے کہ اُس کی رُو سے کسی کو خود مختارانہ اختیارات حاصل ہیں تو میں تسلیم کروں گا کہ میں نے اس کا اور ایشیا کے حالات کا بیکار

چنانچہ حیدرآباد اور بڑودہ میں ایک طرف مندروں کے پوجاری ریاست کے تنخواہ دار ہیں تو دوسری طرف جامع مسجد کے امام کا شمار سرکاری ملازموں میں ہے۔ اس لئے یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ پچھلی عملداریوں میں رعایا کے مذہبی حقوق کی حفاظت کامل تھی۔ اس کی تصدیق پنڈت سندرلال صاحب الہ آبادی نے حسب ذیل الفاظ میں کی ہے:

"اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانبداری نہ کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔ آج تک ہندوستان کے متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں۔ جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کئے جانے کا تذکرہ ہے۔

اس قسم کے دو فرمان اب تک الہ آباد میں موجود ہیں۔ جن میں سے ایک اریل میں سومیشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے"۔[1]

اسی طرح شہنشاہ اورنگ زیب نے گردھر پیسر جنگ جیون ساکن موضع بسی ضلع بنارس اور رچھد مسر ساکن مہلیش پور پرگنہ حویلی کو اور پنڈت بلبھدر مصر کو جاگیریں عطا کیں۔[2]

---

[1] ماخوذ از مضامین پنڈت سندرلال مصنف "بھارت میں انگریزی راج" مندرجہ "مشرق" مورخہ ۴ مارچ ۱۹۳۶ء۔

[2] مرقع بنارس، از خان بہادر چودھری نبی احمد صاحب ص ۶۷

دوسری اہم بات جس کی وجہ سے رعایا کے مذہبی حقوق محفوظ تھے یہ تھی کہ چونکہ بادشاہ اپنی رعایا کے مذاہب کا احترام کرتا تھا اس لئے رعایا کے لوگ بھی ایک دوسرے کے معابد اور بزرگوں کا احترام کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو مذہب کے لوگ مسلمانوں کے بزرگوں اور مزارات پر عقیدت کے ساتھ جاتے تھے۔ اور اب بھی جاتے ہیں۔ اسی طرح صوفی منش مسلمان ہندو فقیروں سے یکساں استفادہ حاصل کرتے تھے۔ حضرت مولانا غوث علی شاہ صاحب پانی پتی کی نسبت اُن کی سوانح عمری مؤلفہ مولانا گل حسن میں تحریر ہے کہ آپ نے جن بزرگوں سے استفادہ حاصل کیا تھا ان میں سے مسلمان اور ہندو جوگی تھے۔

یہی حال ہندو مسلمانوں کے میلوں اور عرسوں کا تھا۔ چنانچہ سید شاہ مدن صاحب کی نسبت جو ہمایوں اور جہانگیر کے درباروں میں بڑے معزز تھے لکھا ہے کہ:

> "وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا عرس بڑے اہتمام سے کیا کرتے تھے اور اس میں علما و مشائخ اور پیرزادوں کے ساتھ ساتھ برہمنوں پنڈتوں جوگیوں کو بھی جمع کرتے تھے اور علاوہ خوراک کے ان کے لئے پوشاک، چیزیں اور نقدی بھی فراہم کرتے تھے۔"[1]

یہی امور تھے جو ہندو مسلمانوں کے مذاہب اور معابد کی حفاظت اور احترام کا سبب، سب سے بڑی ضمانت ہوتے تھے۔

۵۔ تہذیب اور زبان کی حفاظت

مسلمانوں کی حکومت کے آخر زمانہ تک ہندو مسلمانوں کی سوسائٹی ایک تھی۔ دونوں فرقے مذہب کے لوگ اپنے اپنے محلوں کی بیٹھکوں میں یکجا بیٹھتے تھے اور حقیقت

---

[1] [illegible] مؤلفہ سید [illegible] علی صاحب ص [illegible]

معنوں میں اُن سب کی تہذیب و معاشرت یکساں تھی صرف عبادات اور مذہبی امور کے انجام دینے کے لئے اپنی اپنی مذہبی زبانیں استعمال کرتے تھے۔ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنے لکچر میں جو مارچ ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جوبلی کے موقع پر دیا فرمایا تھا:

"یہاں ایک ہزار سال کی مدت جہد کے بعد ایک قوم بنی تھی جس کا تمدن جس کی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی"

اس قول کی تصدیق مشہور مورخ سر جادوناتھ سرکار نے کی ہے جو کہتے ہیں:

"کہ اعلیٰ طبقوں کی معاشرت بلا تفریق مذہب و ملت یکساں تھی"[1]

پنڈت سندر لال صاحب الہ آبادی نے اس بارہ میں لکھا ہے:

"دلی کے مغل دربار کے اندر ہندو اور مسلمانوں کے تمام تہوار برابر جوش و خروش کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ دسہرے کے دن شاہی جلوس نکلتا تھا۔ جس میں ہاتھیوں اور گھوڑوں کو خوب سجایا جاتا۔ ہندو اور مسلمان امرا آرائش کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔ رکشا بندھن کے روز برہمن اور ہندو عہدہ دار بادشاہ کی کلائی پر خوبصورت ڈورا باندھتے تھے۔ دیوالی کی رات میں شاہی محلوں پر روشنی ہوتی تھی۔ شب برات اور عید بھی اسی اُمنگ کے ساتھ منائی جاتی تھی"

نیز زبان کی بابت صاحب موصوف نے کہا ہے کہ:

"مسلمانوں نے اپنی زبان فارسی چھوڑ کر ہندوستان کی زبان اختیار کی جس کا نام اُردو ہے"

---

[1] انڈیا تھرو دی ایجز ص ۵۷

یہ اس زمانہ کے بادشاہوں کا محض قول نہ تھا بلکہ عمل بھی یہی تھا۔ چنانچہ بنگال کے مشہور
عالم، سی۔ پی۔ رائے۔ نے بیان کیا کہ:

"اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری عطا کی گئی
جاگیریں عطا کی گئیں اور بڑے بڑے زمیندار بنا دیئے گئے۔ اورنگ زیب
نے ہندوؤں کو گورنر بنایا، گورنر جنرل بنایا، وزراء بنایا۔ یہاں تک کہ
اس نے خالص اسلامی صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب دار السلطنت مقرر
کیا تھا وہ ہندو راجپوت ہی تھا۔"[1]

شہنشاہ اورنگ زیب کا طرزِ عمل تھا جس پر ایک متعصب بادشاہ ہونے کا
الزام لگایا جاتا ہے۔ اگر ہندو مسلمانوں کے تعلقات کی بنیاد مضبوط نہ ہوتی تو مغل
کی قوت ٹوٹ جانے کے بعد یہ حالت قائم نہ رہتی مگر چونکہ ان تعلقات میں اصلیت
تھی اس لئے بعد کی طوائف الملوکی کے زمانہ میں بھی یہی کیفیت رہی چنانچہ:

"دلی بنگال کا صدر دیوان یا وزیر اعظم موہن لال تھا۔ پٹنہ کا حاکم
رام نرائن تھا۔ ٹیپو سلطان کا معتمد سردار پورنیاں برہمن تھا۔"[2]

اسی سلسلہ میں ڈبلیو ایم مارنس کا قول نقل کرنا بے محل نہ ہوگا جو ان کی کتاب "ایشیا
میں شہنشاہیت" سے اخذ کیا گیا ہے اور حسب ذیل ہے:

"سیواجی کو متعصب ہندوستان ٹیپو کو کٹر مذہبی کہا جاتا ہے لیکن جس
وقت ہم نے جنوبی ہند کی ریاستوں میں دخیل ہونا شروع کیا اس وقت ان

---

[1] ولٹ مڈین ریکارڈس سیریز بنگال ۱۹۰۵ء صفحہ [illegible]۔
[2] تاریخ ٹیپو سلطان زیر [illegible] میں [illegible] یہ کتاب [illegible] تاریخ سلطنت خداداد
میسور مصنفہ محمود خان مسلم بک ڈپو۔ نیو مارکٹ۔ بنگلور

ہے جب یہاں اس قسم کے مذہبی تنفر کا کہیں نام تک نہ تھا، جس طرح انگلستان اور یورپ کے تقریباً سب حصوں میں مخلوق کو تباہ کرنا روا رکھا جاتا تھا۔ جب آئرلینڈ میں کوئی رومن کیتھولک اپنے بزرگوں کی جائداد کا حقدار نہیں سمجھا جاتا تھا نہ فوج کا افسر ہو سکتا تھا۔ جب سویڈن میں سوائے لوتھر کے معتقدین کے اور کسی عقیدے کا کوئی ملازم نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹھیک اسی وقت ہندوستان کے مدرسوں کے ہر شہر اور شاہی دربار میں ہندو مسلمان عزت حاصل کرنے، سرمایہ کمانے اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں آزاد تھے۔

(۲) یکساں شہری حقوق اور مساوات

اس امر کی بابت کوئی سند ہم ایلفنسٹن کے قول سے زیادہ باوقعت نہیں مل سکتی جو پہلے مدراس کے گورنر اور اس کے بعد ہندوستان کے مشہور مؤرخ رہے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> بہت سے اعتبارات سے مسلمانوں کی حکومت ہماری حکومت سے بہتر تھی۔ انہوں نے کئی ہندو ملک جنہیں فتح کئے ان میں وہ رہ پڑے۔ انہوں نے وہاں کے باشندوں کے ساتھ مناکحت کی اور انہیں جملہ حقوق دیئے۔ فاتح اور مفتوح کے منافع اور ہمدردیاں ایک ہو گئیں۔ اس کے مقابلے میں ہماری حکمت عملی اس کے برعکس رہی۔ جس میں سرد مہری، خود غرضی اور بے حسی تھی۔

مندرجہ بالا اقتباس کی تائید میں صدہا واقعات درج کئے جا سکتے ہیں۔ مگر اس

---

۱ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت [illegible] جلد [illegible] ص ۲۲۲

موقع پر صرف دو واقعات پر اکتفا کیا جاتا ہے جس میں پہلا شیر شاہ سوری کے زمانہ کا ہے اور وہ یہ ہے:

"شیر شاہ سوری کا بیٹا عادل خاں ایک دفعہ ہاتھی پر سوار ہو کر آگرہ میں کسی کوچہ سے گزرا ایک ہندو کی بیوی اپنے مکان کے صحن میں برہنہ نہا رہی تھی۔ جب شہزادہ کی نظر اس پر پڑی تو اس نے پان کا بیڑا اس عورت کی طرف پھینکا اور گھورتا ہوا چلا گیا۔ عورت نہایت عصمت والی تھی اس کو شہزادہ کی اس حرکت سے بہت صدمہ پہنچا۔ اور خاوند سے ذکر کیا۔ خاوند نے دادفریاد کے لئے دوڑ دھوپ کی لیکن شہزادہ کے مقابلہ میں کس نے کچھ نہ سنا۔ آخر اس نے جرأت کی اور بادشاہ کے انصاف پر بھروسہ کر کے اس سے حقیقت حال عرض کی بادشاہ نے معذرت کی اور کہا کہ یہ بقال ہاتھی پر سوار ہو اور عادل خاں کی بیگم برہنہ اس کے سامنے آئے اور مستغیث اس پر پان کا بیڑا پھینکے۔ امراء و وزراء نے عرض کیا کہ شاہزادہ کا قصور معاف ہو۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ میری عدالت میں فرزند اور رعیت برابر ہیں۔ معافی دینا نہ دینا بقال کے اختیار میں ہے۔ آخر شہزادہ نے بقال سے معافی مانگی۔ اور اس کی معذرت قبول کرنے پر شہزادہ کی خلاصی ہوئی۔"[1]

دوسرا واقعہ شہنشاہ جہانگیر سے متعلق ہے۔ جسے مولانا شبلی نعمانی نے نقل کیا تھا اور وہ یہ ہے:

---

[1] تاریخ حریت ہند جلد دوم ص [illegible]

اب وہی پانوں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں　　　جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن

ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام　　　خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن

مفتیٔ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا　　　بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچہ و زن

وارثوں کو جو دیئے لاکھ درم بیگم نے　　　سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہِ زمن

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

۹۔ حقوقِ ملکیت میں آزادی

اس مد کے بارہ میں زمانۂ سابق کے متعلق یہ غلط فہمی ہے کہ بعض لوگوں کی جاگیریں ضبط کر لی جاتی تھیں۔ مگر جاگیریں دو قسم کی تھیں۔ ایک دوامی دوسرے حین حیاتی۔ جو دوامی ہوتی تھیں وہ ضبط نہ کی جاتی تھیں۔ البتہ جو جاگیریں حین حیاتی تھیں وہ خدمت کے معاوضہ میں دی جاتی تھیں۔ مثلاً بڑے بڑے سرداروں کو جاگیریں اس لئے دی جاتی تھیں کہ وہ ضرورت کے وقت ایک معین تعداد میں فوج فراہم کریں۔ اس قسم کے جاگیردار اپنا فرض منصبی ادا کرنے میں کوتاہی کرتے تھے۔ تو ضرور انہیں اس منصب یا نوکری سے علیحدہ کر کے اُن کی جاگیر ضبط کر لی جاتی تھی جو بمنزلہ معین تنخواہ یا سالانہ معاوضہ بند کر دینے کی تھی اس صورت کو چھوڑ کر ہر قسم کے کام و کاروبار کرنے والوں کی ملکیتیں، در جائدادیں بہمہ وجوہ محفوظ اور مامون تھیں۔ اگر نہ ہوتیں تو ملک میں عام خوشحالی کس طرح ہوتی۔

۱۰۔ سیاسیات

زمانۂ سابق میں جس قسم کی سیاست تھی اس کا تذکرہ مندرجۂ بالا صفحات میں کافی ہو۔ پر کیا جا چکا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ شخصی

باب سوم

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈھائی سو سال

۱۶۰۰ء تا ۱۸۵۸ء

فصل اوّل

تجارت کے ڈیڑھ سو سال (۱۶۰۰ء تا ۱۷۵۷ء)

یورپی کمپنیوں کی آمد

مغرب اور مشرق کے تجارتی تعلقات کی نسبت نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب سے قائم تھے۔ اس بارہ میں صرف اس قدر معلوم ہے کہ راس امید (واقع افریقہ) والا راستہ دریافت ہونے سے پہلے بھی مغرب اور مشرق کے تاجر قسطنطنیہ، سکندریہ اور حلب کے بازاروں میں لین دین کرتے تھے۔ لیکن ترکان آل عثمان اور یورپ کی عیسائی قوم کی باہم لڑائی کا جونہی سلسلہ جب شروع ہوا تو یہ منڈیاں ویران ہونے لگیں۔ تب سے یورپ کی قوموں کو براہ راست ان ملکوں تک پہنچنے کا شوق پیدا ہوا جہاں سے مسالے، نیل اور باریک کپڑے مل سکتے ہیں۔ لیکن اُن کا یہ شوق پورا نہ ہوتا اگر ہسپانیہ کے اسلامی دارالعلوم پہلے ہی سے زمین تیار نہ کر چکے ہوتے۔ غرناطہ اور قرطبہ کے مدرسوں میں ہیئت، ریاضی جغرافیہ اور تاریخ سیکھنے کے لئے یورپ کے طالب علم آتے تھے اور یہیں

کھیل نکلے۔ لوٹ مار ہوئی، خون بہے۔ آخر پرتگال اور ہالینڈ کا آفتاب تو ڈوب گیا اور
میدان میں صرف دو پہلوان یعنی انگلستان اور فرانس باقی رہ گئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائی حالت

انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو آگے چل کر اس ملک کی فرمانروا بن گئی سب سے
پہلے ۱۶۰۱ء میں ہندوستان کو جہاز روانہ کئے اور کچھ ایسی مبارک گھڑی سے تجارت
شروع کی کہ ہر سفر میں منافع بڑھتا ہی رہا یہاں تک کہ بارہویں سفر میں ہر حصہ دار کو
۲۳۴ فی صدی نفع ہوا[1]۔ انگلستان کی آمدنی میں بھی دن دونی رات چوگنی زیادتی ہوگئی۔
۱۶۱۳ء میں برطانیہ کی سرکار کو کمپنی نے ۱۴ ہزار پونڈ محصول ادا کیا۔ اور ۱۶۲۲ء میں یہ
رقم چالیس ہزار تک پہنچی۔ ہندوستان میں پہلے بیس سال کے اندر یہ لوگ تقریباً
ساڑھے پانچ لاکھ پونڈ کا سونا چاندی لائے جس کے بدلے ہندوستان کی مصنوعات
خرید کر لے گئے۔

ان اعداد سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا کاروبار شروع ہی سے کس پیمانہ پر
پہنچ گیا تھا۔ لیکن یہ بڑے بڑے منافع اٹھانا ناممکن تھا اگر ہندوستانی تاجروں
اور ہندوستانی حکومتوں نے ان کو محبت کے ساتھ اپنے دامن میں جگہ نہ دی ہوتی۔

ہندوستان میں اس وقت جہانگیر تخت سلطنت پر رونق افروز تھا۔ جب
انگریزی سفیر مسٹر ہاکنس دربار میں پہنچا تو بادشاہ نے اس کا خیر مقدم نزاکت دلی کے ساتھ
کیا۔ لیکن اُسے پرتگالیوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اپنے مقصد میں حسب دلخواہ
کامیابی نہ ہوئی۔ صرف اس قدر ہوا کہ ۱۶۰۹ء میں سورت میں کوٹھی قائم کرنے کی اجازت
مل گئی۔ اور اسی سنہ سے ہندوستان میں کمپنی کا تجارتی دور شروع ہوا۔ اس

---

[1] ڈاکٹر شفاعت احمد خاں صاحب پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی ص ۴۰

کے سات سال بعد جب سر طامس رو ہندوستان آیا تو اس کی شائستگی اور قابلیت
نے جہانگیر کا دل ایسا موہ لیا کہ اسے بادشاہ کی پرائیویٹ صحبتوں میں شرکت کی عزت
حاصل ہوتی تھی اور اسی وقت سے جگہ جگہ انگریزی کوٹھیاں قائم ہونے لگیں۔ سورت
کے علاوہ احمد آباد، برہانپور، اجمیر، آگرہ، کھمبات وغیرہ میں کمپنی کے گودام بن گئے
وہاں کے ملازم ملکی مال کا لین دین کرنے لگے۔ ہندوستانی تاجروں نے کبھی حکومت
سے کم مہر و رواداری کا ثبوت نہ دیا۔ انگریزی کوٹھیوں کے کاغذات اور خطوط جو اب
تک چھپ چکے ہیں، اس قسم کے واقعات سے پر ہیں۔ کسی انگریز کو مکان درکار ہوتا تو ہندوستانی
تاجر اپنا مکان خالی کر دیتا۔ قرض کی ضرورت ہوتی تو وہ خوشی سے رقم مطلوبہ حاضر کر دیتا
یا ضامن بن جاتا۔ اس زمانہ میں انگریزی تجارت کی دشمن یورپ کی دوسری قومیں تھیں۔
جن کے ساتھ سمندر پر لوٹ مار کی ایک بے قاعدہ جنگ ہمیشہ جاری رہتی تھی، مگر
ہندوستان کے لوگوں سے جو ہمدردی تھی وہ انگریز تاجروں کے ممد و معاون
رہتے تھے۔[1]

یہ ظاہر ہے کہ انگریزی کمپنی کا مقصد اس وقت تجارتی منافع تھا اور اس کے ڈائرکٹر
کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز سب سے پہلے اپنے منافع پر نظر
رکھتی تھی۔ لہٰذا کمپنی کے وہ ملازم جو ہندوستان میں خرید و فروخت پر مامور تھے بہت
تھوڑی تنخواہ پاتے تھے۔ فیکٹری کے صدر کو تین سو پونڈ سالانہ ملتے تھے جو سب
سے اونچی تنخواہ تھی۔ محرروں اور دوسرے ملازموں کو دس سے لے کر چالیس پونڈ سالانہ
تک ملتے تھے۔ اور قیام و طعام کمپنی کے ذمہ ہوتا تھا۔[2] اس کے معنی یہ

۱۔ ہندوستان میں انگریزی کوٹھیاں ص ۱۰۵

۲۔ ایضاً ص ۱۰۲

لوہا مانا اور یہ تسلیم کر لیا کہ انہیں یورپینوں کے پروانۂ راہداری کے بغیر بحری سفر کا حق نہیں۔ نہ صرف عرب تاجروں اور ملاحوں کو بلکہ خود ہندی سلاطین کو اہلِ یورپ کی بحری برتری کا[1] تجربہ ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ اکبر اور جہانگیر کے بحری جہاز (یعنی جہاز) یورپ والوں سے[2] پروانۂ راہداری لے کر چلتے تھے۔ لیکن مغلوں کو کبھی محسوس نہ ہوا کہ یہ کمزوری یکسر ہندوستان کو بدیسیوں کا غلام بنا کر رہے گی۔ خود جہانگیر کے عہد میں انگریزی کمپنی کو اپنی بحری قوت پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس نے ۱۶۲۳ء میں باقاعدہ جنگ کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس وقت فریقین کی بنائے مخاصمت یہ تھی کہ کمپنی کے لوگ شکایت کرتے تھے کہ شاہی عہدہ دار تجارتی مال درآمد برآمد لینے میں سختی کرتے ہیں اور رشوتیں لیتے ہیں۔ اور ہندوستانیوں کو یہ شکایت رہتی تھی کہ یہ بدیسی تاجر ساحلی دیہات سے بچے پکڑ لے جاتے ہیں اور غلام بنا کر انہیں بیچ ڈالتے ہیں۔ ہندی تاجروں کے جہازوں کو سمندر میں لوٹ لیتے ہیں۔ ان باتوں پر جب دونوں میں لڑائی چھڑتی تو بدیسی تاجروں میں میدان میں لڑنے کی قوت تو تھی نہیں اس لئے وہ کوٹھیوں سے اپنا سامان ہٹا کر جہازوں پر لے جاتے اور سمندر میں ہندوستانی جہازوں کو خوب لوٹتے۔ انہیں گرفتار کر لیتے۔ بالآخر ہندی تاجروں کی فریاد حکومت کو مجبور کر دیتی تھی کہ کمپنی کے مطالبے پورے کرے۔ اسی نوعیت کی دو بار ہوا۔ ایک کلکتہ اور دوسری سورت والے انگریزوں نے اورنگ زیب سے لڑائی کی۔ مغلیہ حکومت ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اسی طرح کمپنی کو احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت سے اور نیز مرہٹوں سے بھی لڑنے کی نوبت آئی مگر کمپنی کا بال بیکا نہ ہوا۔ غرض یہ مٹھی بھر

---

[1] ایک انگریز کے اندازے کے مطابق ۱۶۳۳ء میں صرف ہالینڈ والوں نے دو سو زائد جہاز ہندوستان سے پکڑ کر بھیجے تھے۔

[2] ہندوستان میں انگریزی تجارت ص ۲۲۵

کے صدر مقام تھے۔ اور ڈوپلے نامی ایک باتدبیر حاکم فرانسیسیوں کا گورنر تھا۔ اس کو
فرانسیسی حکومت قائم کرنے کا خواب تو ابھی نظر نہ آتا تھا۔ لیکن چاہتا یہ تھا کہ کسی
دیسی ریاست سے مل کر انگریزوں کو جنوبی ہند سے نکال دے۔ ڈوپلے نے ایک
فریق سے یاری کی تو مجبوراً انگریزوں کو دوسرے سے ملنا پڑا۔ ارکاٹ کی مشہور لڑائی
نے کرناٹک کی صوبیداری انگریزوں کے پٹھو محمد علی کو دلادی۔ اس فتح نے ان کے
حوصلے بڑھا دیئے۔ ایک طرف تو ہندوستانی پلٹنوں اور اُن کی فوجوں کی ہیبت
دل سے اُٹھ گئی۔ اور دوسری طرف ایک نئی تجارت کا راستہ کھل گیا۔ اور انہیں
معلوم ہو گیا کہ تخت و تاج دینا آسان ہونے کے ساتھ ہی نفع بخش بھی ہے۔ اب
کمپنی کے ملازم اپنی تھوڑی تنخواہوں کی کمی کو دوسرے ذرائع سے پورا کرنے لگے۔
ان میں سے ایک یہ تھا کہ کرناٹک کی ریاست سے نذرکشی کا سلسلہ جاری کیا جس سے
انگلستان سے خالی ہاتھ آنے والے لوگ نواب بن بن کر واپس جاتے تھے۔
اس قسم کے لوگوں کی شکایت میں کرناٹک کے بدقسمت نواب نے ڈائرکٹران کمپنی
کو حسب ذیل مضمون کا خط لکھا:

> "آپ کے نوکروں کو اس ملک میں کوئی روزگار تو ہے نہیں۔ نہ آپ
> انہیں معقول تنخواہیں دیتے ہیں۔ پھر بھی چند ہی سال میں وہ کئی لاکھ
> اشرفیاں کما کر واپس جاتے ہیں۔ اتنی قلیل مدت میں بغیر کسی ناجائز
> ذرائع کے یہ بے حساب کمائی ممکن نہیں ہے۔ یہ بات آپ خود
> سمجھ سکتے ہیں۔"

غرض ان لوگوں کی کمائی کے بہت سے طریقے تھے جن میں ایک تو نذر دینا تھا

[illegible]

جس نوعیت کے یہ قرضے ہوتے تھے ان کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل ہے۔
ایسے ہی ایک قرضہ کی نسبت مسٹر برک نے لکھا ہے کہ:

"اس وقت نواب کو روپیہ کی ضرورت تھی فوج کی تنخواہ نہ ہوتی تھی
جس سے وہ فساد برپا کرتی رہتی تھی۔ مدراس کی کونسل نے دوستانہ طور پر
سمجھایا کہ اُن شوریدہ سر فوجیوں کو دبا دیجئے۔ نواب نے جواب دیا کہ روپیہ
سے مجبور ہوں کیا کروں۔ اس پر انگریزی حکومت نے چند ساہوکاروں کو
آمادہ کر دیا کہ نواب کو چار لاکھ اشرفی (پیگوڈا) قرض دے دیں۔ یہ ساہوکار
کون تھے؟ یہ تھے مسٹر ٹیلر، مسٹر میجنڈی اور مسٹر کال۔ جو راضی تو ہو گئے
مگر اس شرط پر کہ مدراس کی حکومت نواب کی ضمانت کرے۔ یہ ضمانت
منظور کر لی گئی اور طے پا گیا کہ چند اضلاع مہاجنوں کو سپرد کر دیئے جائیں جن کی
مالگزاری سے وہ اپنا سود وصول کرتے رہیں۔ اس کے مطابق نواب سے معاہدہ
ہو گیا اور اس نے فوراً اُن سپاہیوں کو علیحدہ کر کے اعلان کر دیا کہ ان
کی بقایا تنخواہیں ادا کر دی جائیں مگر انگریز ساہوکاروں کے پاس سے تو منہ
کا روپیہ نہ آج آتا ہے نہ کل۔ بڑے تقاضوں کے بعد جواب آیا تو یہ
کہ نقد روپیہ اس وقت نہیں ہے چار ماہ کے اندر ادا کر دیا جائے گا۔
البتہ ہم آپ کو رقعہ لکھ دیتے ہیں کہ اس میعاد کے اندر روپیہ دے
دیں گے۔ نواب نے افسروں کو بلا کر حال بتایا اور کہا کہ فوجیوں کو سمجھا کر
رضامند کر دو کہ چار مہینے بعد تنخواہ مل جائے گی۔ مگر چار مہینے کی جگہ
پورے دو سال گزر گئے اور فوجیوں کی بقایا پوری ادا نہ ہوئی۔ جس کی وجہ
سے نواب کو مزید دو سال کی تنخواہیں دینا پڑیں۔ مگر ساہوکاروں کی اس قدر
خدمت کے باوجود نواب کی ریاست کی مالگزاری قرضہ کے سود میں ایسی

لئی۔ اس جنگ کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگریزی فوج میں سے صرف بتیس سپاہی اور نواب کی فوج میں سے پانسو آدمی کام آئے۔ یہ تعداد جلیانوالہ باغ اور بلوہ کانپور کے مقتولین سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اس جنگ نے ایک وسیع اور شاداب ملک کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ فورٹ ولیم میں سونے کا مینہ برسنے لگا۔ میر جعفر کی طرف سے تین لاکھ پونڈ یعنی تیس لاکھ روپیہ کلایو کو نذر دیا گیا اور کلکتہ کا جنوبی علاقہ اُسے جاگیر میں دے دیا گیا۔ جس کی آمدنی دس لاکھ سالانہ روپیہ تھی۔ اسی طرح ساٹھ ہزار پونڈ یعنی چھ لاکھ روپیہ کونسل کے ممبروں کو پیش کیا گیا۔ یہ تو ذاتی انعامات تھے۔ کمپنی کے ہرجہ خرچہ اور تاوان کے مطالبات ان سے الگ تھے جن کو اس وقت پورا کرنے کی گنجائش خزانہ میں نہ رہی تھی اس لئے صرف نصف کی ادائیگی ہو سکی۔ چوبیس پرگنہ کا علاقہ کمپنی کی جاگیر ٹھہرا۔ بقول میکالے:

"کمپنی اور اس کے نوکروں پر دولت کی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اسّی لاکھ روپیہ دریا کے راستہ مرشدآباد سے کلکتہ روانہ کر دیا گیا۔ سو سے زیادہ کشتیاں تھیں۔ جھنڈیاں اڑ رہی تھیں اور باجا بجتا جاتا تھا۔ چند ماہ پہلے جو کلکتہ ویران تھا آج ایسا خوش حال ہو گیا کہ کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ تجارت چمک اٹھی ہر انگریز کے گھر میں دولت کے آثار دکھائی دینے لگے۔"[1]

اس جنگ کی کامیابی نے جو ۱۷۵۷ء میں ہوئی کمپنی کے خالص تجارتی دور کا خاتمہ کیا جو ۱۶۰۰ء سے شروع ہو کر پورے ڈیڑھ سو سال تک رہا اور اب ایک وسیع ملک ہاتھ میں آ جانے سے تجارت کے ساتھ حکومت کا دور شروع ہو گیا۔

---

[1] "سوانح کلایو" مصنفہ میکالے ص ۱۵

کمپنی کی کامیابی کے اسباب

اب غور طلب امر یہ ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن سے کمپنی تجارت کے ادنیٰ درجہ سے حکومت کے اعلیٰ منصب پر پہنچی۔ اس کی نسبت مسز اینی بیسنٹ لکھتی ہیں:

"کمپنی والوں کی جنگ سپاہیوں کی جنگ نہ تھی بلکہ تاجروں کی جنگ تھی۔ ہندوستان کو انگلستان نے اپنی تلوار سے فتح نہیں کیا بلکہ خود ہندوستانیوں کی تلوار سے اور رشوت، سازش، نفاق اور حد درجہ کی دورخی پالیسی پر عمل کر کے ایک جماعت کو دوسری جماعت سے لڑا کر اس نے یہ سب حاصل کیا"[1]

مسز اینی بیسنٹ کا یہ قول اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ لیکن بڑی ناانصافی ہوگی اگر تصویر کا دوسرا رخ بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کے دورِ اقبال میں ہندوستان کے بڑے حصے کی جنگی اور مالی قوت ایک شہنشاہ کے ہاتھ میں سمٹ کر آ گئی تھی۔ جب مرکزی قوت کمزور ہو گئی صوبہ دار آزاد ہو گئے اور یکے بعد دیگرے اپنے نذرانے اور خراج بادشاہ کو دینے بند کرنے لگے تو آخر میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ بادشاہ کسی صوبہ دار کی معطلی یا تبدیلی کا حکم دیتے تو اس کی تعمیل نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے جس نئے شخص کو کسی صوبہ کی گدی پر تقرر کا حکم ہوتا تو فرمانِ شاہی کے ساتھ اس کی تعمیل کے لئے اسے اپنی ایک فوج لے جانا پڑتی اور باقاعدہ جنگ کے بعد اس عہدہ پر تقرر کا فیصلہ ہوتا۔ اس طرح ہندوستان کے تمام صوبہ دار خود سر ہو گئے اور ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ انہیں خودسر اور آزاد حکومتوں اور جماعتوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز بھی تھے۔ جو ہندوستان میں ڈیڑھ سو سال سے قیام کی

---

[1] ہندوستان کی کوشش آزادی کے لئے، مصنفہ اینی بیسنٹ، دیباچہ ص

کے ذخیروں اور کرناٹک کے خزانوں کی بدولت ہوئی۔ (سر ولیم ڈگبی)

ان اقتباسات ظاہر ہے کہ ہندوستانی اس وقت کس قدر زیادہ مالا مال، خوشحال اور خوش و خرم تھے حتی کہ ۱۸۱۳ء میں کمپنی کی حکومت تجارت اور زرکشی کا وہ دور شروع ہوا۔ جس کے حالات آیندہ فصل میں لکھے جاتے ہیں۔
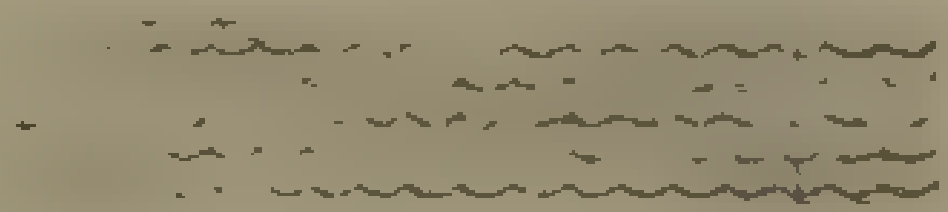
فصل دوم

کمپنی کی تجارت اور حکومت کے پچھتر سال

۱۷۵۷ء تا ۱۸۳۲ء

حکومت کی نوعیت

پلاسی کی لڑائی کے بعد بنگال کی حکومت اب برائے نام میر جعفر کی رہ گئی اور سلطنت پر درحقیقت قبضہ کمپنی کا ہو گیا۔ اس طرح نواب کی ساری اور اختیارات کمپنی کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس دولت سے کمپنی کو ناجائز فائدہ اٹھانے کا خوب موقع ملا ہوس کا اصلی مقصد تھا اور اس نادر موقع کے مل جانے سے کمپنی کے سینوں میں حرص و آز کے جذبات بہت مشتعل ہو گئے۔ نیک نیتی اور دیانت داری کی ملکی بے لگام ہو گئی۔ اس سے قبل ڈاکٹر ہیملٹن فرخ سیر بادشاہ سے انگریزی مال کو تمام محصولوں سے مستثنیٰ کرا چکا تھا حالات سب سازگار ہو چکے تھے۔ اس لئے کمپنی کے ملازموں نے تجارت بھی شروع کر دی بھی شروع کی۔ بنگال میں شاید ہی کوئی بڑی منڈی ہو جہاں کہ پان، بانس، چاول جیسی جنسوں کی خرید و فروخت انگریز نہ کرتے ہوں۔ دیسی سوداگر جنہیں بھاری محصول بھی دینا پڑتے تھے کمپنی کے مال کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔ انگریز تاجروں سے نواب ڈرتا تھا اس لئے اس کی پولیس اور کچہریاں ان کو سزا نہ دے سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت کے نام سے لوٹ شروع ہو گئی۔ انگریز سوداگر جس مال پر ہاتھ رکھ دیتے اس کو پھر دوسرا خریدار آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے یہ لوگ

اس مال کو من مانی قیمت پر خرید لیتے تھے۔ اور جب اس کا مال ان کا ہوتا تو جب تک اس کی نکاسی نہ ہو جاتی دوسرے سوداگر دوکان بند رکھنے پر مجبور ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ جس ہندوستانی تاجر کو محصول سے بچنا ہوتا تو وہ کسی انگریزی گماشتہ کی مٹھی گرم کر کے اُس سے ایک دستک حاصل کر لیتا جس سے کسی چنگی کی مجال نہ تھی کہ مال پر محصول مانگ سکتا۔ اس کی وجہ سے کمپنی کے ادنیٰ ادنیٰ نوکر دیسی سوداگروں کے ہاتھ دستکیں بیچ بیچ کر دو دو تین تین ہزار روپیہ ماہوار پیدا کر لیتے تھے۔ نواب بے دست و پا تھے۔ زیادہ سے زیادہ کر سکتے تھے تو یہ کہ ان ظلم زیادتیوں کی شکایت انہیں کے بے رحم افسروں سے کرتے۔ چنانچہ میر قاسم نے تمام کمپنی سے حسب ذیل فریاد کی:

"ہر پرگنہ گاؤں اور منڈی میں انگریزی گماشتے نمک، چھالی، گھی چاول، بھُس، بانس، مچھلی، تمباکو وغیرہ کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ رعایا کا مال زبردستی اٹھا لے جاتے ہیں اور چوتھائی قیمت بھی نہیں دیتے اور اُن کے ظلم و جبر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے مال کے بدلے ایک کی جگہ پانچ زبردستی لے لیتے ہیں۔ ان بے عنوانیوں کی بدولت اور نیز محصولوں کی معافی کے سبب مجھے پچیس لاکھ روپیہ سالانہ کا نقصان ہو رہا ہے۔"

مگر ایسی شکایتوں کا اثر ہی کیا ہوتا۔ دولت کی چاٹ نے کمپنی کے نوکروں کو رحم و انصاف کے جذبات سے معرا کر دیا تھا۔ بالآخر مجبور ہو کر میر قاسم نے دیسی سوداگروں کو بھی محصول سے معاف کر دیا۔ اس پر انگریز بگڑ گئے اور ایسے بگڑے

ا؎ ہندوستان کی تمدنی تاریخ (انگریزی)، از رومیش چندر دت ص ۲۳

اسی قسم کے طریقوں سے ۱۷۸۰ء تک جو رقم کمپنی اور اس کے ملازمین کے پاس پہنچی اس کی میزان ساڑھے اُنتیس کروڑ روپیہ کے قریب ہوتی ہے جس میں فوجی اخراجات، تاوان، نذرانے اور مالگزاری کی بچت بھی شامل ہے[1]۔ یہ رقم جس مقبوضہ ملک سے حاصل کی گئیں اس کی سالانہ جمعبندی نوابی کے زمانہ میں صرف ڈیڑھ کروڑ روپیہ کے قریب تھی[2]۔ کمپنی کی زرکشی کا سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہا اور تقریباً بیس برس بعد مسٹر برک نے ہسٹنگز کے مقدمہ کے دوران میں اس کی کل رقم کا جو اس وقت تک یہاں سے انگلستان پہنچ چکی تھی۔ چالیس کروڑ کے قریب اندازہ کیا تھا[3]۔

مندرجہ بالا رقوم موجودہ زمانہ میں کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتیں مگر یہ امر مسلّم ہے کہ اس زمانہ میں روپیہ کی قیمت زمانۂ حال کے روپیہ سے سات گونہ تھی اور باوجود ملک کی مسلّم خوشحالی کے حکومت کے اخراجات اس قدر کم تھے کہ پورے صوبہ بنگال سے نواب صرف ڈیڑھ کروڑ سالانہ محصول لیتے تھے۔ اس خفیف رقم کے مقابلہ میں جب کہ کمپنی نے مندرجہ بالا رقوم حاصل کیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی دولت کس طرح دبا دبا کر نچوڑی گئی اور انگلستان کو بہا دی گئی۔ یہاں سے واپسی کا کوئی رستہ نہ تھا۔ اسی حالت کی نسبت لارڈ میکالے نے کہا تھا کہ:

"دولت کے دریا یہاں سے انگلستان کو بہتے چلے جاتے

اسی طرح کمپنی کے طرزِ حکومت کی بہترین تفسیر برک کی ان تقریروں میں

---

[1] [illegible] کی مسند مصنفہ [illegible] ص ۲۶۹، ۲۵۵

[2] ہندوستان کی اقتصادی تاریخ مصنفہ رومیش چندر دت ص ۱۵

[3] برک تقریر مقدمہ ہسٹنگز جلد ۱ ص ۱۷

آتی ہے۔ جو ہندوستانی مسائل پر پارلیمنٹ کے ایوانوں میں وقتاً فوقتاً کی گئیں
ایک جگہ وہ کہتا ہے:

"عربوں، ایرانیوں اور تاتاریوں نے ہندوستان پر بہت سے
حملے کئے جن سے اکثر انتہائی خونریزی اور تباہی ہوئی۔ ان کے قدم
یہیں عموماً ہمارے قدم اس ملک میں اتنا خون بہا کر نہیں بڑھے البتہ ہم نے
دغا اور فریب کی مختلف صورتوں کے ساتھ پیش قدمی کی اور اس اندھی
وراثتانہ عداوت سے فائدہ اٹھایا جو ہندوستانی والیانِ ملک
کے درمیان ایک لاعلاج مرض کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے کھلے میدان
میں قوت آزمائی نہیں کی لیکن سابق فاتحین میں اور ہم میں ایک فرق
تھا اور وہ یہ کہ اُن کی خوش حالی اور بربادی اُن کے نئے وطن یعنی
ہندوستان کی خوش حالی اور بربادی کے ساتھ وابستہ ہو جاتی تھی۔
اُن کے ماں باپ سوچتے تھے تو یہ کہ اسی سرزمین میں اُن کی اولاد
پھلے پھولے گی۔ اسی طرح اُن کے بیٹوں کو بھی اپنے اسلاف کی
یادگاریں یہیں محفوظ نظر آتی تھیں زمانہ سابق کے فاتحین کاشتکار اور صناع
سے بھاری بھاری محصول تو لیتے تھے لیکن وہ ان جیبوں کو جن سے
دوبارہ فائدہ اٹھانا تھا از سرِ نو بھر بھی دیتے تھے۔

مگر انگریزی حکومت میں یہ نظام بالکل بدل گیا ہے۔ تاتاریوں کی دست درازی
سے بے شک ہندوستانیوں کو نقصان پہنچا تھا مگر ہماری سلطنت ہندوستان
کو تباہ کئے ڈالتی ہے۔ نوعمر لونڈے ملک پر حکومت کر رہے ہیں جو یہاں
کے باشندوں سے نہ اُن کا میل جول ہے اور نہ ان سے ہمدردی ہے
دولت کی بھوک اور تیز مزاجی جتنی کہ کسی جوان میں ہو سکتی ہے وہ ان لوگوں

بُن بھری ہوتی ہے۔ اور ملک میں اُن کی آمد کا ایک تانتا بندھا ہوا ہے ایک کھیپ لوٹتی ہے تو دوسری پہنچ جاتی ہے۔ ہندوستانی رعایا کے سامنے مستقبل کی طرف ایک مایوس کن صورت ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ ایک غیر محدود زمانہ تک یہ موسمی شکاری پرندوں کے غول کے غول آتے جاتے رہیں گے جن کی بھوک ہر مرتبہ اور زیادہ تیز ہوتی جاتی ہے۔ درآنحالیکہ جس چیز سے وہ بھوکے ہیں وہ کمیاب ہوتی جائے گی۔[1]

دیوانی مل جانے پر بنگال کی حالت

اوپر دکھایا گیا ہے۔ انگریزوں کے بھی کاروبار سے تجارت اور ملکی محصول کم ہوتا تھا نوب۔ اکیس پچیس لاکھ روپیہ سالانہ کا نقصان جتنا نوابوں کے تخت پر بیٹھتے کمپنی کے نذرانوں اور تاوانوں میں ختم ہو چکے تھے۔ دوسرے کمپنی کے ملازم کمپنی کے کام میں خیانت کرنے لگے تھے اور جس قدر محصول وصول کرتے پورا خزانے میں جمع نہ کرتے اور چونکہ چھبیس لاکھ کی رقم شاہ عالم کو دی جانی شروع ہوگئی تھی اس لئے کمپنی کی مالی حالت بھی خراب ہوگئی۔ پس کارکنانِ کمپنی مجبور ہوئے کہ اب زمین سے آمدنی بڑھانے کی تدبیریں کریں۔ مغلوں کے عہد سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ بہت سی زمینیں ٹھیکہ داروں کو دی جاتی تھیں جو مالگذاری وصول کر کے ایک معین رقم حکومت کو دینے کے ذمہ دار ہوتے تھے یہ ٹھیکہ دار قانوناً زمین کے مالک نہ ہوتے تھے مگر دستور یہ تھا کہ انہیں زندگی بھر ان جائیدادوں سے ہٹایا نہ جاتا تھا جو مغلوں کے آخری عہد میں یہ لوگ مستقل طور پر قابض ہو گئے تھے۔ اب جب کہ کمپنی کے خزانہ پر اخراجات کا ناقابل برداشت بار پڑا تو اس نے ترمیم

---

[1] تصانیف برک جلد سوم ص ۹۰ - ۹۱۔

ٹھیکہ منسوخ کرالیا تاکہ مزید نقصان سے محفوظ رہیں[1]۔

نئے سرمایہ داروں کا عروج

اب دیکھنا یہ ہے کہ جن لوگوں کو زمینی ٹیکے یہ ٹھیکے دیئے جاتے تھے وہ کون لوگ تھے؟

اس کا جواب حسب ذیل اقتباس میں ملتا ہے:

"جس زمانہ میں کمپنی کی ملازمت محض تجارتی تھی اور کمپنی کے ملازمان ملک کے حالات سے ناواقف تھے تو وہ اکثر چھوٹے ملازموں سے جو بنئے کہلاتے تھے کام لیا کرتے تھے[2]"

یہ بنئے اُن قدیم خاندانی ساہوکاروں سے مختلف تھے جن کے تعلقات پرانے نوابوں اور بیوپاریوں کے ساتھ پشتہا پشت سے چلے آتے تھے اور جن کے وہ خزانچی تھے اور کمپنی کے لوگوں کی دسترس سے باہر تھے اس لئے وہ اپنے چھوٹے ملازموں سے بازاروں میں خرید و فروخت میں مدد لیتے تھے۔ اور انہیں کی دلالی سے فائدے اٹھاتے تھے۔ پس جب کمپنی نے تجارت سے آگے بڑھ کر حکومت کے دائرہ میں قدم رکھا تو سب سے زیادہ یہ دلال اور بنئے ہی اُن کے کارآمد ہو سکتے تھے۔ چنانچہ وہ کارآمد ثابت ہوئے اور رفتہ رفتہ خود سب لوگوں پر حاوی ہو گئے۔ بالخصوص نو وارد انگریز جنہیں ابتدا میں تھوڑی تنخواہیں ملتی تھیں ان بنیوں کے دست نگر ہوتے تھے کیونکہ وہی ان کی نجی تجارت کے کارکن ہوتے تھے اور ضرورت کے وقت انہیں قرض دیتے تھے۔ پس جب یہ انگریز بڑے عہدوں پر پہنچتے تو قدرتی طور پر انہیں دل کھول کر نوازتے تھے۔ ان تعلقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلکتہ میں فورٹ ولیم کے گرد

---

[1] برک کی تقریر ہیسٹنگز پر جلد دوم ص ۷۶۔

[2] بقول مسٹر ہیل، تاریخ میجر ہ سوص ۶۲

ان بنیوں کی ایک معقول آبادی ہوگئی۔ جن میں سے بعض اپنی دولت و ثروت کی بدولت حکومت کے انقلاب میں حصہ لیتے تھے۔ مسٹر برک نے ان کا ذکر کرتے ہوئے ایک مرتبہ کہا تھا:

"بنیا یا دیوان انگریز کے گھر کا منتظم ہوتا تھا۔ وہ تمام چالبازیوں فریب اور عیاریوں سے واقف ہوتا ہے جو مظلوم سے نچوڑنے کے لئے ایک ظالم استعمال کرتا ہے۔ بنیا لوٹتا ہے، استحصال بالجبر کرتا ہے، غارت گری کرتا ہے۔ اور پھر اس میں سے جس قدر مناسب سمجھتا ہے اپنے صاحب کو بھی دے دیتا ہے۔ ان بنیوں نے بڑے بڑے گھر تباہ کر دیئے ہیں۔ ملک برباد کر دیا ہے اور سرکاری مالگذاری کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔"[1]

سرکاری مالگذاری کو نقصان پہنچنے کا موقع بھی بنیوں کی وجہ سے تھا کہ انگریز ہر وقت ان کے ذریعے سے ذاتی نفع حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے فرضی بنیوں کے نام ٹھیکے پر دیئے جاتے تھے لیکن اصلی ٹھیکیدار کوئی با اختیار انگریز ہوتا تھا جو خود پردہ میں رہتا تھا۔ چنانچہ انہیں انگریز ٹھیکیداروں کی بدولت بہت سے پرانے شریف اور خاندانی ہندو اور مسلمان اپنی اپنی زمینداریوں سے جبراً نکالے گئے اور قانون کے خلاف بے دخل اور محروم کر دیئے گئے۔ اس وقت کے قانون کی رو سے کسی ایک شخص کو ایک لاکھ سے زیادہ مالگذاری کا ٹھیکہ دینا جائز نہ تھا۔ مگر بڑے بڑے صاحب لوگوں کے بنئے قانون سے آزاد تھے۔ ان دنوں ہیسٹنگز گورنر جنرل کا بنیا کنتو بابو تیرہ لاکھ کا ٹھیکیدار تھا۔ ایک دوسرا بنیا

---

[1] برک کی تقریریں جلد اول ص ۲۲، ۲۳

[2] ایضاً ص [illegible]

گنگا گوبند بھی وارن ہسٹنگز کا آلۂ کار تھا اور اُس کی نسبت دارالعلوم میں جولائی ۱۷۸۵ء میں ایک حساب دکھایا گیا تھا۔ جس کی رُو سے گنگا گوبند سنگھ کی کمائی تین کروڑ بیس لاکھ روپیہ کے قریب پہنچتی تھی۔[1]

اسی طرح گورنر کے دیوان رامچندر کی نسبت بیان کیا گیا تھا کہ وہ ساٹھ روپیہ ماہوار کا ملازم تھا مگر اس نے ساڑھے بارہ کروڑ کے قریب ترکہ چھوڑا کمپنی کے ایجنٹ روپ کشن کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس نے ماں کے مرنے پر نو سے لاکھ روپیہ صرف کیا تھا۔

یہی وہ بنئے تھے جن کو خاک سے اٹھا کر انگریزوں نے آسمان پر پہنچایا پہلے ٹھیکوں کے ذریعہ یہ بڑی جائیدادوں پر قابض ہوئے اور پھر دوامی بندوبست کے بعد مالک بن گئے آگے چل کر سود غیر محدود کر دیا گیا اور قرضوں میں زمینی جائیدادیں نیلام ہونے کا قانون نافذ کیا گیا۔ ان قوانین سے قدیم شریفوں اور سیٹھوں کے گھرانے برباد ہو گئے اور بڑے بڑے علاقے ان نئے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ پرانے زمینداروں پر ان بنیوں نے جو جو ظلم کئے اور جن جن فریبوں کے ساتھ انہیں لوٹا اس کا اندازہ صرف دیبی سنگھ کی مثال سے ہو سکتا ہے۔ دیبی سنگھ بھی کلکتہ کی حکومت کے محبوب بنیوں میں سے تھا۔ چنانچہ بنگال کے بڑے بڑے علاقے اسی کو ٹھیکہ پر دیئے گئے تھے۔ دیبی سنگھ آبرودار لوگوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر حوالات میں رکھتا اور اضافہ کا اقرار کراتا تھا۔ اس نے مالگذاری کے علاوہ نئے نئے محصول اور ابواب ایجاد کر لئے تھے۔ اور جب زمیندار پر لگان باقی ہوتا تو اس کی زمینداری سستے داموں نیلام کرا کر خود مول لے لیتا اور یہ قیمت بھی اسی روپیے

---

[1] برک مقدمہ ہیسٹنگز جلد اوّل ص ۲۱۳

سے وصول کرتا جو انہیں زمینداروں سے پیشگی وصول کر چکا ہوتا۔ اس بنئے نے کئی سو مواضع
چار یا پانچ آنے فی بیگہ کے حساب سے مول لے لی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صدہا کے
قصبے ویران ہو گئے اور بقول مسٹر برک:[1]

زمیندار گھر بار اور نوکر چاکر سب چھوڑ کر بھاگ نکلے اور بن گئے
سے پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ اوقاف نیلام ہو رہے ہیں جو
انہوں نے یا ان کے بزرگوں نے خدا کی راہ میں اس لئے دے رکھے
تھے کہ اُن کی آمدنی سے بیواؤں، یتیموں، لنگڑے لولوں اور اپاہجوں
کی امداد کی جائے، وہ جائیدادیں بھی جو خود انہوں نے کفن دفن اور مرنے
کی رسموں کے لئے علیحدہ کر رکھی تھیں فروخت کر دی گئیں۔ افسوس کہ
جانکنی کے وقت سکون اور اطمینان سے گزر جانے کا سہارا بھی اس
ظالم ہاتھ نے قطع کر دیا۔ اُف کیسا ظالم ہاتھ تھا جس کا ظلم چتا کی آگ
جلانے والے تیر سے زیادہ حریص اور موت سے زیادہ بے رحم تھا۔

اسی طرح رانی بھوانی کنور بھی، جس کی دردناک درخواستوں سے سنگدل حکومت
پر کچھ اثر نہ ہوا، ان رئیسوں میں سے تھی جو اسی بنیہ گردی میں تباہ ہوئے۔ قدیم زمیندار
برباد ہو رہے تھے، بنیوں کا قبضہ کاشتکاروں کے لئے بھی ایک مصیبت تھا۔
ان کی زمینوں پر ہر طرح کی سختیاں کی جاتیں اور جانوروں کے گلوں کی طرح قید
میں رکھ کر آخری کوڑی تک ان کی جیبوں سے نکلوا لی جاتی اور ان طریقوں سے بھی
رقم پوری نہ ہوتی تو ان کے ڈھور ڈنگر اور گھر کا سامان نیلام کر دیا جاتا۔ بیسیوں گھروں
کو جن میں وہ رہتے تھے آگ لگا دی جاتی ان مظالم سے تنگ آ کر کسان بھاگنے لگے تو فوجوں

---

[1] برک کی تقریر ہیسٹنگز پر جلد دوم ص ۲۳۰۰۲۹

کا گھیرا ڈال کر انہیں واپس کیا گیا تاکہ وہ انہیں گندوں میں رہیں جو قید خانوں سے کم نہ تھے۔ پھر اپنے گھروں کے مصائب سے تنگ آکر بہت سے کاشتکار جنگلوں میں جا چھپے تو وہاں بھوک اور جنگلی جانوروں نے عاجز کر دیا تب پھر واپس آئے اور مجبور مقابلے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس بلوہ کو پہلے بے قاعدہ اور پھر باقاعدہ فوج کے ذریعے دبایا گیا اور ظلم کی تلافی میں اور زیادہ مظالم کئے گئے۔ مسٹر گولڈ لیڈ نے کیٹی مار نوس بلوہ کی نسبت لکھا کہ بنگال میں اس سے زیادہ سخت بلوہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

دوامی بندوبست سے فائدہ

بالآخر قوت کا نشہ رفتہ رفتہ زائل ہونے لگا تو خود انگریز محسوس کرنے لگے کہ یہ بدنیتی و زیادتی جو ان کی بدولت ظہور میں آرہی تھی خود ان کے لئے زہر کا کام کرے گی۔ سنجیدہ دماغ والے افسر بار بار ان خرابیوں کی طرف توجہ دلا چکے تھے۔ درخصوصیت کے ساتھ "جان شور" جو ایک تجربہ کار افسر تھا کمپنی کی مالی پالیسی کے عیب ثابت کر چکا تھا۔ آخر بڑی بحث و تمحیص کے بعد لارڈ کارنوالس نے بنگال میں استمراری بندوبست کا اعلان کر دیا۔ اس کی رو سے عارضی ٹھیکیدار مستقل مالک بنا دیئے گئے۔ لگان کا دس فی صدی روپیہ زمیندار کو چھوڑا گیا اور نوے فی صدی سرکار کا حق ٹھہرا۔ اس بانٹ کو ایمانداری کی تقسیم نہیں کہہ سکتے کیونکہ وصولیابی کے اخراجات نکالنے کے بعد انہیں کچھ نہ بچتا تھا اس لئے وہ زمینداریاں چھوڑنے لگے۔ بقول مسٹر باسو دوامی بندوبست کے بعد بیس برس کے اندر زمینداروں کا طبقہ سرتاپا بدل گیا۔ اب بنگال کی مالگذاری نوابی کے عہد سے پوری دونی ہو گئی۔ لیکن روپیہ کی قیمت بھی گر رہی تھی

۱؎ ان تمام واقعات کے لئے ملاحظہ ہو تقریر مسٹر برک بر سلسلہ مقدمہ وارن ہیسٹنگز جلد اول

۲؎ ہندوستان میں عیسائی سلطنت کا عروج مصنفہ میجر باسو ص ۲۱۲

کہ انگریزی فوج نے اپنی چھاؤنیوں کو گنج بنا لیا اور آس پاس کے گنج و بازار بند کر دیئے اور بیوپاریوں کو زبردستی اپنی منڈیوں میں لاکر تیس تیس چالیس ہزار روپے اُن کے ٹھیکے دیتے تھے اور وہ آمدنیاں اپنی جیبوں میں رکھتے تھے۔

اس کے علاوہ بعض انگریزی افسر نواب کی رہنی کے ٹھیکے لیتے تھے اور اُن پر اس طرح قابض ہو جاتے کہ نواب کی حکومت ختم ہو جاتی۔ اس قسم کے ٹھیکیداروں میں سے ایک مسٹر ہاپنی تھے جن کی زیادتیوں کی وجہ سے ایک زبردست بلوہ ہو گیا۔[1] بالآخر غریب نواب کو ان انگریزی فوجوں کے بار سے سبکدوش کر کے اس کی آدھی سلطنت انگریزی علاقے میں شامل کر لی گئی۔[2]

اسی زمانہ میں کمپنی کو مرہٹوں کی لڑائی کے سلسلہ میں سندھیا سے علی گڑھ و شمالی دوآب حاصل ہوئے۔ ان جدید اضافوں سے اب پھر کمپنی کے سامنے اراضی کے بندوبست کا مسئلہ پیش آیا تو لگان کا اسی فی صدی سرکاری مالیانہ مقرر کیا گیا۔ اور لوگوں کو یقین دلایا گیا کہ بندوبست کو دوامی کر دیا جائے گا۔ مگر ڈائرکٹرانِ کمپنی نے اسے منظور نہیں کیا۔ اس لئے صوبہ متحدہ میں بار بار بندوبست کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا جو کمپنی کی روز افزوں آمدنی کا ذریعہ ہوا۔ اسی طرح بمبئی اور مدراس میں جو زرخیز اور وسیع علاقے حاصل کئے گئے تھے وہاں بھی میعادی بندوبست کی غیر معین جمعبندی نے کاشتکاروں کو مفلس کر دیا اور چند اضلاع کے سوا ہر جگہ قدیم میراث داران یعنی زمیندار، پالی گار، ممدیوں کی مقبوضہ جائیدادوں سے محروم کر دیئے گئے۔ ان تمام واقعات سے ظاہر ہے کہ اس دور میں کمپنی نے روپیہ پیدا کرنے کی ہوس میں

۱؎ تصانیف برک جلد دوم ص ۶۰، ۱۲۱

۲؎ رومیش چندر دت ص ۷۷

موروثی حقوق اور ملک کی قدیم روایات کو کس طرح یک قلم منسوخ کر دیا۔

انگریزوں کو کاروبار کی اجازت

ایک عرصہ سے کمپنی کا مندرجہ بالا طریق حکومت جو جابرانہ تجارتی قیود سے آزاد کتا اور مالی منافع کی خاطر ہندوستان کو افلاس اور فاقہ کشی کا شکار بنا رہا تھا بعض حریت ور انصاف پسند انگریزوں کو ناگوار تھا۔ اس سے قبل کلائیو اور ہیسٹنگز کے مقدمات کے سلسلہ میں انگلستان میں ان لوگوں کے مظالم کا چرچا رہتا تھا۔ اسی طرح لارڈ ویلزلی اپنی گورنر جنرلی کا زمانہ پورا کر کے انگلستان واپس گئے تو ان کی دراز دستیوں پر بھی مقدمہ چلانے کی تیاریاں کی گئیں۔ پھر اس زمانے میں نپولین اعظم نے یورپ کے بازاروں میں انگریزی مال کا جانا بند کر دیا تھا جس کی وجہ سے انگریز کارخانہ دار تاجر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے۔ وہ اپنا مال کھپانے کے لئے نئے بازاروں کی تلاش میں تھے۔ حسن اتفاق سے کمپنی کے بیست سالہ ٹھیکہ کی تجدید کا وقت آ گیا۔ اس وقت تک سوائے کمپنی کے کوئی انگریز تاجر ہندوستان میں تجارت نہ کر سکتا تھا۔ اب انگریز تاجروں کی طرف سے زور دیا گیا کہ جدید آئین میں یہ اجازت عام کر دی جائے۔ اس کے طے کرنے کے لئے حسب معمول تحقیقاتی کمیٹی کا تقرر ہوا۔ اس کے سامنے بہت سے انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہ چکے تھے بالاتفاق یہ خیال ظاہر کیا کہ:

> "یورپین تاجروں کو ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت دی گئی تو اس سے بدنظمی پیدا ہوگی اور یہ لوگ ہندوستانیوں پر ظلم کریں گے۔"[1]

مگر ان لوگوں کی ایک نہ چلی اور عام رائے کے مطابق ۱۸۱۳ء کے قانون کی رو

---

[1] "ہندوستان میں انگریزوں کا آباد ہونا" از تیج بہادر سپرو ص ۲۵

سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ دوسرے انگریز سوداگروں کو بھی ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس سے انگریزوں کے لئے ہندوستان میں ہر قسم کی تجارت اور کاروبار کے دروازے کھل گئے اور انہوں نے یہاں جو کاروبار کئے اُن میں علاوہ بیسیوں قسم کی تجارت کے دو کام بڑے پیمانہ کے تھے۔ ایک چائے اور دوسرے نیل کی کاشت۔ اُن کے لئے تمام ملک میں کارخانے اور کوٹھیاں قائم کی گئیں۔ ان کاموں میں چونکہ کاشتکاروں سے سابقہ رہتا تھا اس لئے دیہات میں انگریزوں کے مظالم کا ایک جدید باب کھل گیا اور ہندوستان کے تجربہ کار انگریزوں کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی چائے اور نیل کے کاشتکاروں کی حالت غلاموں سے بدتر ہو گئی اور اس وجہ سے کہ انگریزوں کے خلاف بجز صوبہ کے صدر مقام کے کسی ضلع کی عدالت میں چارہ جوئی نہ کی جا سکتی تھی یہ انگریز تاجر قانون کی بندشوں سے آزاد تھے میجر باسو نے ان لوگوں کی نسبت لکھا ہے:

> "تجارت خلق کی ایک مشین ثابت ہوئی جس سے بدقسمت ہندوستانی کاشتکار تباہ ہونے لگے اُن پر ان کے انگریز آقا طرح طرح کی مہذب بربریت کا استعمال کرتے تھے اور اس سے محظوظ ہوتے تھے۔"[1]

کمپنی کے اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اُسے بجز زر کشی کے اور کسی چیز کی طرف توجہ نہ تھی۔ ملک کے کاروبار پر قبضہ کرنے کے علاوہ دیسی ریاستوں پر قبضہ ہونے کی وجہ سے سینکڑوں زمیندار اور ہزاروں سپاہی اور ملازم بے روزگار ہو گئے۔ اور انہوں نے مجبور ہو کر لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ ناگپور سے لے کر خلیج بنگال تک تیس ہزار پنڈاری لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ جنہوں نے

---

[1] "انگریزی سلطنت کا استحکام" از میجر باسو ص ۵

۱۸۱۱ء کے موسم سرما میں صرف دس دن کے اندر ۱۹۲ آدمی قتل کئے ۵۰۰ زخمی کئے کوئی تین ہزار کو طرح طرح کی ایذائیں دیں اور تقریباً ایک کروڑ کا مال لے گئے ؎

اسی ایک مثال سے اس عہد کی بدامنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے مگر غنیمت ہے کہ کمپنی کے تجارتی حق میں عام انگریزوں کے شریک ہو جانے کی وجہ سے کمپنی کے عہدہ داروں کو ملک میں امن قائم کرنے کی طرف توجہ ہوئی اور انہوں نے ڈاکوؤں اور قزاقوں کا استیصال شروع کیا۔

صنعت و حرفت کی بربادی

زمینداری اور کاشتکاری کے بعد اب چند الفاظ صنعت و حرفت کی نسبت کہنے ضروری ہوتے ہیں۔ جس میں ہندوستان قدیم زمانہ سے ممتاز تھا یہاں کے کاریگر دوسرے ملک کو اپنی مصنوعات کا محتاج رکھتے تھے۔ اور عام ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جو باہر سے خریدی جاتی ہو۔ ارکاٹ و پلاسی کی لڑائیوں کی بدولت دکن اور بنگال دونوں جگہ انگریزی کمپنی کی حکومت کے اثرات سے ملک کی صنعت و حرفت برباد کر دی ؎ موقر مصنف مسٹر رومیش چندر دت کی معرکۃ الآرا تصنیف اس دردبھری داستان کو سناتی ہے۔ کمپنی کا دستور تھا کہ ہندوستانی مصنوعات کی آمدنی سے حکومت کے مصارف منہا کرنے کے بعد جو بچت ہوتی اس سے تجارت کا سامان خرید کر ولایت بھیج دیا جاتا جو وہاں بڑے نفع کے ساتھ بکتا اور پھر وہ رقم جو اس مال کی بکری سے حاصل ہوتی حصہ داروں کو سالانہ منافع کی صورت میں تقسیم کر دی جاتی اس کے یہ معنی تھے کہ ہندوستان سے جتنا مال تجارت کو روانہ کیا جاتا اس کے معاوضہ میں ایک پائی بھی ہندوستان لوٹ کر نہ آتی۔ سو کروڑ روپیہ سالانہ سے زیادہ برآمد کا دستور تھا ؎ لیکن باوجود اس کثیر نفع کے

؎ [illegible] ص ۱۰

؎ ہندوستان کی تمدنی تاریخ از رومیش چندر دت ص ۲۰۳

ہندوستانی مال سے ولایت کی منڈیوں میں کمپنی کو حاصل ہوتا تھا۔ کمپنی کی پالیسی یہ
تھی کہ ہندوستان کی صنعت کو برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ کتنے ہی احکام صادر
کئے گئے کہ بنگال میں ریشم پیدا کرنے کی کوشش کی جائے لیکن ریشم کے کپڑے تیار
کرنے کو روکا جائے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ریشم بافوں کو جبراً
کمپنی کے کارخانوں میں ملازم رکھ لیا گیا۔ اور دوسرے کسی گاہک کی فرمائش پر کپڑا بننے
کی ممانعت کر دی گئی۔[1] اسی طرح جنوبی دکن کی چھینٹوں اور سوتی کپڑوں کی صنعت برباد کر دی
گئی۔ پارچہ بافوں کو زبردستی تیار کرایا جاتا۔ ان کے اوپر سپاہی مسلط کر دیئے جاتے اور جب
تک وہ یہ معاہدہ نہ کر لیتے کہ وہ کسی کے لئے کپڑا نہیں بنیں گے نہیں چھٹنے دیا جاتا۔
اگر وہ کمپنی کا کپڑا پہنچانے میں دیر کرتے تو سزا کے مستوجب ہوتے۔[2] ہندوستان کی
صنعتوں کو تباہ کرنے کے لئے کمپنی اور برطانوی حکومت دونوں یکساں آرزومند تھیں
اس کا اندازہ اس شرح محصول سے کیا جا سکتا ہے جو برطانیہ کے ساحل پر ہندوستانی
مال کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ ۱۸۱۳ء میں سوتی کپڑوں پر ۶۷ اور ۱۷ فی صدی لیا جاتا تھا۔
اور پھر بھی انگلستان کے بازاروں میں وہاں کی مصنوعات سے سستا بکتا تھا۔[3] ان دونوں
مخالف قوتوں کا ثمرہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے جانے والی مصنوعات کی مقدار
ہر سال گھٹنے لگی۔ ۱۸۰۰ء میں بنا ہوا سوتی کپڑا دو ہزار چھ سو چھبیس گٹھے بھیجا گیا تھا اور
انتیس برس بعد اُن کی تعداد چار سو تینتیس رہ گئی۔ ہندوستان کا مورخ مسٹر ولسن اس
طرز عمل کے متعلق لکھتا ہے:

---

[1] رومیش چندر دت ص ۲۵

[2] رومیش چندر دت ص ۲۷۲، ۲۵۶

[3] ہندوستان کی اقتصادی تاریخ از رومیش چندر دت ص ۲۰

میں بھی کمپنی نے حد درجہ کی تنگ نظری سے کام لیا۔ وہ یہ کہ ایک طرف تو انگریز عہدہ داروں کی تنخواہیں ملک کے دستور کے خلاف بڑھا دیں اور دوسری طرف ہندوستانیوں کو نہ صرف بڑے بلکہ اوسط درجہ کے عہدوں سے بھی محروم کر دیا۔ یہاں تک کہ تنفیذ اور مالی محکمے تو درکنار عدالت اور انصاف کے عہدے بھی جہاں ہندوستانیوں کے بغیر کام چلنا مشکل تھا۔ انگریزوں کے لئے جنہیں ملک کا قانون سمجھانے کے لئے پنڈت اور مولوی مقرر کرنے پڑتے ہیں، مخصوص کر دیئے۔ اس تکلیف دہ حالت سے متاثر ہو کر سر ہنری اسٹریچی نے کورٹ آف ڈائرکٹرس کو یہ مراسلہ لکھا:

"اگر منصفوں کے اختیارات سماعت دو سو روپیہ تک بڑھا دیئے جائیں اور اُن کو فیاضی کے ساتھ تنخواہیں دی جائیں تو اُن کی تنخواہیں مقدمات کی فیس دہ رہ سے پوری ہو جائیں۔ فیاضی سے میری مراد یہ ہے کہ انگریز جج کی تنخواہ کے دسویں حصہ سے کم تنخواہ ان ہندوستانی منصفوں کو دی جائے۔"[1]

کمی تنخواہ کے بارے میں راجہ رام موہن رائے کی اس شہادت سے جو انہوں نے ۱۸۳۱ء کے قریب پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے دی تھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عدالتوں میں ہندوستانیوں کی تنخواہیں دس روپیہ ماہوار سے شروع ہو کر سو روپیہ پر ختم ہو جاتی تھیں۔ جن میں افسر اعلیٰ کچہری میں جانے کے لئے پالکی پر ۲۰ روپیہ سے ۳۰ روپیہ ماہوار تک صرف کرتا تھا۔[2] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسٹریچی صاحب کے حساب سے ہندوستانی منصفوں کے مقابلہ میں انگریز ججوں کی تنخواہیں دس

---

[1] رمیش چندر دت ص ۳۰۶

[2] سوانح راجہ رام موہن رائے ص ۲

تھیں۔ اس سے بڑھ کر ہندوستانیوں کے ساتھ بے رحمی اور ان کی تذلیل کیا ہو سکتی تھی۔

انصاف کی قیمت

عہدہ داروں اور ملازمتوں کے سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کی عدالتوں کی نسبت کچھ بیان کیا جائے۔ ۱۷۶۵ء میں دیوانی یا صیغۂ مال کے ملنے کے بعد سات سال تک بنگال میں دو عملی یعنی کمپنی اور نواب دونوں کی حکومت رہی۔ ۱۷۷۲ء میں وارن ہسٹنگز نے ان کا خاتمہ کر کے پولیس اور فوجداری کا انتظام بھی کمپنی کے ہاتھ میں لے لیا۔ ہر ضلع میں انگریز کلکٹر مقرر کئے جو مالگزاری وصول کرنے کے ساتھ مال کے مقدمات بھی فیصل کرتے تھے۔ اور کلکتہ میں اپیل سننے کے لئے دو عدالتیں یعنی صدر نظامت اور صدر دیوانی قائم کیں مگر پارلیمنٹ نے کمپنی کی زیادتیوں کے حالات سن کر ۱۷۷۳ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کیا اور اس کی رو سے بورڈ آف کنٹرول یعنی جماعت نگران کار اور عدالت ہائیکورٹ قائم کئے۔ یہ پہلا ہائی کورٹ بادشاہ کی طرف سے کلکتہ میں قائم ہوا اور مسٹر امپی اس کے چیف جسٹس انگلستان سے مقرر ہو کر آئے جن کی تنخواہ آٹھ ہزار روپیہ ماہوار مقرر کی گئی تھی۔ اس ہائی کورٹ کی خصوصیت اب تک یہ قائم ہے کہ لاکھوں روپیہ کے دعوے صرف دس روپیہ کے اسٹامپ پر ہو سکتے ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ سلطنت برطانیہ کے حکم سے انصاف کی قیمت برائے نام مقرر کی گئی تھی۔ مگر کمپنی نے یہ کیا کہ کلکتہ کے باہر تمام ملک میں جو عدالتیں اس کے تحت میں قائم تھیں ان میں دعویداروں کے لئے تجارتی اصول کے مطابق مالیت مقدمہ کی نسبت سے کورٹ فیس لگا دیا۔

اب صرف کلکتہ ہائی کورٹ پر کمپنی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اور اس کے بعض فیصلے کمپنی کے منشاء کے خلاف ہو جایا کرتے تھے۔ اس کے لئے مسٹر وارن ہسٹنگز نے

مدعا علیہ کو حکم ہوتا ہے کہ مطالبہ سے دو چند کی ضمانت فراہم کرے اگر ضمانت کا انتظام نہیں کر سکتا تو غریب کو قید خانہ جانا پڑتا ہے حاضری کا کوئی ضامن نہیں بنتا تو مجرم خواہ بے قصور ہو دس بارہ برس تک جیل خانہ میں پڑا رہتا ہے اس پر طرہ یہ ہے کہ عرضی سوال کا انگریزی ترجمہ کرنے والا جتنی تعریفیں وصول کر لیتا ہے اتنی سطریں بھی اس عرضی میں نہیں ہوتیں۔

میکالے نے اس عدالت کی تصویر اور بھی زیادہ بھیانک کھینچی ہے وہ یہ ہے:

"بہت کم انگریز اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ جدید اصلاحات کے بعد بھی انگریزی عدالتیں ضرورت سے زیادہ مہنگی اور دیر طلب ہیں۔ باوجود اس کے انگریزی کچہریوں کا صرف اور طول عمل جو بجائے خود بہت تکلیف دہ ہے ان تکالیف کا جزو حقیر تھا جو انگریزی قانونوں کو ہندوستان میں نافذ کر دینے سے پیدا ہو گئیں۔ بات بات پر حلف لئے جاتے تھے درآں حالیکہ قسم کھانا ہر ذی عزت ہندوستانی کے نزدیک گناہ ہے اس کے علاوہ مشرق میں کسی شریف آدمی کے زنانہ مکان میں غیر مرد کا گھس جانا یا کسی عورت کا بے پردہ دیکھ لینا ناقابل برداشت ظلم سمجھا جاتا ہے جس کا بدترین انتقام خون سے لیا جاتا ہے مگر یہی مصیبتیں تھیں جن کا نشانہ بنگال اور بہار کے شریف گھرانے بنائے جا رہے تھے۔ ہندی رعایا کے بدترین لوگوں کا ایک گروہ ان کے گرد جمع ہو گیا تھا جن میں مخبر، [illegible] فتنہ پرداز اور جعلساز سب ہی تھے۔ اور ان کے سوا [illegible] کہ وہ قزاق عملہ تھا جس کے سامنے انگریزی حکومت کے

---

(۱) سیر متاخرین جلد سوم ترجمہ انگریزی ص ۲۰

بد ترین شخص بھی ایذا رساں اور رحمدل معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوستانی شریف جو بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے گرفتار ہو کر کلکتہ بھیجے گئے۔ وہ قید خانہ میں بند کر دیئے گئے۔ ہندوں کے زنانخانے وہ چیز ہیں کہ مشرقی سلاطین جو کسی چیز کا احترام نہیں کرتے اُن کا احترام کرتے ہیں مگر اب یہی زنانخانے تھے جہاں ناظروں اور امینوں کے گروہ گھس گھس جاتے تھے۔ ایسی مثالیں بھی دیکھی گئیں کہ حرم سرا کی حفاظت میں بعض نے لڑ لڑ کر ڈیوڑھیوں پر جانیں دے دیں۔ مرہٹوں کے حملے سے بھی تو یہ بل چل نہیں پیدا ہوئی تھی جو انگریزی قانون کی اس یورش سے ظہور میں آ رہی تھی۔"[1]

عدالتوں میں دیگر مشکلات زیادتی خرابیت اور بے عزتی کے علاوہ ایک اور مشکل یہ پیدا ہوئی کہ ملک کے پرانے قوانین کو نظر انداز کر کے بیک وقت انگلستان کے بہت سے قوانین مثل قانون معاہدہ، قانون شہادت وغیرہ کے جاری کر دیئے گئے جنہیں عوام تو کیا خواص بھی نہ سمجھتے تھے۔ اس بارہ میں ایک لطیفہ یہ ہوا کہ جب قانون دادرسی خاص کا بل کونسل میں پیش ہوا تو اُسی زمانہ میں مدراس میں قحط پڑ رہا تھا۔ چونکہ دادرسی کے لئے اس بل میں "ریلیف" کا لفظ استعمال کیا گیا تھا جو قحط کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا تو اس سے وائسرائے کی کونسل کے بعض ممبر جو سب کے سب انگریز تھے، یہ سمجھے کہ یہ قانون مدراس کے قحط زدہ علاقوں کے لئے ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ جس قانون کو انگلستان کے رہنے والے بھی نہ جانتے تھے اُسے غریب

---

[1] میکالے کا مضمون ہیسٹنگز کے متعلق ص ۲۳۰۔

انصاف کرنے میں قطعی غیر جانبدار رہتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا ورنہ صرف اہل ہند اور اہل یورپ میں بلکہ دیسی عیسائیوں اور دوسرے مذہب والے ہندوستانیوں کے درمیان امتیاز کیا۔ چنانچہ ۱۸۲۷ء میں جب جدید جوری کا قانون نافذ ہوا تو راجہ صاحب نے اس کے خلاف ہندو مسلمانوں کی طرف سے ایک احتجاجی عرضداشت پرزور الفاظ میں پارلیمنٹ میں بھیجی۔ اس میں لکھا گیا کہ عدالتوں میں مذہبی امتیاز قائم کر دینے سے ہندوستانیوں میں سخت ناراضگی ہے۔ اس قانون کی رو سے معزز ترین ہندوستانی کا مقدمہ ایک دیسی عیسائی حاکم کر سکتا ہے۔ برخلاف اس کے دیسی عیسائی کا مقدمہ ایک معزز ہندوستانی کی عدالت میں نہیں جا سکتا۔ نیز یہ کہ ہندوستانیوں کے مقدمات کے فیصل کرنے کے لئے جوری بٹھائی جاتی ہے تو کوئی ہندوستانی اس جوری کا ممبر نہیں ہو سکتا ان امور سے ہندوستانیوں کی انتہائی ذلت اور توہین ہو رہی ہے۔[1]

مختصر یہ کہ کمپنی نے اپنا تجارت اور حکومت کے مخلوط عہد میں حکومت کے پردہ میں خوب زرکشی کی، ہندوستان کی صنعت و حرفت اور تجارت کو برباد کیا۔ انہیں بڑے عہدوں سے خارج کیا۔ عدالتوں کو ذریعہ آمدنی قرار دینے کے ساتھ ہندوستانیوں سے تحقیر کا برتاؤ کیا۔ ان شکایات اور دیگر وجوہ کی بنا پر پارلیمنٹ نے ۱۸۳۳ء میں کمپنی سے تجارت کرنے کا حق چھین لیا اور اس وقت سے اس کے ہاتھ میں صرف ہندوستان کی حکومت رہی جس کا حال آئندہ فصل میں لکھا گیا ہے۔

---

[1] سوانح راجہ موہن رائے (انگریزی) از [illegible] ص ۴۳

قائم ہو چکی تھی۔ برخلاف سابق کے کمپنی کا نقطۂ نظر بعد میں بدل گیا تھا اور وہ چاہتی تھی
کہ اہلِ ہند کی حالت بہتر ہو تاکہ وہ کمپنی کے مختلف قسم کے محصول ادا کرنے کے
قابل رہیں۔ جن سے اعلیٰ عہدہ داروں کی تنخواہیں دی جائیں اور حصہ داروں میں معقول
منافع تقسیم کیا جا سکے۔ مگر اب دوسرے تاجر کمپنی کی راہ میں روڑے اٹکانے لگے اور اس
کی کسی تدبیر کو جو ہندوستان کی بہبود کے لئے اختیار کی جاتی کامیاب نہ ہونے دیتے
تھے اور حکومت کو مجبور کر کے اپنے حسبِ منشا قوانین پاس کراتے تھے۔ بطور نمونہ
کے ایکٹ ۱۶ سنہ ۱۸۳۷ء کی دفعہ نقل کی جاتی ہے:

"شایان گمان مباد کہ بحکم قانون سرکار ہر ایک صاحب مکتب لازم و مناسب
است کہ ملازم متعینہ پوسٹ را اندرون مکتب خود در آمدن و برآمدن علاوہ
بر آں حکم شد کہ یک نفر و نیز برائے خدمت گزاری موصوف آمدن و برآمدن و جہت
ملازم موصوف و فرش و جائے نشست و برخاست و آب خوردنی و غیرہ بہ
آں ناگزیر است دریغ نکردہ بہم رسانیدہ بجائے پختن طعام ملازم آں بلا جہت
فرماید و ہر صاحب مکتب کہ مضامین دفعہ ہذا را بجا نخواہد آورد مستوجب
جرمانہ کہ زیادہ از پانصد روپیہ نہ بودہ باشد خواہد گردید"

دنیا بھر کے قوانین اس اصول پر مبنی ہوتے ہیں کہ ارتکابِ فعل پر مجرم کو سزا دی
جائے مگر اس دفعہ کی رو سے عدمِ ارتکابِ فعل پر سزا دی جاتی ہے یعنی یہ کہ انگریز تاجر
تجارت کرنے کا پرمٹ لے کر مختلف مقامات میں تجارتی اغراض کے
لئے جائیں تو جس شخص کے گھر میں وہ چاہیں جا کر ٹھہر جائیں اور اس شخص کا یہ فرض ہو
گا کہ صاحب کی خدمت گزاری کے لئے ایک آدمی مقرر کرے۔ صاحب اور ملازم کے
نوکر کو نشست و برخاست کی، کھانا پکانے کی جگہ دے، پانی اور دیگر سامان فراہم
کرے۔ اگر اس میں کوتاہی کرے گا تو اس پر پانسو روپے تک جرمانہ ہوگا۔

ملازمتوں کے قانون کا ناتمام نفاذ ہندوستانیوں کو دوسری بڑی شکایت یہ تھی کہ انہیں بڑی ملازمتوں سے قطعاً خارج رکھا گیا تھا۔ اس کے لئے پارلیمنٹ نے ۱۸۳۳ء کے قانون میں ایک دفعہ کے ذریعہ اہلِ ہند کے لئے اعلیٰ ملازمتوں کا دروازہ کھول دیا۔ اس دفعہ کے الفاظ یہ ہیں:

"رعایا میں سے کسی شخص کے لئے جو ہندوستان میں سکونت پذیر ہو کمپنی کا کوئی عہدہ یا کوئی خدمت اور کوئی ملازمت محض مذہب، جائے ولادت، نسل یا رنگ کی بنا پر ممنوع نہ ہوگی۔"

پارلیمنٹ کے اس ہمت افزا قانون سے اہلِ ہند کے دلوں میں بہت امیدیں پیدا ہو گئیں، مگر قانون کے تحت میں قواعد بنانا اور اس پر عملدرآمد کرنا حکام کمپنی کے ہاتھوں میں تھا۔ چنانچہ سر ولیم بینٹنگ وائسرائے کے زمانہ میں اہلِ ہند کو جو بڑے سے بڑے عہدے عطا کئے گئے وہ قواعد کی رو سے صدر امینی اور ڈپٹی کلکٹری تھے۔ اسی عہد میں انگریزی کے اجرا کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ جس کی تفصیل باب چہارم کی فصل سوم میں دی گئی ہے۔

سلطنت میں مزید توسیع یوں تو سلطنت میں توسیع کا سلسلہ کمپنی کی تجارت کے زمانہ ہی سے جاری تھا، مگر اب تجارت کا مشغلہ باقی نہ رہنے سے کمپنی کی پوری توجہ توسیع سلطنت کی طرف ہو گئی۔ سندھ بغیر کسی وجہ کے انگریزی میں ملا لیا گیا۔ افغانستان میں فوجیں رکھنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ لارڈ ڈلہوزی وائسرائے کے زمانہ میں برما کا بچا کھچا حصہ، پنجاب، اودھ اور دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستیں براہ راست کمپنی کی حکومت میں آگئیں۔ انگریزوں کی خوش نصیبی سے پنجاب کا صوبہ سر ہنری لارنس چیف کمشنر کے زیر حکومت تھا۔ ان کے شریفانہ برتاؤ نے سکھوں کو جن سے سر ہنری موصوف نے یہ صوبہ ۱۸۴۹ء میں لیا تھا

موہ لیا۔ اور اس طرح سکھوں کو اپنی سلطنت کا وفادار بنا لیا مگر اس زمانہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کرنا ایک جرم تھا۔ اس لئے لارڈ ڈلہوزی نے سرہنری سے ناراض ہو کر انہیں راجپوتانہ کو تبدیل کر دیا۔ باقی ماندہ جدید مقبوضات میں ہر طرف ظلم و ناانصافی کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان میں ہمیشہ سے متبنّیٰ لڑکا مثل اصل بیٹے کے سمجھا جاتا تھا۔ مگر کمپنی نے رئیسوں کو اس حق سے محروم کر کے کوئی پندرہ ریاستیں اپنے قبضہ میں کر لیں۔ جس سے عام ناراضی پھیل گئی۔ اس ناراضی کی آمیزش صوبہ اودھ کے الحاق نے جو صدہا برس سے وفادار رہا تھا پوری طرح کر دی۔ یہ دولت سے زیادہ ملک جس کی مالگذاری ایک کروڑ تیس لاکھ تھی۔ لارڈ ویلزلی پہلے ہی فوج کے خرچہ کے لئے لے چکے تھے اور نواب کے پاس صرف ایک کروڑ کی آمدنی کا علاقہ رہ گیا تھا۔ اس پر بھی اودھ کی دولت پر کمپنی بہادر کی للچائی ہوئی نظریں پڑتی رہتی تھیں۔ کمپنی نواب سے بڑی بڑی رقمیں قرض لیتی رہتی تھی۔ ان میں سے ایک رقم ایک کروڑ روپیہ کی تھی۔ دوسری رقم جو غازی الدین حیدر کے زمانہ میں لی گئی پچاس لاکھ کی تھی۔ ان رقوم پر پانچ فی صدی سود مقرر کیا گیا تھا جو اس شرح کا آدھا بھی نہ تھا جس پر انگریزوں نے کرناٹک کے نواب کو قرضے دیئے تھے پھر اس سود میں سے نواب اودھ کو کچھ نہ دیا جاتا تھا بلکہ نواب کے وابستگان دولت کے وثیقوں کے لئے وقف تھا۔ اصل رقم کبھی ادا ہونے کی صورت ہی نہ تھی بلکہ تمام قرضہ ایک معاہدہ کے ذریعہ دوامی قرار دے دیا گیا[1]۔ ان حالات میں آئے دن فسادات رہتے تھے۔ اور ملک ویران ہوتا جاتا تھا۔ بالآخر ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو صوبہ اودھ کے الحاق کا حکم نواب واجد علی شاہ کو سنایا گیا۔ جس میں ان کی وفاداری تسلیم کی گئی اور صرف بدنظمی کے الزام میں انہیں معزول کیا گیا۔ در آں حالیکہ بدنظمی نتیجہ تھی۔ خود کمپنی کے طرز عمل

---

[1] تاریخ اودھ جلد سوم، مولوی نجم الغنی ص ۴۵

کا برتاؤ کیا گیا اور نئی ٹف روک دیئے جانے سے اُن کا حال تباہ ہو گیا۔ سابق ملازموں اور با اثر لوگوں کو خاص طور پر ملازمتوں اور عہدوں سے محروم کیا گیا۔ جن کے وہ متوقع تھے۔[1]

فوجی سپاہیوں کی ناراضی کی وجہ یہ ہوئی کہ جدید بھرتی کا ایک قانون جاری بنا گیا۔ جس میں علاوہ دوسری سختیوں کے ایک یہ بھی تھی کہ وہ ہندوستان سے باہر بھیجے جانے پر مجبور ہوں گے حالانکہ اس سے قبل ہندو سپاہی مذہب کی بنا پر باہر جانے سے بار با عذر کر چکے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں انگریزوں کو ہندوستانیوں کے محسوسات اور جذبات کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ چنانچہ لارڈ ڈلہوزی وائسرائے کی نسبت ایک قابل مصنف اور فوجی افسر نے لکھا ہے:۔

"وہ ہندوستانیوں کے عقائد اور محسوسات، عادات اور روایات کا کوئی لحاظ نہ کرتے تھے۔"[2]

نہ صرف وائسرائے بلکہ عام طور پر کمپنی کے انگریز عہدہ دار ہندوستانیوں کے ساتھ دلخراش برتاؤ کرتے تھے جس کی تصدیق سر ولیم چیف کمشنر سرحدی ندیں کے اس قول سے ہوتی ہے:۔

"ہم اپنا حساب انگلستان کی حکومت سے لگاتے ہیں اور تمام تجربوں کے خلاف یہ امید کرتے ہیں کہ ہندوستان کی بے شمار مخلوق میں سے جو لوگ اولوالعزم اور حوصلہ مند ہیں وہ ہمارے سیاسی معیار کو پسند کریں۔ اور اس بات کو بھی اچھا سمجھیں کہ باوجود ہماری مشہور بزدلیوں کے

---

[1] فوجی بغاوت از لفٹنٹ جنرل میک لوڈ اینس ص ۳

[2] ایضاً ص ۱۰

تمام حکومت اور تمام بڑی تنخواہوں کے عہدے صرف ہمارے لئے مخصوص رہیں میرے ان خیالات نے جو پندرہ سال سے علی الاعلان ظاہر کر رہا ہوں مجھے نقصان پہنچایا ہے۔ مگر مجھے اُن کے صحیح ہونے کا کامل یقین ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب تک ہم بالعموم دیسیوں اور بالخصوص دیسی سپاہیوں کے محسوسات اور اُمنگوں، اُن کی قابلیتوں اور کمزوریوں کو اپنے محسوسات اور اُمنگوں کی برابر اہمیت نہ دیں گے ہم کبھی محفوظ نہ ہوں گے[1]

مگر نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ بیچارے سر منری کے احتجاجات کی کون پروا کر سکتا تھا۔ جب کہ بقول لفٹنٹ جنرل میکلوڈ اینس اس زمانہ کے اہلِ حکومت کا اصلی مقصد محض دولت پیدا کرنا تھا۔[2]

اس طرزِ عمل کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا وہ بالآخر ہوا اور ہندوستان کی قدیم روایات کے خلاف اس بار رعایا میں ناراضی کی ایسی زبردست آگ بھڑک اُٹھی کہ اس کے بجھانے میں کمپنی کے پورے اٹھارہ مہینے صرف ہوئے اس کا مختصر حال ذیل کی سطور میں درج کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کا ۱۹۰۵ء — جیسا کہ سطور بالا میں لکھا گیا ہے انگریز افسروں کی سخت گیری سے ملک میں عام ناراضی پھیل گئی تھی۔ میلکم لوئین جج عدالت عالیہ مدراس و ممبر کونسل نے اپنے ایک رسالہ میں لندن سے لکھا تھا:

"ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ ان کے قانونِ وراثت

---

[1] ہندوستان کی بغاوت ۱۹۵۰ء، پاکستان پبلشرز ... ص ۱۸

[2] ... بغاوت، ص ۴

کو منسوخ کیا۔ بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا۔ مذہبی رسم و رواج کی
توہین کی، عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کریں، سرکاری کاغذات میں
نہیں کافر لکھا، امراء کی ریاستیں ضبط کریں، لوٹ کھسوٹ سے ملک کو
تباہ کیا۔ انہیں تکلیف دے کر مالگذاری وصول کی، سب سے اونچے خاندانوں
کو برباد کر کے انہیں گردش دینے والے بندوبست قائم کئے۔

مختصر یہ کہ ان واقعات نے تمام اہل ملک کو ناراض اور پریشان کر دیا اور انہیں
ہنگامہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس ہنگامہ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ کلکتہ میں فوج کے
لئے جو کارتوس بنائے گئے ان میں بقول بعض افسران فوج، ٹھیکیداروں نے گائے کی
چربی استعمال کی ورنہ سور کی چربی استعمال نہ کی تھی۔ جنوری ۱۸۵۷ء میں کلکتہ کے
فوجی کارخانہ کے ایک چھوٹی ذات کے آدمی نے ایک برہمن سپاہی سے پانی کا لوٹا
مانگا۔ سپاہی کے انکار کرنے پر اس نے طعنہ دیا کہ اس وقت تم لوگوں کا دھرم کہاں
رہ جائے گا جب تمہیں سور اور گائے کی چربی کے کارتوس استعمال کرنا پڑیں گے۔
اس خبر سے کلکتہ کی فوج میں اشتعال ہوا تو افسروں نے اسے دبا دیا۔ البتہ یہ خبر پھیل کر
بارک پور میں پہنچی تو وہاں کی فوج نے افسروں کی عدول حکمی کی جس پر وہاں کی دو رجمنٹیں
نمبر ۱۹ اور ۳۴ ماہ اپریل ختم ہونے سے قبل توڑ دی گئیں اور سپاہیوں کو برخاست کر
دیا گیا۔ اسی قسم کا واقعہ مارچ میں انبالہ میں ہوا مگر تب بھی فوجی افسروں نے مرض کا
صحیح علاج نہ کیا اور بجائے ان کارتوسوں کا استعمال بند کر دینے کے تمام
رجمنٹ میں سپاہیوں کو برخاست کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ لکھنؤ میں
متعینہ رجمنٹ نے نئے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کیا تو اس رجمنٹ کو توڑ دیا
اور اپنے نزدیک سمجھ لیا کہ معاملہ ختم ہو گیا۔ اسی طرح میرٹھ میں ۲۳ اپریل کو جب
یہی واقعہ پیش آیا تو پچاسی سپاہیوں کا جن میں دیسی افسر بھی شامل تھے کورٹ مارشل

رُکنے کے بجائے برخاست کرنے کے ایک قدم اور آگے بڑھ کر انہیں دس دس سال
کی سزائے قید دے دی مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ چنانچہ ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو
جبکہ یہ حکم پریڈ پر سنایا گیا اور سپاہیوں کو حوالات میں بھیجدیا گیا تو شہر میں اس کا
بڑا چرچا ہوا اور بازار میں لوگوں نے سپاہیوں پر فقرے کسنے شروع کئے۔ بالآخر
۱۰ مئی کو ہندوستانی فوج نے چند انگریز افسروں کو مار کر حوالات توڑ دی اور قیدی
سپاہیوں کو رہا کر کے سیدھے دہلی چل دیئے۔ جو میرٹھ سے چالیس میل ہے۔ دہلی
پہنچنے پر وہاں کی فوج ان سپاہیوں کے ساتھ ہو گئی۔ اور دوسرے دن یعنی ۱۱ مئی
کو یہ لوگ زبردستی قلعہ میں گھس گئے اور بہادر شاہ کو سردار بننے پر مجبور کیا۔ اسی قسم
کی کوشش بارک پور کے سپاہیوں نے نواب مرشد آباد کو اپنا سردار بنانے کے لئے
کی تھی مگر وہ راضی نہ ہوئے۔ دہلی میں سپاہیوں کے زور اور عام ناراضگی کی وجہ سے
رائے عامہ کا غلبہ تھا اس لئے بہادر شاہ کے لئے کوئی چارہ کار نہ رہا تھا اس لئے
وہ باغیوں کے ساتھ ہو گئے۔ دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہونا تھا کہ یہ خبر تمام ملک
میں پھیل گئی اور ہر طرف ہنگامے ہونے لگے۔ فیروزپور پنجاب میں سپاہیوں نے
بغاوت کی مگر فی الجملہ پنجاب محفوظ رہا اودھ، روہیل کھنڈ وغیرہ انگریزوں کے
ہاتھوں سے نکل گئے۔ یہی حالت بندیل کھنڈ، باندہ، جھانسی اور کالپی کی ہوئی۔ نیز
چھوٹا ناگپور اور بہار میں بدامنی ہو گئی۔

یہ جھگڑے زیادہ تر سپاہیوں اور عوام الناس کے تھے اور بڑے لوگ اُن
میں زیادہ تر شریک نہ تھے۔ جن لوگوں نے بلوہ میں نمایاں حصہ لیا اُن
کے نام یہ ہیں:

۱۔ دھوندو پنت، مہاراجہ بٹھور عرف نانا صاحب، مرہٹہ یہ انگریزوں
سے بہت ملتے تھے اور ان کی دعوتیں کرتے تھے تاہم لارڈ ڈلہوزی نے

ان کی آٹھ لاکھ کی سالانہ پنشن بند کر دی۔ انہوں نے اپنے ملازم عظیم اللہ خاں
کو اپیل کے لئے انگلستان بھیجا جو ناکام آئے۔ بالآخر انہوں نے مجبور ہو کر
ملک میں شورش کی اور ہنگامہ شروع ہونے پر اس میں شرکت کی کانپور پر قبضہ
کر لیا اور سبز جھنڈا لہرا کر "بہادر شاہ" کے نام کی ایک سو ایک توپوں کی سلامی اتاری
مگر ہنگامہ کے عروج میں بھی انگریز عورتوں اور بچوں کو آرام اور احترام اور عزت
کے ساتھ رکھا۔ اس واقعہ کی تصدیق مسٹر لیاڈ ممبر پارلیمنٹ نے کی ہے اور جو
الزام اُن پر انگریزوں کو بے رحمی سے قتل کرنے کی نسبت لگائے گئے تھے
اُن کی تردید یک کمیشن نے بھی کی۔

۲۔ تانتیا ٹوپی۔ نے کالپی میں جنگ آزادی میں حصہ لیا اور کانپور میں بطور سپہ سالار
نانا صاحب کام کیا۔

۳۔ رانی جھانسی۔ کے شوہر راجہ گنگا دھر راؤ کے انتقال پر وائسرائے نے اُن کے
متبنیٰ کو تسلیم نہ کر کے ریاست کا الحاق کر لیا۔ سات لاکھ کے جواہرات اور
نقد داخل خزانہ کرا لئے تھے اور صرف پانچ ہزار روپیہ ماہوار پنشن منظور کی تھی
جس کے لینے سے رانی صاحبہ نے انکار کر دیا تھا۔ ہنگامہ ہونے پر انہوں نے
کمپنی کی فوج پر قبضہ کر کے شہنشاہ دہلی کا پرچم لہرایا اور انگریزوں سے بہادری
کے ساتھ لڑیں۔

۴۔ جنرل بخت خاں۔ سپہ سالار، خان بہادر خان روہیلہ چودہ ہزار سپاہ لے کر دہلی پہنچے
بادشاہ نے انہیں دہلی کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اس فوج کی تین ماہ کی تنخواہ خود بخت خاں
نے پہلے دے دی تھی اور چار لاکھ روپیہ بادشاہ کو نذر نے پیش دیا تھا۔ بخت خاں
آخر تک بہت بہادری سے لڑے۔

جنرل بخت خاں کے مفصل حالات کے لئے مقدمہ سید حسین [illegible] سید [illegible] علی

۵۔ "شہزادہ فیروز شاہ"، جو شاہی خاندان دہلی سے تھے وہ بھی ہنگامہ کے آخر تک روہیل کھنڈ میں لڑتے رہے۔

۶۔ "خان بہادر خان"، نواب روہیل کھنڈ کے آخری وارث تھے اور سب ججی کے عہدہ پر مامور تھے جب کہ انہوں نے روہیل کھنڈ پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے اعلان میں اس بات پر زور دیا تھا کہ انگریز ہمیشہ وعدہ خلافی کرتے اور جائدادوں کی ضبطی کرتے اور ہندو مسلمانوں کو لڑاتے رہتے ہیں۔ اب دونوں کو مل کر ان کے خلاف لڑنا چاہیئے۔

۷۔ "حضرت محل" بیگم واجد علی نے اپنے لڑکے برجیس قدر کو تخت نشین کر کے جنگ شروع کی۔ وہ خود بھی ایک بار گھوڑے پر نکلیں اور دس ماہ کے قریب انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے میموں اور انگریز بچوں کو پناہ دی اور آرام سے رکھا۔

۸۔ "مولوی احمد اللہ شاہ" فیض آباد کے مشہور عالم تھے۔ جس طرح ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی جائدادوں کی ضبطی کا عام بازار گرم ہوا تھا اس سے مولانا بھی نہ بچ سکے۔ اور ان کی جائیداد گورنمنٹ نے ضبط کر لی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ شروع ۱۸۵۷ء میں حکومت کے خلاف کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کی تقریروں میں ہزاروں آدمی ہندو اور مسلمان جمع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ آگرہ کی تقریر میں دس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ ان کی ہر دلعزیزی کی یہ حالت تھی کہ پولیس نے انہیں گرفتار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حکومت نے انہیں فیض آباد جیل میں قید کر کے پھانسی کا حکم دے دیا تھا۔ اس پر فوج کے سپاہیوں اور عوام الناس نے جیل توڑ کر انہیں رہا کر لیا اور وہ فیض آباد کی چھاؤنی پر قابض ہو گئے۔ مگر انہوں نے

(بقیہ نمبر صفحہ گذشتہ) مضمون رسالہ "مصنف" بابت جون ۱۹۴۶ء قابل ملاحظہ ہے۔

انکو نزدا ، کے ساتھ رفاقت کی کہ انہیں کشتیوں میں سوار کرا کے اور سامان رسد اور کچھ نقد روپیہ دے کر روانہ کر دیا۔ اور اُن کے حکم سے کوئی انگریز فیض آباد میں نہیں مارا گیا۔ بیگم حضرت محل نے انہیں لکھنؤ کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ جہاں وہ دس ماہ کے قریب لڑے۔ بالآخر لکھنؤ پر کمپنی کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہیں کہنڈ تک برابر لڑتے چلے گئے اور راجہ پوان پوریا پوایاں کے مکان پر جب کہ وہ راجہ سے باتیں کر رہے تھے دھوکے سے مارے گئے۔ ان کی قبر موضع جہانگیر متصل شاہجہاں پور میں ہے اور ان کے قاتل راجہ جگن ناتھ سنگھ کو پچاس ہزار روپیہ انعام میں ملا۔ مولوی صاحب مرحوم کی بابت انصاف پسند مالیسن نے لکھا ہے:

"یہ مولوی ایک بہت بڑا تجربہ کار شخص تھا۔ کوئی شخص فخر کے ساتھ نہ کہہ سکتا تھا کہ میں نے دو بار سر کالن کیمپل (کمانڈر انچیف ہند) کو میدان میں زک دی۔ مولوی احمد شاہ سچا محب وطن تھا۔ اس نے کسی نہتے کا خون بہا کر اپنی تلوار کو خراب نہ کیا تھا۔ اس نے بہادری کے ساتھ ڈٹ کر کھلے میدان میں ان بدیشیوں کے ساتھ جنگ کی جنہوں نے اس کا وطن چھین لیا تھا۔ ہر ملک کے بہادر اور سچے لوگوں کو مولوی احمد شاہ کو عزت کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے۔"

بعد میں مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی کی ایک تصنیف سے معلوم ہوا کہ مولوی احمد شاہ شہر چینا پٹن صوبہ مدراس کے ایک شہزادے اور ابوالحسن عرف تاناشاہ کے پرپوتے تھے۔ وہاں وہ دلاور جنگ نواب احمد علی شاہ کہلاتے تھے۔ آپ نے نظام دکن کی حمایت میں مرہٹوں سے لڑ کر انہیں شکست دی۔ اس صلہ میں آپ کو ریاست کی طرف سے ایک بڑا عہدہ ملتا تھا مگر آپ نے قبول نہیں کیا۔

اور جہاد کی غرض سے شمالی ہند کا رُخ کیا۔ جے پور میں میر قربان علی سے بیعت کی آگرہ
میں آپ سے ہزارہا آدمیوں نے بیعت کی۔ ہنوبات ٹیکری صوبہ اودھ میں امیر علی شاہ
کی شہادت کی خبر سُن کر آپ اُن کا بدلہ لینے لکھنؤ اور فیض آباد گئے۔ فیض آباد جیل میں
قید کر لئے گئے۔ آپ کی مفصل سوانح عمری مفتی انتظام اللہ صاحب موصوف مرتب
کر رہے ہیں۔

۹۔ "راجہ کنور سنگھ" جگدیش پور صوبہ بہار کے راجہ تھے ان کی ریاست انگریزوں نے
ضبط کر لی تھی۔ ہنگامہ شروع ہونے پر جب اُن کی عمر اسّی سال کی تھی انہوں نے انقلابی فوج
کا سردار بن کر آرہ کے خزانہ پر قبضہ کیا اور انگریزی فوج کو اتنی مسلسل شکستیں دیں کہ لارڈ
کیننگ گھبرا گئے۔ جب بنارس میں لارڈ مارک کی فوج سے مقابلہ ہوا تو راجہ صاحب بجلی
کی طرح اِدھر سے اُدھر کوندتے پھرتے تھے۔ بلیا کے قریب گنگا پار کرتے ہوئے
اُن کے داہنے ہاتھ میں گولی لگی تو بائیں ہاتھ سے اُسے اپنی تلوار سے کاٹ کر پٹی باندھ
لی تاکہ زہر نہ پھیلے اور آخر ماہ کی جنگ کے بعد اس ضعیف العمر سپاہی نے اپنی راجدھانی
پر قبضہ حاصل کر لیا۔ مگر زخم کی تکلیف سے بالآخر انتقال کیا۔

انگریزوں کے مظالم

ہندو مسلمانوں کی مشترک سیاسی جنگ، اُن کی بہادری اور اسی کی ساتھ رحمدلی کے یہ تھوڑے سے واقعات پیش کئے
گئے ہیں۔ اس کے بعد خود ہندوستانی سپاہیوں یعنی پنجابیوں، سکھوں، گورکھوں اور
رئیسوں کی مدد سے جب انگریزوں کو کامیابی ہوئی تو انہوں نے جس قسم کے مظالم ڈھائے
وہ ناقابل بیان ہیں۔ ان مظالم کی شدت کو خود انگریز مورخوں نے تسلیم کیا ہے چنانچہ
آرنلڈ نے کہا ہے:

"بوڑھے آدمیوں نے ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچایا تھا اُن سے اور
بیکس عورتوں سے جن کی گود میں دودھ پیتے بچے تھے ہم نے اسی طرح

بدلہ لیا۔ جس طرح بڑے بڑے باغیوں سے یہ
مورخ کیئی تسلیم کرتا ہے کہ:
"ایک مقام میں چھ ہزار ہندوستانیوں کا قتلِ عام کیا گیا۔ تنہا الٰہ آباد
کے علاقہ میں نیل نے اتنے ہندوستانیوں کو مروا ڈالا جتنے انگریز مرد و عورت
اور بچے بوڑھے ہندوستان بھر میں ۱۸۵۷ء کے سارے ہنگامہ میں
انقلابیوں کے ہاتھ سے انقلاب کی وجہ سے نہیں مرے"
ایک انگریز افسر نے لکھا ہے کہ:
"انبالہ سے دلی تک ہزاروں بے قصور دیہاتیوں کو
انگریزوں نے مار ڈالا ان کے بدنوں کو سنگینوں سے چھیدا
جاتا تھا اور ہندوؤں کے منہ میں گائے کا گوشت ٹھونسا جاتا تھا"
ٹامسن نے لکھا ہے کہ:
"دہلی کے کچھ مسلمانوں کو ننگا کر کے اور زمین سے باندھ کر سر سے
پاؤں تک جلتے ہوئے تانبے کے ٹکڑوں سے اچھی طرح داغ دیا جاتا۔
اور مسلمانوں کو سؤر کی کھالوں سے سی دیا جاتا ہے"
دہلی میں تمام لوگوں کے مکانوں کو لوٹ کر انہیں شہر سے نکال دیا گیا۔ خواجہ حسن[1]
نظامی نے لکھا ہے کہ:
"ہزاروں عورتیں فوج کے خوف سے کنوؤں میں گر پڑیں یہاں تک
کہ پانی سے اوپر ہو گئیں۔ جب زندہ عورتوں کو کنوئیں سے نکالنا چاہا
تو انہوں نے کہا ہمیں گولی سے مار دو نکالو نہیں ہم شریفوں کی بہو بیٹیاں

---

[1] "بہادر شاہ کا مقدمہ" از خواجہ حسن نظامی صاحب۔ دفتر اخبار منادی، دہلی۔

میں ہماری عزت خراب نہ کرو۔ بعض لوگوں نے اپنی عورتوں کو قتل کر کے خودکشی کر لی۔"

انگریزوں نے کان پور کے قتل کو بہت اُچھالا ہے مگر وہاں صرف اتنا ہوا کہ جب الہ آباد کے قتل عام سے بچے ہوئے مظلوم ہندوستانی بھاگ کر کان پور آئے تو لوگوں نے مشتعل ہو کر انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ اس وقت نانا صاحب نے ایک سو پچیس میموں اور بچوں کو بچا کر بڑی عزت اور آرام کے ساتھ رکھا جس کی بابت جسٹس میک کارتی نے لکھا ہے:

"نانا صاحب نے سپاہیوں کو سزا دی اور عورتوں کو چھوڑ دیا۔

عورتوں کو چپاتی گوشت دیا جاتا تھا۔ اُن سے کوئی مشقت کا کام نہ لیا جاتا تھا۔ بچوں کو دودھ ملتا تھا اور تین تین بار ہوا خوری کو بھیجا جاتا تھا۔"

سر ولیم میور (سابق لفٹنٹ گورنر صوبۂ متحدہ) نے لکھا:

"انگریز عورتوں کی آبروریزی کے قصے بالکل بے بنیاد ہیں۔ چنانچہ ایک برہمن بیچاری کو پھانسی دینے کی وجہ سے علی گڑھ میں فوج بگڑ گئی اور ان لوگوں نے انگریز افسروں سے کہا کہ سب مع بیوی بچوں کے چلے جاؤ وہ چلے گئے۔"

برخلاف کان پور کے پنجاب میں راوی کے کنارے مقام اجنالہ میں جو مظالم انگریزوں نے ہندوستانیوں پر کئے وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ بازپرس ہا گئے ہوئے آدمیوں کو اس طرح سے ہلاک کیا گیا بقول فریڈرک کوپر:

"۶۶ آدمیوں کو ایک گنبد کے اندر رات کو بند کیا گیا۔ جن میں سے ۴۵ اندر مر گئے۔ بغیر ارادے ہی کے بلیک ہول کی داستان دہرائی گئی

۲۹۲ لاشوں کو ایک پرانے کنوئیں میں ڈال کر پاٹ دیا گیا۔ ایک کنوں
کانپور میں ہے تو دوسرا اجنالہ میں بھی ہے۔"

الغرض ہندوستانیوں کو اس قدر زیادہ برباد کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ کمپنی کی حکومت ہٹا کر ہندوستانی بھی ایک حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہونے کے اسباب بہت سے بیان کئے گئے ہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو اصلی سبب یہ تھا کہ امراء اور والیانِ ملک غلطی سے یہ سمجھے کہ شکستِ زمانہ سابق کے بڑھتی طاقت کا ساتھ دینے میں وہ محفوظ رہیں گے اور اُن کی عزت بدستور قائم رہے گی۔ حالانکہ زمانہ نے بتا دیا کہ یہ سامراجی اور غیر ملکی حکومت پچھلی حکومتوں سے بالکل مختلف تھی جس نے ملک کو نچوڑنے اور عزت دار کو بے عزت کرنے میں کوئی امتیاز نہیں کیا بلکہ والیانِ ملک پر تو اس قدر زیادہ بندشیں لگائیں کہ غریب عوام اندرونی آزادی کے اعتبار سے اُن کے لئے قابلِ رشک ہو گئے۔

بہرحال کمپنی کی حکومت ختم ہونے پر ہندوستان کی حکومت کی باگ راج برطانیہ اور پارلیمنٹ انگلستان کے ہاتھوں میں آگئی۔ جس قسم کی حکومت کمپنی کے صد سالہ عہد میں رہی اس کا پورا اندازہ سرسید احمد خاں کی کتاب "اسباب بغاوتِ ہند" سے ہوتا ہے جو حسب ذیل ہے۔

کمپنی کا دورِ حکومت بنیادی حقوق کی روشنی میں

مندرجہ بالا کتاب میں سرسید نے وثوق

سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ وہ ہنگامہ روس اور ایران کی سازش کا نتیجہ نہ تھا نہ دہلی کے معزول بادشاہ کے تعلقات ایران سے تھے۔ نہ اودھ کی ضبطی اس کی باعث تھی نہ غیر قوم کی حکومت اُٹھا دینے کے لئے کوئی سازش تھی، نہ شاہ دہلی

کی وحدت ملک میں تھی، نہ مسلمانوں کی کوئی سازش جہاد کے لئے تھی، نہ پہلے سے فوج میں بغاوت کا مشورہ تھا، نہ باغی فوج سے بادشاہ کی پہلے سے سازش تھی بلکہ رعایا کی حق تلفیوں کی وجہ سے عام ناراضی تھی۔ ان حق تلفیوں پر ہم موجودہ زمانے کے بنیادی حقوق کو نگاہ رکھ کر سرسید کے خیالات کی روشنی میں جو انہوں نے اپنی کتاب "اسباب بغاوت ہند" میں ظاہر کئے تھے نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

حق نمبر ۱ "روٹی کے مسئلہ" کے متعلق سرسید نے لکھا ہے کہ ہندوستان کی رعایا روز بروز مفلس ہوتی جاتی تھی۔ زمیندار اور کاشتکار مفلس ہو گئے تھے۔ اہل حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیاء تجارت ولایت کے بالکل جاتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں سوئی یا دیا سلائی بنانے والا نہ رہا تھا۔ پارچہ بافوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا اس لئے وہ سب سے زیادہ اس ہنگامہ میں گرمجوش تھے۔ اس پر کمپنی نے دراندیشی، نوٹ جاری کئے جس کے سود وصول کرنے کی تدبیر ملک سے ہوتی تھی۔ اس سے ملک مفلس اور محتاج ہو گیا۔ سرسید نے اس سلسلہ میں بڑے جوش سے لکھا ہے کہ:

"بڑا اصل سبب ناراضی رعایا کا گورنمنٹ سے یہ تھا لوگ تبدیلی عملداری دل سے چاہتے تھے اور نئی عملداری سے خوش تھے۔ میں سچ کہتا کہ اسی سبب سے تھے، ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم سچ کہتے ہیں کہ بہت سچ کہتے ہیں کہ جب افغانستان سرکار نے فتح کیا تو لوگوں کو بڑا غم ہوا سبب صرف یہ تھا کہ اب مذہب پر علانیہ دست اندازی ہو گی۔ جب گوالیار فتح ہوا، پنجاب فتح ہوا، اودھ لیا گیا تو لوگوں کو کمال رنج ہوا کہ ہندوستانیوں کو اس سے بہت آسودگی تھی۔ نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں۔ ہر قسم کی ہندوستانی

اشیاء کی بکثرت تجارت تھی ان کی عملداریوں کے خراب ہو جانے سے
زیادہ افلاس [illegible] ہوتی جاتی تھی۔[1]

حق نمبر ۲ - جان و مال کی حفاظت کے بارہ میں ہے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء تک چونکہ ہندوستانیوں سے ہتھیار نہیں چھینے گئے تھے غالباً سرسید نے اس وجہ سے اس بارہ میں کچھ نہیں لکھا۔

حق نمبر ۳ - عدل و انصاف کے متعلق ہے جس کی نسبت سرسید نے لکھا ہے کہ چند قوانین برخلاف رواج اور مخالف طبیعت و طینت ہندوستانیوں کے جاری ہوئے جس کی وجہ سے رعایا ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی اور سمجھتی تھی کہ ہم گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں اور کل ہیں تو پرسوں نہیں پھر اس پر اضافہ یہ ہوا کہ باوجود ہندوستانیوں کی مفلسی کے عدالت کی چارہ جوئی پر اسٹامپ لگا دیا گیا جو ناقابل برداشت ہے۔

حق نمبر ۴ - مذہبی حفاظت ہے جس میں مداخلت کے بارہ میں سرسید نے لکھا ہے:

"سب کو یقین تھا کہ سرکار ہندوستانیوں کو مفلس کر کے عیسائی بنا لے گی جس طرح ۱۸۳۷ء کے قحط میں یتیم لڑکوں کو عیسائی بنا لیا تھا۔ پادری گورنمنٹ سے تنخواہ پاتے تھے افسران متعہد اپنے ماتحتوں سے مذہبی باتیں کرتے تھے۔ اپنی کوٹھیوں پر بلوا کر پادریوں سے مذہب کی تلقین کراتے تھے۔ پادری لوگ پولیس کے کانسٹبلوں کو ساتھ لے کر مسلمانوں

---

[1] اسباب بغاوت ہند۔ ص ۲۰

کے واعظوں اور ہندوؤں کی کتھاؤں میں جاکر اعتراضات کرتے تھے اور
مذہبی پیشواؤں کی برائی اور ہتک کرتے تھے۔ جس سے لوگوں کو دلی
تکلیف پہنچتی تھی۔ اس طرح چند قوانین جاری کیے گئے جن سے مذہب
میں مداخلت ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ہندوستانی سپاہیوں کو چربی کے کارتوس
کاٹنے پر مجبور کیا جس سے ہنگامہ کی ابتدا ہوئی۔

حق نمبر ۵۔ تہذیب اور زبان کی حفاظت کے متعلق ہے۔ سرسید نے اس بارہ میں
لکھا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے زبان
کا مسئلہ اس وقت پیدا نہ ہوا تھا۔ اس لئے اس کے متعلق سرسید نے کچھ
نہیں لکھا۔

حق نمبر ۶۔ تعلیم سے ہے جس میں مداخلت کے متعلق سرسید نے فرمایا کہ:

"مشن اسکولوں میں لڑکوں کو انجیل پڑھا کر ان سے سوال کیا جاتا تھا کہ
تمہارا خدا کون ہے اور نجات دلانے والا کون ہے اور عیسائی مذہب
کے مطابق جواب دینے والے کو انعام دیا جاتا تھا۔ بچوں کو دیہاتی
مکاتب میں داخل ہونے کے لئے مجبور کیا جاتا تھا۔ جہاں تعلیم رعایا کی
ضروریات کے حسب حال نہ تھی۔ ڈپٹی انسپکٹر جب دورہ میں آتے
تھے تو لوگ انہیں کالا پادری کہتے تھے اور ان سے ڈرتے تھے۔"

حق نمبر ۷۔ ملازمت کے متعلق ہے۔ جس سے محرومی کے بارہ میں سرسید نے
فرمایا کہ:

"ایک طرف تو دیہاتی مکاتب اور کالج مشتبہ دوسری طرف چھوٹی
نوکریوں کے لئے بھی ڈپٹی انسپکٹروں یعنی کالے پادریوں کے سرٹیفکیٹ
منگائے جاتے تھے۔ اعلیٰ عہدے بالکل بند تھے اور افلاس کی یہ حالت تھی

کہ جب باغیوں نے لوگوں کو نوکر رکھنا شروع کیا تو بہت سے آدمی
صرف آنہ ڈیڑھ آنہ یومیہ پر نوکر ہو جاتے تھے اور بہت سے آدمی سیر
ڈیڑھ سیر اناج پر۔ نوکریوں سے محرومی کی شکایت خاص طور پر مسلمانوں کو
اس وجہ سے تھی کہ بقول سرسید کے مسلمان دوسرے ملکوں سے آئے
ہوئے تھے اور ان کے پاس بجز نوکری کے اور ذرائع معاش بہت کم تھے
اس ملک کے اصلی باشندے سب ملکی کاروبار میں مصروف تھے۔ برہمن
کو روزگار سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ بیس برن (ویش) بیوپار اور مہاجنی میں مصروف
تھے۔ چھتری، زمیندار اور کاشتکار تھے۔ اس طرح نوکریاں نہ رہنے کا اثر
مسلمانوں اور کایستھوں پر زیادہ تھا یا سرکاری نوکریوں کے علاوہ صوبہ داروں
سرداروں اور امیروں کے نوکر ہوتے تھے وہ بھی انگریزی گورنمنٹ کے زمانے
میں نہیں رہے تھے۔"

حق نمبر ۸۔ یکساں شہری حقوق و مساوات کے بارہ میں سرسید نے لکھا ہے:

"ہماری گورنمنٹ کو بلاشبہ عیسائیوں کے ساتھ ایک خاص محبت
دینداری کی رکھنی چاہیئے مگر ہم اپنی گورنمنٹ سے رعایائے ہند پر پدرانہ
محبت و الفت چاہتے ہیں جس کی نصیحت پطرس مقدس نے کی ہے
بے عزتی ایسی بد چیز ہے کہ اس سے دل پر زخم ہو جاتا ہے جو اچھا نہیں
ہوتا۔ گورنمنٹ نے ہندوستانیوں کو نہایت بے وقر کر دیا ہے صاحب
کا پیشکار صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں رہتا
جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔ اور
انگریز اور ہندوستانی مثل آگ اور سوکھی گھاس کے ہیں یا مثل پتھر کے دو
ٹکڑوں کے ہیں سفید اور کالے جن میں فاصلہ دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے

اور یوں تصور کیا جاتا ہے کہ گویا ہندوستان میں کوئی جنٹلمین نہیں ہے"

جس زمانہ میں سرسید نے یہ لکھا تھا ہندوستانیوں اور انگریزوں میں امتیاز کی بہت سی چیزیں تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ انگریزوں کے مقدمات ہندوستانی عدالتوں کے سامنے پیش نہ ہو سکتے تھے اور اسی زمانہ میں ہندوستانیوں سے ہتھیار لے لئے گئے تھے اور دیسی عیسائی اُن سے مستثنیٰ تھے۔ اس کے علاوہ آئے دن فوجی گوروں کے ہاتھوں سے ہندوستانی ذلیل ہوتے تھے یا مارے جاتے تھے اور یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا کہ مقتول کی تلی خراب تھی اس لئے وہ معمولی ضرب سے مر گیا۔ اس قسم کے واقعات اخبار میں آتے رہتے تھے۔

حق نمبر ۸۔ حقوقِ مالکیت میں آزادی کے بارہ میں ہے جس کی بابت سرسید نے لکھا ہے کہ:

"خراج آراضیات کی ضبطی کا قانون جاری کر دیا گیا۔ جس نے بقول ارڈ مزوا ورڈیوک آف ولنگٹن کے ہندوستانیوں کو محتاج کر دیا اور ان سے دشمنی پیدا کی۔ سب ہندوستانی کہتے تھے کہ سرکار نے خود تو ہماری پرورش کی نہیں بلکہ اگلے بادشاہوں کی دی ہوئی جاگیریں ہم سے چھین لیں۔ پھر سرکار نے خلاف دستور ہند کے مال گزاری کی علت میں زمینداریاں نیلام کرنی شروع کر دیں۔ پھر بندوبست میں اس قدر سختی کی کہ رعایا مفلس و برباد ہو گئی۔"

حق نمبر ۱۰۔ جو سب سے اہم تھا رعایا کا حکومت میں حصہ تھا اس پر سرسید نے سب سے زیادہ زور دیا ہے اور لکھا ہے کہ عہدہ داران کمپنی چونکہ رعایا سے علیحدہ رہتے تھے اس لئے انہیں کوئی ذریعہ ہندوستانیوں کی تکالیف معلوم کرنے کا نہ تھا۔ حکام کے ڈر سے کسی کو سچی بات علی الخصوص وہ کہ مخالف طبع دربار حاکموں کے ہوتی تھی کہنے کا مقدور نہ تھا۔ ہر شخص ملازم اور دربار کے

رئیس سب ڈر کے مارے خوشامد کی بات کہتے تھے۔

نئے قوانین کی مضرتیں حکام کو بتانے والا کوئی نہ تھا اور کوئی غمخوار رعایا کا نہ تھا بجز ان کے لہو کے جو جل جل کر ان کے بدن میں رہتا تھا اور بجز ان کی بیکسی کے جس پر وہ آپ رو رو کر چپ رہتے تھے اس کی وجہ سے مواد اندر اندر پکتا رہا اور بالآخر ہنگامہ کی شکل میں پھوٹ پڑا۔

سر سید احمد خاں کے نزدیک بغاوت کے جو اسباب تھے اُن کی تصدیق مسٹر ہنٹر کے قول سے ہوتی ہے جس کے لفاظ یہ ہیں:

"اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جاسکتی ہے تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بغاوت تھی۔"

کمپنی کے اس قدر حالات کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عہد میں مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی، اور تعلیمی حالت کیا تھی اُس کی بہتری کے لئے کیا کوشش کی گئی کمپنی کی طرف سے کس نوعیت کی تعلیم جاری کی گئی اور مسلمانوں نے اُس سے کہاں تک فائدہ اُٹھایا یہ امور آیندہ باب میں بیان کئے گئے ہیں۔

باب چہارم

معاشرت، مذہب اور تعلیم

فصل اوّل

اصلاحِ معاشرت و مذہب کا پہلا دور

مذہبی اصلاح کی نوعیت

انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں صوبہ متحدہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری بحیثیت ٹھیکہ دار قائم ہو چکی تھی۔ بادشاہ اور رئیسانِ ملک عیش پرست اور آرام طلب ہو گئے تھے۔ اور اُنہوں نے بہت سی مشرکانہ رسوم اختیار کر کے انہیں جزوِ مذہب بنا لیا تھا جنہیں اُس زمانہ کے علماء بدعت کہتے تھے۔ سلطنت جانے پر بجائے اس کے کہ وہ لوگ قوم کی نوحہ خوانی میں اپنا وقت ضائع کرتے اُنہوں نے حقیقی اسلام کو اپنے سامنے رکھ کر مسلمانوں کی سوسائٹی کا جائزہ لیا اور اُسے قابلِ اصلاح قرار دیا۔ درآں حالیکہ اس زمانہ میں باعتبار صداقت اور اخلاقی خوبیوں کے مسلمان اپنے برادرانِ وطن سے پیچھے نہ تھے۔ اس کا اندازہ راجہ موہن رائے کے اس بیان سے ہوتا ہے جو انہوں نے پارلیمنٹری کمیٹی

اس مضمون کے متعلق یہ کتاب قابلِ ملاحظہ ہے: علماءِ ہند کا شاندار ماضی از مولوی محمد میاں، کتب خانہ فخریہ شاہی مرادآباد۔

کے سامنے انگلستان میں دیا تھا وہ یہ ہے:

"سوال" ہندوستان اور مسلمان وکیلوں کے قانونی طرزِ عمل اور چلن کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟

جواب مسلمان وکیلوں میں سب مجھے کچھ ایمان دار آدمی ملے ہیں۔ ہندو وکلاء کی عام طور پر شہرت اچھی نہیں ہے اور لوگوں کو اُن پر اعتبار نہیں ہے[۱]"

مندرجہ بالا جواب سے ایک تو اس زمانہ کے ہندوؤں کی کامل بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے دوسرے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کی اخلاقی حالت دیگر اقوام سے گری ہوئی نہ تھی تاہم علماء اسے قابلِ اصلاح سمجھتے تھے۔

مولوی شریعت اللہ کی تبلیغ مذہبی اصلاح کا کام اُنیسویں صدی میں سب سے اوّل مولوی شریعت اللہ نے بنگال میں شروع کیا۔

مولوی صاحب۔ بہادر پور ضلع فرید پور کے رہنے والے تھے اور اٹھارہ سال کی عمر میں حج کے لئے روانہ ہو کر وہاں بیس سال رہے اور شیخ طاہر السنبل المکی سے جو شافعیوں کے پیشوا تھے استفادہ کیا۔ ۱۸۰۲ء میں ہندوستان واپس آکر مذہبی تبلیغ کا کام شروع کیا اور ۱۸۰۴ء میں "فرائضی" کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ وہ پیر اور مرید کی جگہ استاد اور شاگرد کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ اُن کے بیٹے "دودھو میاں" اُن کے خلیفہ اور جانشین ہوئے جنہوں نے بہادر پور کو صدر مقام قرار دے کر بالخصوص کاشتکاروں میں تبلیغ کی اُن کا منشاء مذہبی تبلیغ کے علاوہ غرباء میں باہمی ہمدردی پیدا کرنا اور انہیں زمینداروں کی دستبرد سے بچانا تھا[۲]۔

---

[۱] سوانح راجہ رام موہن رائے از نیٹس ص ۲۱۰

[۲] "مذاہب ہند کی تحقیقات" از پادری ٹائیٹس (انگریزی) ص ۱۷۹۔ ۱۸۰

سید احمد صاحب بریلوی کے ابتدائی حالات

مولوی شریعت اللہ کے بعد حضرت سید احمد بریلوی کی اصلاحی تحریک

شمالی ہند سے شروع ہو کر تمام ہندوستان میں پھیلی۔ یہ تحریک انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ میں جاری ہوئی اور حسنِ اتفاق سے اسی صدی کے آخر میں ان کے ہم نام سر سید احمد خان دہلوی نے مسلمانوں کی معاشرت و مذہب کی اصلاح اور تعلیم کی اشاعت کا کام وسیع پیمانے پر کیا۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوّل سید احمد صاحب بریلوی کے کچھ ذاتی حالات بیان کئے جائیں۔ موصوف ۱۷۹۶ء میں رائے بریلی صوبہ اودھ میں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر آپ تحصیل علم کے لئے شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں دہلی میں حاضر ہوئے مشہور ہے کہ اس زمانہ میں "السلام علیکم" کہنے کا رواج نہ رہا تھا یہاں تک کہ شاہ صاحب کے خاندان میں سلام کرنے کا طریقہ اس طرح تھا کہ جو شخص سلام کرتا وہ اپنا نام لے کر کہتا کہ (فلاں شخص) تسلیمات عرض کرتا ہے مگر سید صاحب جب شاہ صاحب کے یہاں پہلی بار گئے تو عام رواج کے خلاف انہوں نے السلام علیکم کہا۔ اس پر شاہ عبدالعزیز صاحب بہت مسرور ہوئے اور حکم دیا کہ آیندہ اسی مسنون طریقہ پر سلام کیا جایا کرے۔ سید صاحب بہت ذہین نہ تھے اور ان کی علمی ترقی کی رفتار بہت تیز نہ تھی مگر ان میں روحانیت بڑھی ہوئی تھی اس لئے درس چھوڑ کر انہیں طریقت کی تعلیم دی گئی۔ طریقت کی تکمیل کر کے جب آپ وہاں سے نکلے تو بڑے بڑے علماء و فضلاء آپ سے بیعت کرتے تھے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید برادر زادہ شاہ عبدالعزیز صاحب جو آپ سے آٹھ سال بڑے تھے۔ اور مولوی عبدالحی صاحب

---

[1] مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہید" مؤلفہ مولوی سید ابوالحسن علی ندوی ملنے کا پتہ مکتبہ نمبر ۲ گوئن روڈ لکھنؤ۔

نوشیں شاہ صاحب موصوف آپ کے پہلے خلیفہ ہوئے اور اُنہوں نے سب سے اوّل سید صاحب سے حضوریٔ قلب کے ساتھ نماز پڑھنے کی تعلیم حاصل کی۔

سیّد احمد صاحب بریلوی کا مذہبی مسلک ہمہ گیر تھا۔ یوں کہنے کو تو آپ کے مخالف آپ کی جماعت کو وہابی کہتے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ جماعت:

"دو مختلف اور متضاد گروہوں سے مرکب تھی جنہیں متحد کرنے میں وہ مدت العمر ساعی رہے ان میں سے ایک گروہ کے سردار مولوی عبدالحی اور مولوی کرامت علی جونپوری تھے جو اہل سنّت کا طریقہ رکھتے تھے دوسرے گروہ کے سردار مولوی اسمٰعیل تھے جو چاروں اماموں کی تقلید سے آزاد تھے اور براہ راست حدیث کو اپنا ماخذ قرار دیتے تھے خود سید احمد صاحب عمل کے اعتبار سے حنفی تھے مگر اس کے ساتھ مولوی اسمٰعیل کی جماعت کی سرپرستی کرتے تھے جو اپنے کو محمدی کہتے تھے"[1]

حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب عقائد کی موشگافیوں اور جزوی اختلافات سے بہت اُونچے تھے اور مسلمانوں میں حقیقی مذہبی روح پھونکنے میں منہمک رہتے تھے جس کی وجہ سے آپ کی طرف ہر فرقے اور عقیدے کے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ آپ کے حالات میں تحریر ہے کہ:

"بڑے بڑے جید علماء آپ سے بیعت کا شرف حاصل کرتے تھے مفتی الٰہی بخش صاحب جو کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے ایک جید روزگار علماء میں سے تھے اور جنہوں نے مثنوی مولانا روم کا ساتواں دفتر لکھا تھا فرمایا کرتے تھے کہ ساٹھ برس جو ہم نے پیسا تھا سب دلیا تھا۔ اب سید صاحب

---

[1] مضامین مسٹر جیمس و کینڈ ص ۸۷ کلکتہ ریویو جلد ۱۸۷۱ء۔

کی بدولت وہ کل پیدا ہو گیا۔ مفتی صاحب کی کفش برداری کو باعث شرف جانتے تھے۔[1]

جہاں سید صاحب جاتے مخلوق ہر طرف سے اُن پر ٹوٹ پڑتی لوگوں کو دست بدست بیعت ہونے کی نوبت بمشکل آتی تھی اس لئے کسی کا دوپٹہ لے کر اسے دور تک پھیلا دیا جاتا تھا۔ جس کا ایک سرا سید صاحب کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور لوگ اسے پکڑ کر بیک وقت بیسیوں کی تعداد میں بیعت ہوتے تھے۔ آپ کے دورہ میں قحبہ خانے ٹوٹ گئے حتیٰ کہ ایک بار آپ گھوڑے پر جا رہے تھے کہ ایک نہایت دولت مند بازاری عورت آپ کے گھوڑے کی ٹانگوں کو لپٹ گئی اور تائب ہو کر اس نے نکاح کر لیا۔

آپ نے خلیفہ مولوی ولایت علی پٹنوی کو آپ نے تبلیغ کے لئے حیدر آباد تعینات کیا وہاں جب آپ کے وعظوں کا چرچا ہوا تو نواب مبارز الدولہ نے آپ سے رجوع کیا اور آپ کے اثر سے صرف چار بیویوں کو رکھ کر باقیوں کو طلاق دے دی۔[2] غرض کہ آپ نے ہر طرف عیاشی اور نشہ بازی شرک و بدعت کا قلع قمع کیا۔ اور عام طور پر مسلمانوں کو خرافاتی منشیات اور مسکرات سے بچا کر نہ صرف انہیں معاشرہ سے پاک کیا بلکہ ان میں ملی احساس اور شوق جہاد پیدا کیا۔ آپ کی شخصیت ایسی تھی کہ علم و تصوف کے ساتھ فن سپہ گری کے بھی ماہر تھے۔ وہ لوگوں کے قلوب پر حکومت کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔ جس کے ذریعہ آپ نے اور آپ کے بعد آپ کے

---

[1] سوانح احمدی مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری ص ۴۳ مطبوعہ صوفی پرنٹنگ کمپنی منڈی بہاؤ الدین پنجاب۔

[2] منشور محمدی مولوی عبد الرحیم صاحب صادق پوری ص [illegible]

خلفاء نے پوری طرح قوم کو منتظم کیا۔ بے شک مسلمانوں کی سلطنت اس وقت جا چکی تھی مگر قوم زندہ تھی اور اس میں اصلاح قبول کرنے کی اہلیت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب کوئی مخلص اور باہمت شخص اصلاح، تبلیغ اور تنظیم کے لئے کھڑا ہو جاتا تو قوم ہر طرف سے لبیک کہتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب و ملت کی تنظیم سلطنت سے بالکل جداگانہ چیز تھی۔ اور عام طور پر سلطنت کے بدلنے کا اثر قومی حالت پر بجز اس صورت کے نہ پڑتا تھا کہ سلطنت خاص طور پر برسر پرخاش ہو۔

سکھوں سے بنائے مخاصمت

مغلیہ سلطنت کی کمزوری کے بعد مختلف صوبوں اور ریاستوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ یہ اس زمانہ کی خوش قسمتی تھی کہ سلطنت اپنے عروج کے زمانہ میں اپنے ماتحتوں اور اپنی رعایا کی فوجی قوت کو فنا کر دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پایۂ تخت دہلی کے کمزور ہوتے ہی جملہ صوبہ دار آزاد ہونے لگے۔ پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سب سے اول اپنے سکھ بھائیوں پر ہاتھ صاف کیا۔ نہتا سنگھ کو پشاور سے بے دخل کر کے اس شہر پر قبضہ کیا۔ امرتسر سکھوں سے چھینا اور اس نواح کے ایک سو قلعوں کو فتح کر کے انہیں اپنے قبضہ میں لایا اور اکالیوں کی طاقت کو توڑ کر خود تمام شمالی پنجاب کا مالک بنا۔ ستلج سے جانب جنوب سکھ ریاستوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی پناہ لی۔ اور ۱۸۰۹ء کے معاہدہ کی رو سے اس جانب انگریزوں کی سلطنت کا بند لگ گیا۔

ذاتی اعتبار سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو مسلمانوں سے بالطبع کوئی تعصب نہ تھا بلکہ ہندوستان کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں مسلمان سکھ قوم سے قریب تر تھے۔ اگر سکھوں کو اور رنجیت سنگھ کو مسلمانوں سے تعصب ہوتا تو فقیر عزیز الدین ان کے وزیر اور معتمد خاص کیوں ہوتے اور ان کے توپ خانہ کا افسر الٰہی بخش کیوں ہوتا۔ اور توپ خانہ الٰہی بخش کے نام سے کیوں موسوم ہوتا اگر ان کی فوج

ان کے سردار یقینی طور پر سب سے قابو تھے۔ دہلی کی مغلیہ سلطنت جب کمزور ہوئی تو مرہٹوں نے شمالی ہند پر حملے کر کے ملک کے بڑے حصہ پر قبضہ کیا۔ مرہٹوں اور راجپوتوں کی یہ ریاستیں عرصہ دراز سے قائم تھیں اس لئے وہ ملک داری اور حکمرانی کے طریقوں سے بخوبی واقف تھے اور اپنی رعایا کے مذہبی جذبات کا پاس و لحاظ کرتے تھے۔[1] چنانچہ مرہٹوں نے مسلمانوں کی عدالتوں کو قاضیوں کے تحت ہی بجنسہ قائم رکھا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں نے ان کی عملداری کو دار الاسلام قرار دیا جہاں جہاد لازم نہیں تھا۔

مسلمانوں کے بنیادی حقوق میں دست اندازی

مگر سکھوں کے لئے ملک گیری ایک نئی چیز تھی اور ان کی فوج زیادہ زور آور، بے قابو اور متعصب تھی۔ اس لئے کامیاب ہونے پر اس نے مسلمان رعایا پر زیادتیاں شروع کر دیں۔ سر لیپل گریفن نے اس بارہ میں لکھا ہے کہ:

”ہزارہ کے گورنر ہری سنگھ نالوہ کے متعلق ہزارہ کے مسلمانوں سے سخت نفرت کی وجہ سے وہاں مذہبی بلوے ہوتے رہتے تھے“[2]

اسی طرح ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا ہے:

”سکھوں کے ہندوانہ تعصب نے شمالی ہند کے مسلمانوں کے جوش کو بھڑکا کر آگ کا ایک شعلہ بنا دیا تھا۔“[3]

چنانچہ پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں پر زیادتیوں کی خبریں مسلسل ہندوستان

---

[1] مسلمانانِ ہند از سر ولیم ہنٹر ص ۱۳۵

[2] سلسلہ حکمرانانِ ہند از سر لیپل گریفن ص ۲۰

[3] مسلمانانِ ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص ۱۲

میں آتی تھیں وہ مشہور تھا کہ سکھ مسلمانوں کی مسجدوں کی بے حرمتی کرتے ہیں اور مسلمانوں
کو فرائض مذہبی ادا کرنے سے روکتے ہیں۔ بہادر بیاست، رام پور میں ولایتی افغانوں نے
سکھوں کے مظالم بیان کئے تھے اور کہا تھا کہ سکھ مسلمان عورتوں کو زبردستی سکھ بنا کر
اپنی بیویاں بنا لیتے ہیں۔[1]

یہ حالات سن کر سید احمد صاحب کے خلیفہ مولوی اسمٰعیل صاحب[2] تحقیق حالات
کے لئے خود پنجاب تشریف لے گئے اور امرتسر، لاہور اور دوسرے مقامات کا
دورہ کیا وہاں آپ نے بچشم خود دیکھا کہ تمام بڑی بڑی مساجد میں گھوڑے بندھے
ہوئے تھے، اذان بند تھی، قرآن مجید کی علانیہ بے حرمتی اور شعائر مذہبی کی توہین
کی جاتی تھی، اور مذہبی فرائض کی بجا آوری بعض صورتوں میں بالکل ناممکن ہو گئی تھی۔ ان باتوں
سے ظاہر ہے کہ پنجاب میں مسلمانوں کے مذہبی و دنیاوی حقوق میں مداخلت دست درازی ہو رہی
تھی جس کی مدافعت کے لئے حضرت سید احمد نے سکھوں پر جہاد کا ارادہ کیا۔

جہاد کی تیاری سید صاحب کے سوانح میں تحریر ہے:

"جب آپ سکھوں پر جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے، کسی
شخص نے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کیوں جاتے ہیں، انگریز
جو اس ملک پر حاکم ہیں، وہ دین اسلام سے منکر نہیں گھر کے گھر ہیں ان سے
جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لیں یہاں لاکھوں آدمی آپ کے
شریک اور مددگار ہو جائیں گے۔ جواب دیا کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت

---

[1] سوانح احمدی مؤلفہ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری ص ۹۰

[2] مولوی اسمٰعیل کے حالات کے لئے دیکھئے [illegible]

کرنا نہیں چاہتے نہ انگریزوں کا ورنہ سکھوں کا ملک لینا ہمارا مقصود ہے،
بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادران
اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے
ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجب جہاد سے
باز آجائیں گے تو ہم کو ان سے لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی اور سرکار
انگریزی گو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو
فرض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے۔ پھر ہم سرکار انگریزی پر
کس سبب سے جہاد کریں، اور خلاف اصول مذہب طرفین کا خون
بے سبب گرادیں۔"[1]

جہاد پر جانے سے قبل سید صاحب نے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت نواب لفٹننٹ گورنر کو ارادہ جہاد کی اطلاع دی۔ جواب ملا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو، ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں ہیں۔[2]

اس بارہ میں سر سید احمد خان مرحوم نے بھی حسب ذیل تحریر فرمایا تھا:

"اس زمانہ میں علی العموم مسلمان لوگ عوام کو سکھوں پر جہاد کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے جمع ہو گیا مگر جب صاحب کمشنر و صاحب مجسٹریٹ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے گورنمنٹ کو رپورٹ دی گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ تم کو دست اندازی نہ کرنی چاہیئے

---

[1] سوانح احمدی مؤلفہ مولوی محمد جعفر صاحب ص ۷۰

[2] ایضاً

دہلی کے ایک مہاجن نے جہادیوں کا روپیہ غبن کیا تو ولیم فریزر کمشنر دہلی نے ڈگری دی جو وصول ہو کر سرحد بھیجی گئی۔[1]

سوانح احمدی میں اس روپیہ کے بارے میں تحریر ہے کہ سید صاحب یاغستان میں مصروف بہ جہاد تھے تو سات ہزار روپیہ کی ایک ہنڈوی پنجاب میں ہونی تھی۔ پھر دیوانی میں دعویٰ کیا گیا جس کی ڈگری دیوانی اور ہائیکورٹ سے ملی۔[2]

اب سوال یہ ہے کہ گورنمنٹ انگریزی نے اس وقت یہ کیوں گوارا کیا کہ تمام ہندوستان میں جہاد کے لئے سامان جنگ اور روپیہ فراہم ہوتا رہے اور گورنمنٹ کی طرف سے نہ صرف اس کی اجازت ہو بلکہ مجاہدین کو ہر قسم کی امداد دی جائے اور ان کا روپیہ وصول کر کے انہیں دیا جائے۔ اس کا جواب حسب ذیل اقتباس میں ملے گا:

"اس میں شک نہیں کہ اگر سرکار اُس وقت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ پہنچتی مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔"[3]

سید صاحب بریلوی کی کامیابی

غرضکہ سید صاحب بریلوی ۱۲۴۱ھ میں ایک جمعیت کے ساتھ حیدرآباد سندھ ہو کر درہ بولن سے افغانستان میں داخل ہوئے اور درہ خیبر میں سے گزر کر

---

[1] مضمون سرسید بجواب ڈاکٹر ہنٹر مندرجہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۸ دسمبر ۱۸۷۱ء۔

[2] سوانح احمدی محمد جعفر صاحب ص ۷۰۔

[3] ایضاً ص ۱۳۶

پنجاب پر حملہ آور ہوئے۔ آپ کا پہلا حملہ ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو ہوا۔ دوران جنگ میں
سکھوں کی طرف سے سید صاحب کے پاس یہ پیام آیا کہ دریائے اباسین کے اس
کنارے کا ملک جو سید صاحب کے قبضہ میں ہے اس کو راجہ رنجیت سنگھ کی
طرف سے انعام تصور کر کے اپنے قبضہ میں رکھیں۔ لیکن آگے کا قصد نہ کریں۔ مگر سید
صاحب نے صاف الفاظ میں کہلا بھیجا کہ اُن کی غرض ملک گیری نہیں ہے بلکہ
خالص مسلمانوں کے لئے مذہبی آزادی حاصل کرنی ہے۔ اس کے معنی صاف یہ ہوئے
کہ سکھ حکومت کے زمانہ میں مسلمانوں نے سیاسی مفاد کو ٹھکرا دیا اور صرف اپنا بنیادی
اور مذہبی حق حاصل کرنے کے لئے کشمکش جاری رکھی اور مسلسل چار سال تک مصروف
پیکار رہے۔ حتیٰ کہ سید صاحب نے جون ۱۸۳۰ء میں پشاور لے لیا۔ امن کا
اعلان کیا گیا۔ کسبیاں فرار ہو گئیں۔ مسکرات یعنی نشہ کی چیزوں کی دکانیں بند ہو گئیں۔
احکام شرعی جاری ہو گئے۔ سلطان محمد خاں والی پشاور کو جو سکھوں کی طرف سے حاکم
تھا اطاعت کر لینے پر اس کے عہدہ پر برقرار رکھا گیا۔ اور مولوی مظہر علی کو قاضی مقرر
کیا گیا۔

سید صاحب بریلوی کی بددلی اور واپسی

مسلسل چار سال کی جدوجہد کے بعد سید صاحب بریلوی نے نہ صرف
سرحدی علاقہ کو بلکہ وہاں کے دارالسلطنت کو مذہبی آزادی دلا دی جو آپ کا مقصد
اصلی تھا۔ مگر ملکی تسلط ہو جانے پر سید صاحب کے ساتھیوں میں رقابتیں پیدا ہو گئیں
ایک طرف تو سلطان محمد خاں کے رقیب بہرام خاں کو اس کا قلق تھا کہ وہ پشاور کا حاکم
کیوں نہیں مقرر کیا گیا۔ دوسری طرف مولوی مظہر علی جو قاضی مقرر کئے گئے تھے سوء اتفاق
سے سلطان محمد خاں کے بھائی سردار یار محمد خاں کو پچھلی لڑائی میں قتل کیا تھا۔ پس جب
سید صاحب پشاور سے چلے آئے تو سلطان محمد خاں نے جو پہلے سکھوں کی طرف سے

حاکم پشاور تھے مولوی مظہر علی قاضی شہر کو دربار میں بلا کر قتل کیا اور خوانین سمہ سے سازش کر کے تحصیلداران عشور کو جو سید صاحب کی طرف سے مقرر تھے ایک رات میں نماز پڑھتے وقت قتل کرا دیا۔ اس کا جواب یہ ہو سکتا تھا کہ سید صاحب ان لوگوں کی سرکوبی کرتے مگر چونکہ ان کا مقصد اس سے زیادہ نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی دلائیں اور اُن کو کسی طرح یہ گوارا نہ تھا کہ خود مسلمانوں کو قتل کرائیں اس لئے آپ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ اب میں اس ملک سے ہجرت کر کے جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور یہ بھی نہیں جانتا کہ خداوند تعالےٰ مجھے کہاں لے جائے گا۔ غالباً اس سفر میں تکالیف آب و دانہ وغیرہ لازم آئیں گی۔ پس جو شخص ایسی تکالیف برداشت کر سکے اور کلمۂ شکایت مالکِ حقیقی کا زبان پر نہ آنے دے وہ میرے ساتھ چلے۔ اس پر سب زار و قطار رونے لگے اور سب مجاہدین ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ اور کہا کہ آپ کو چھوڑ کر ہفت اقلیم کی بادشاہت قبول نہ کریں گے۔ ہجرت کا ارادہ سُن کر تمام نواح کے لوگ بکثرت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہجرت کا قصد ملتوی کرنے پر اصرار کرتے رہے حتیٰ کہ تمام مردمان خدو خیل مع اپنے سردار فتح خاں کے حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم سے آج تک غداری یا نافرمانی نہیں ہوئی۔ ہم بدستور آپ کے تابعدار اور غلام ہیں۔ سید صاحب نے جواب میں فرمایا کہ اقوام سمہ بھی فرمانبردار تھیں۔ مگر انہوں نے ناحق کثیر مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔ غرض کہ سید صاحب کسی طرح نہیں مانے اور فتح خاں کو سردار مقرر کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اور ہدایت کی کہ تم ان کی اطاعت کرنا اور احکام شریعت پر قائم رہو اور وہاں سے سنہ ۱۲۴۶ھ مطابق آخر سنہ ۱۸۳۰ء میں چل دیئے توپوں کو ایک محفوظ جگہ میں دفن کرا دیا اور بہت سا اور استعمالی سامان وہیں لوگوں کے سپرد کر دیا۔

علاقہ سمہ سے ہجرت کر کے لشکرِ اسلام دو منزل آگے بڑھا ہو گا کہ لشکر اعدا

نے سمہ پر یورش شروع کی اور لشکر خالصہ کے مسلمان سپاہی اور خود قوم سکھ زئیوں کے
ناحق قتل سے ایسے غصہ اور جوش میں تھے کہ انہوں نے ہزارہا اہل سمہ کو قتل کر کے
ان کے گاؤں میں آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیا۔ اور کہا کہ جب تم نے اپنے مرشد کے ساتھ
بے وفائی کی تو ہمارے ساتھ کیسے وفاداری کر سکتے ہیں۔

سید صاحب بریلوی کی شہادت

غرضکہ سید صاحب کا لشکر آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ برف باری کا زمانہ آگیا۔ اور آپ
کو عارضی مکانات بنا کر قیام کرنا پڑا۔ مگر اس بے سروسامانی کی حالت میں بھی آپ نے
سکھوں کو جھوکر منک میں پے در پے شکستیں دیں۔ حتیٰ کہ بالاکوٹ پر قبضہ کیا۔ وہاں سکھوں
کے ساتھ ایک زبردست جنگ ہوئی جس میں سید صاحب دلدل کو پار کر کے خود دست
بدست لڑے اور وہاں بتاریخ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق مئی ۱۸۳۱ء شہید ہو گئے۔
مولوی اسمٰعیل صاحب آپ کے خلیفہ بھی وہیں شہید ہوئے اس سے ان کی فوج منتشر
ہو گئی۔ اور زیادہ تر ہندوستان واپس آگئی۔ دراصل سید صاحب تو اپنے کام سے اسی
وقت دستبردار ہو چکے تھے جب کہ اہل سمہ نے ان کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔
اس وقت آپ کے لئے بجز اس کے چارہ کار نہ تھا کہ مذہبی کام کے ساتھ سلطنت
بھی قائم کرتے۔ مگر یہ آپ کے مشن کے خلاف تھا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ
سید صاحب اس وقت دنیا کی دلدل میں پھنسنے سے صاف بچ گئے۔ آپ کی
تحریک چند ہی سال رہی مگر اس تھوڑے عرصہ میں آپ تمام ہندوستان پر چھا گئے
تھے۔ اور آپ نے حقیقی جاں نثار، حق پرست اور دیندار لوگوں کی ایک جماعت
تیار کر لی تھی۔

داڑھیوں پر ٹیکس

جس زمانہ میں حضرت سید احمد سرحد میں مصروف پیکار تھے
بنگال میں ایک شخص نثار علی عرف ٹیٹو میر کی شخصیت نمایاں

ہوئی اُن کا تذکرہ ڈاکٹر ہنٹر اور دوسرے مصنفین نے کیا ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا ہے کہ :

"یہ شخص ایک کاشتکار تھا اور ایک زمیندار کے یہاں اس کی شادی ہوئی تھی۔ سید احمد صاحب کا معتقد تھا۔ اس کے ساتھ ہزاروں کاشتکار ہو گئے تھے۔ جو ہندو زمینداروں کے جور و ستم سے پریشان تھے"[1]

یہ مظالم مختلف صورتوں میں ہوتے تھے۔ جن میں سے ایک کا حال مسٹر جیمس او کینلی افسر تحقیقات باغیان نے حسب ذیل لکھا ہے :

"جون ۱۸۳۱ء میں کشن رائے زمیندار ساکن پورنا کے مظالم نے ایک نازک حالت پیدا کر دی اس نے اپنے ہر مسلمان کاشتکار پر جسے وہ وہابی کہتا تھا ڈھائی روپیہ کا محصول لگا دیا۔ اور اشتعال میں اضافہ اس طرح کیا کہ وہ ڈاڑھی کا ٹیکس کہہ کر وصول کرتا تھا۔ اپنے موضع میں تو اس نے یہ محصول بلا مقابلہ وصول کر لیا مگر جب اس کے کارندے قریب کے موضع سرفراز پور میں پہنچے تو وہاں اتفاق سے نثار علی عرف ٹیٹو میر اپنے معتقدین کے موجود تھے۔ انہوں نے محصلوں اور کارندوں کو گرفتار کر لیا۔ جب کشن رائے زمیندار کو اس کی خبر ہوئی تو وہ تین سو آدمی جمع کر کے بھیج دیئے جن کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ ہوا اور لوٹ لئے گئے اور مکانات اور مسجد جلا دی گئی۔ جب معاملہ کی تحقیقات ہوئی تو تھانیدار صاحب نے اُلٹا مسلمانوں پر یہ الزام قائم کیا کہ انہوں نے خود اپنے مکانات اور مسجد جلا دی ہے۔ دونوں طرف سے دعوے ہوئے جن کے فیصلہ

---

[1] مسلمانانِ ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص ۵۷

بہت سے جرگے تھے اور چونکہ ان لوگوں سے اور سکھوں سے سالہا سال تک مقابلہ رہ چکا تھا۔ اس لئے اُن کے ساتھ بھی چھوٹی موٹی لڑائیاں جاری رہتی تھیں۔ حضرت سید احمد صاحب بریلوی کی شہادت کے بعد اگرچہ ہندوستانی مجاہدین کی قوت ٹوٹ گئی تھی۔ مگر چونکہ وہ ملک اور مال و متاع کے خواہشمند نہ تھے اور خالص مذہبی اور دیندار لوگ تھے اس لئے سرحدی جرگے ان سے مدد حاصل کرنے کے خواہشمند رہتے تھے۔ اس کی نسبت مولوی عبدالرحیم نے حسب ذیل لکھا ہے:

"ہر تعلقدار آزاد بادشاہ تھا۔ یہ لوگ آپس میں تیغ آزمائی کرتے، آپس میں لڑتے اس حالت زبوں سے سکھوں کو انہیں ستانے کی جرأت ہوتی اور ان کے آپس میں جھگڑے لڑواتے جب یہ لوگ اپنی قوت بازو سے عاجز آ جاتے تو حالت اضطراری میں برکات مجاہدین یاد آتیں اور تب اعانت اور نصرت کی درخواست کرتے"[1]

غرضکہ سرحد کے لوگوں کی درخواستوں پر یہ مجاہدین ان کی امداد پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ جب تک کہ پنجاب کو انگریزوں نے فتح نہیں کر لیا۔ سرکار انگریزی کو یہ امر ناگوار نہ تھا کہ اس کی رعایا کے مسلمان مجاہدین سکھوں کے ساتھ لڑا کریں جیسا کہ حسب ذیل اقتباس سے واضح ہے:

"قبل اس کے کہ ہم نے پنجاب کا الحاق کیا۔ یہ لوگ نہایت بے باکانہ ہمارے ضلع انگریزی سے پرجوش دینداروں کو اپنی جماعت میں بھرتی کرتے رہتے تھے اور ہم اپنی رعایا کے ان مذہبی دیوانوں کو ان مجنونوں کی آبادی میں جانے سے روکنے کے لئے کوئی احتیاط نہ کرتے تھے"

---

[1] الدر المنثور از مولوی عبدالرحیم صاحب صادق پوری ص ۳۶

یہ لوگ اپنا عشر سکھوں پر اتارا کرتے تھے۔ سکھوں کی جماعت وہ تھی جو مختلف اقوام کا غیر یقینی مجموعہ تھی جو کبھی ہماری دشمن اور کبھی ہماری دوست ہو جاتی تھی۔ صوبہ متحدہ کے ایک انگریز کلکٹر نے ذیل کا بیان دیا ہے کہ اس کے ہاں چند مسلمان ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جزو ستھانہ کیمپ کے لئے علیحدہ کر کے رکھ لیتے تھے۔ جو لوگ زیادہ جوشیلے تھے وہ تھوڑے عرصے تک زمانے کے لئے ستھانہ جا کر خدمت کرتے تھے جس طرح ہندو ملازم اپنے پروہتوں اور پنڈتوں کے نذرانہ کے لئے منتیں مانتے تھے اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہہ کر چندہ کی رقم دیتے تھے کہ انہیں فریضۂ جہاد ادا کرنے کے لئے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے[1]۔

انگریزی ہند میں آزادی کو ترجیح

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے سرحد میں ان مجاہدین کا مرکز ستھانہ اور وادی سوات میں تھا اور ہندوستان میں ان کا مرکز پٹنہ تھا جہاں کہ سید احمد صاحب شہید بریلوی کے خلفاء مولوی ولایت علی اور ان کے چھوٹے بھائی عنایت علی رہتے تھے وہاں سے یہ اصحاب بنگال، مدراس اور تمام ہندوستان کے دور دراز مقامات پر اشاعتِ اسلام کے لئے مبلغین بھیجتے تھے۔ بقول ڈاکٹر ہنٹر کے:

"یہ لوگ مثل شہزادوں کے ان تحریکوں کا مرکز تھے۔ وہ بے لوث اور بے نفس لوگ تھے جن کا طریقِ زندگی ہر شبہ سے بالاتر تھا اور روپیہ اور آدمی بہم پہنچانے کی انتہائی قابلیت رکھتے تھے ان کا کام نفس

---

[1] مسلمانانِ ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص ۲۰

در اصلاح مذہب تھا۔[۱]

جس فرقہ کے اخلاق اور خلوص و ایثار کے یہ حالات ہوں صاف ظاہر ہے
کہ اس کی طرف رجوعات کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۲۶۱ھ میں سید ضامن شاہ
حاکم ملک مضافات بالاکوٹ پر جب سردار گلاب سنگھ گورنر کشمیر نے متواتر حملے
کیئے تو بحالت پریشانی سید ضامن شاہ نے مولوی ولایت علی سے جو پٹنہ میں
تھے امداد کی درخواست کی جس پر آپ نے اپنے چھوٹے بھائی مولوی عنایت علی
کو سرحد بھیج دیا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر فوج اور میگزین کا انتظام اپنے ہاتھ میں
لے لیا۔ اور کل علاقہ جات مقبوضہ واپس لے کر سید ضامن شاہ کو دے
دیئے۔[۲]

اس کے دو سال بعد سید ضامن شاہ کے بلانے پر خود مولوی ولایت علی صاحب
۱۲۶۳ھ میں پٹنہ سے سرحد تشریف لے گئے اور وہاں چند سال کے مقابلہ کے
بعد راجہ گلاب سنگھ کا بہت سا علاقہ حاصل کر لیا۔ اس وقت بھی مولوی صاحب
سردار گلاب سنگھ کو اس کا ملک اس شرط پر پیش کرنے پر تیار تھے کہ وہ مسلمانوں
کو مذہبی آزادی دے دیں اور اُن پر ظلم نہ کریں۔ مگر سردار گلاب سنگھ نے مسلمانوں
سے صلح نہ کی۔

ایک زمانہ وہ تھا جب کہ بقول میجر باسو:

"انگریزوں نے سکھوں کو بڑھایا تھا تاکہ وہ سندھیا کا مقابلہ
کریں۔ اس سے مہاراجہ رنجیت سنگھ ہمیشہ انگریزوں سے ملے رہے"

---

۱ مسلمانان ہند ذکر ص

۲ در منثور، مولوی عبدالرحیم صاحب ص

جاری ہو گیا۔ جس میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے اضافہ کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس ملک میں مسلمانوں کی مالی، تعلیمی اور عام حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی جاتی تھی۔ اُن پر بالخصوص تعلیم اور ملازمت کے دروازے بالکل بند ہو چکے تھے۔ اُن کے علما ترکِ وطن کر کے مکہ معظمہ اور سرحد کو چلے جاتے تھے۔ علم کے شائقین کچھ تو مکہ معظمہ بھی پہنچتے تھے۔ مگر وہاں کے مقابلے میں اضلاعِ سرحد کا سفر سہل تھا۔ جہاں کے سفر کی انہیں عادت بھی ہو گئی تھی۔ اس لئے کتنے لوگ تحصیلِ علم کے لئے ستھانہ اور سوات جاتے رہتے تھے۔[1]

مختصر یہ کہ مسلمانوں کی بددلی اور ہجرت کے وجوہ جو کچھ بھی ہوں یہ سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا۔ اور جو لوگ ترکِ وطن کر کے چلے جاتے تھے ان کے پاس ہندوستان سے مالی امداد اور عزیزوں، قریبوں اور ہمدردوں کی آمد و رفت بھی جاری رہتی تھی۔ یہ معاملہ متعدد بار گورنمنٹ ہند کے علم میں مقامی حکام کی طرف سے لایا گیا تھا جس پر کوئی باز پرس نہ کی گئی اور صرفِ نگرانی کا حکم دیا گیا۔ مگر ۱۸۶۳ء میں جب گورنمنٹ ہند نے سرحد میں پیش قدمی شروع کی تب اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستان سے سرحد کے تعلقات بالکل قطع کر دیئے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۰ء تک سرحدی محاربات کے دوران میں باشندگانِ ہند پر یکے بعد دیگرے پانچ مقدمات بغاوت چلائے گئے۔ ان مقدمات میں سب سے بڑے مجرم پٹنہ کے خاندان کے لوگ اور ان کے مریدین اور معتقدین تھے۔[2] مولوی ولایت علی کے بڑے صاحبزادے مولوی عبداللہ اپنے والد کے

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۱۸۷۰ء ص ۹۵

[2] ایضاً ص ۹۷

ساتھ ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ ان کے حقیقی چچازاد بھائی مولوی عبدالرحیم اور خود مذکر کے حقیقی ماموں مولوی یحییٰ علی اور مولوی احمد اللہ سب کے سب ۱۸۶۴ء میں اس جرم میں ماخوذ ہوئے کہ انہوں نے اپنے عزیزوں سے خط و کتابت رکھی اور انہیں مالی امداد بھیجی۔ حالانکہ یہ سلسلہ ۱۸۰۷ء سے جاری تھا جب کہ حکام گورنمنٹ خود مجاہدین کی ہنڈیوں کا روپیہ انہیں حوالہ کرا دیتے تھے۔ مولوی عبداللہ اور مولوی یحییٰ علی پٹنہ کے بڑے رؤسا میں سے تھے اور اول مذکر گورنمنٹ کے مستقل خیرخواہ تھے اور اس کی خدمات انجام دیتے تھے۔ بہرحال ان اصحاب پر اور ان کے ساتھ اسی قسم کے لوگوں پر جو سرحد سے تعلقات رکھتے تھے، مقدمات چلا کر انہیں سزائے موت کا حکم دیا گیا، مگر بعد میں مسلمانوں میں ہنگامہ کے اندیشہ سے انہیں کالے پانی بھیج دیا گیا۔ ایک طرف ہندوستان میں مقدمات چلانے کا سلسلہ جاری تھا تو دوسری طرف سرحد میں فوج کشی کی جاتی تھی اور سمجھا جاتا تھا کہ ان طریقوں سے جو ہندوستانی مسلمان وہاں رہ پڑے ہیں وہ ہندوستان واپس چلے جائیں گے چنانچہ ۱۸۶۳ء کی مہم کے بعد ہنٹر بیان کرتا ہے:

"پنجاب گورنمنٹ کو افسوس رہا کہ یہ مہم ختم ہوگئی اور ہندوستان کے مذہبی مجنونوں کو نہ نکال لے جاسکے اور نہ ہم انہیں مطیع کر کے ان کے گھروں کو ہندوستان واپس کرسکے۔"[1]

غرضیکہ غریب مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ نہ ان کے ہندوستان میں ذریعہ معاش اور عزت سے زندگی بسر کرنے کے وسائل باقی رہنے تھے، اور نہ انہیں سرحد میں جہاں وہ ہجرت کر کے عزلت نشین ہوئے تھے چین ملتا تھا۔ ان پر تو اس وقت

---

[1] مسلمانانِ ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص ۷۲

”ترپائے رفتن نہ جائے ماندن“ کی شکل صادق آتی تھی۔ مختصر یہ کہ حکام سلطنت کے اس قسم کے طرزِ عمل سے جو حالت پیدا ہوگئی تھی اس کا اندازہ مسٹر ای سی بیلی سکریٹری گورنمنٹ ہند کی حسب ذیل تحریر سے ہوگا:

”ان کی مذہبی دیوانگی جس کے لئے قرآن (شریف) سے کافی سند مل سکتی ہے بہت بہتر طاری کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اب اندیشہ ہے کہ کل مسلمان بہت جلد باغی ہو جائیں گے جن میں زمانہ مذہبی جنون جدید اور تنگ نظری کی تعلیم پائے ہوئے علماء شامل ہوں گے جو طبعی طور پر حکومت سے ناراض ہیں اور جاہل مسلمانوں پر بے حد اثر رکھتے ہیں۔“[1]

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حکومت کو مسلمانوں کی طرف سے سخت اندیشے لاحق ہو گئے تھے اور ملک میں جہاد کے فتووں کا زور تھا۔ چنانچہ اس بارہ میں ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا ہے:

”سب سے اوّل شمالی ہند کے مسلمان علماء نے حکومت کے خلاف جہاد کرنے کے جواز کا فتویٰ جاری کیا۔ اس کے بعد مسلمانانِ بنگال نے اسی مضمون پر ایک رسالہ جاری کیا۔ اور شیعہ جو تعداد میں تھوڑے سے ہیں وہ بھی اپنے خیالات کی اشاعت کرنے سے نہ رک سکے۔“[2]

مسلمانوں کے بارے میں حکومت کی پالیسی میں تبدیلی

[illegible] حکومت کے خلاف ناراضگی کی تحریک صرف نام نہاد وہابیوں کی طرف سے نہ تھی بلکہ اس کے

---

[1] مسلمانانِ ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص ۵

[2] ایضاً ص ۱۸

ساتھ مسلمانوں کے مختلف اور متضاد فرقوں کی بھی ہمدردی تھی انجام کار اس قسم کے نیک دل اور حقیقت شناس انگریزوں کی کوششوں سے گورنمنٹ ہند کی حکمت عملی (پالیسی) سنہ ۱۸۷۱ء میں مسلمانوں کے بارہ میں تبدیل ہوئی اور سمجھ لیا گیا کہ مسلمانوں کو دبا کر اور برباد کر کے انہیں سلطنت کا خیر خواہ اور وفادار نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ سال مذکور میں گورنمنٹ ہند نے مسلمانوں کو جدید طریقہ پر تعلیم دینے کا تہیہ کر لیا۔ جس کی مفصل کیفیت اس باب کی فصل چہارم میں درج ہے۔ یہی وہ سال ہے جس میں بدقسمتی سے دو افسوسناک واقعات پیش آئے ایک یہ کہ لارڈ میو وائسرائے ہند کو شیر علی خاں قیدی نے جزیرہ انڈمان میں قتل کیا اور کلکتہ کے چیف جسٹس کو ہائی کورٹ کی برساتی میں ایک مسلمان نے اس زمانہ میں جبکہ وہابیوں پر مقدمات چل رہے تھے قتل کیا۔ ان اہم واقعات کا تذکرہ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب "مسلمانانِ ہند" میں نہایت افسوس کے ساتھ کیا ہے اور گورنمنٹ کو اپنی پالیسی مسلمانوں کے بارہ میں بدلنے اور ان کی تعلیم کا انتظام کرنے پر زور دیا ہے۔ اس کی تفصیل باب ہذا کی فصل چہارم میں آئے گی۔

خلفائے سید صاحب کی مذہبی و اخلاقی حالت

سید احمد صاحب بریلوی کی شہادت سنہ ۱۸۳۱ء

یہ تو آپ دیکھ چکے ہیں کہ سنہ ۱۸۷۱ء تک جب کہ حکام گورنمنٹ کی نظریں مسلمانوں کی طرف سے پھری ہوئی تھیں مخالف حالات میں مسلمانوں کے مذہب و اخلاق و تعلیم کی کیا کیفیت رہی۔ سید صاحب کی شہادت کے ساتھ تمام لشکر مجاہدین منتشر اور برباد ہو گیا تھا۔ مگر یہ سلسلہ درس و تدریس اور اشاعت و تبلیغ اور اصلاح تمدن و معاشرت جو آپ نے جاری کیا تھا وہ برابر جاری رہا۔ سید صاحب کے بعد ہندوستان کی مذہبی حکومت مولوی ولایت علی صاحب پٹنوی کے سپرد ہوئی۔ جن کی تربیت سب سے اول سید صاحب کے رستے بریلی کے لشکر میں ہوئی تھی۔ مولوی ولایت علی صاحب

ناظم بہار کے نواسے بڑے رئیس زادے اور ناز و نعم میں پرورش پائے ہوئے تھے۔ مگر مذہبی تحریک نے اُن کی بالکل کایا پلٹ کر دی تھی اور باوجود ایک جماعت کے امیر مقرر ہو جانے کے اپنی جماعت والوں کی خود آپ خدمت کیا کرتے تھے اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اور اپنے سر پر لاد کر لایا کرتے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے اور مٹی گارے کا کام خود انجام دیتے۔ اس زمانہ میں آپ کے والد ماجد نے اپنے ایک خدمتگار کے ہاتھ چار سو روپیہ اور کچھ قیمتی کپڑے پٹنہ سے آپ کے پاس رائے بریلی بھیجے۔ اُس وقت آپ موٹا سا تہ بند باندھے ہوئے قافلہ کی مسجد و مکان کی تعمیر کے کام میں مصروف تھے۔ اور گارے میں لتھڑے ہوئے تھے۔ پرانے ملازم نے آپ کو نہ پہچانا اور بتانے پر بھی یقین نہ کیا کہ یہ مولوی ولایت علی ہیں۔ بالآخر جب اُسے یقین آ گیا تو آپ کی کیفیت دیکھ کر زار و قطار رونے لگا۔ اور نقد و پارچہ جات پیش کئے۔ آپ نے انہیں بجنسہٖ سید صاحب کی خدمت میں پیش کر کے بیت المال میں داخل کرا دیا۔ اس قسم کی تربیت کے بعد وہ کون سی مشکل تھی جو ان کے سامنے ٹھہر سکتی تھی۔

اصلاح مراسم اور سادہ زندگی

مولوی ولایت علی اور اُن کے بھائی مولوی عنایت علی کے مجاہدات اور سرفروشی کے حالات اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ اس جگہ یہ دکھانا ہے کہ باوجود بڑے رئیس اور سردار ہونے کے انہوں نے مذہب و ملت کے لئے مزدوروں کی سی زندگی اختیار کر رکھی تھی:

> "آپ کا لباس اکثر موٹے قسم کے کپڑوں کا ہوا کرتا تھا۔ غذا بھی موٹی اور باسی ہر طرح کی مساکین کے ساتھ نوش فرماتے اور انہیں کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور آپ کے گھر والے بھی ویسی ہی سادہ زندگی گزارتے تھے اور اپنی کل آمدنی بیت المال میں داخل فرما دیتے تھے۔ جو کچھ

ہدیۂ آپ کو ملتے اُن کو جماعتِ مساکین اور مولفتہ القلوب پر صرف کرتے۔ آپ کی تربیت سے شریفوں سے فخرِ انساب، عالموں سے امتیاز، عابدوں سے اپنی عبادت پر بھروسہ، دولت مندوں سے کبر و نخوت، تندخوؤں سے شدت دُور ہوتی تھی۔ جماعتِ مساکین جو "قافلہ" کے نام سے مشہور تھی اُسے مکان میں اسی لئے رکھتے تھے کہ اُس سے لوگوں میں مندرجۂ بالا خوبیوں کی تربیت ہو جائے

مراسم میں سادگی کی مثال آپ نے اس طرح قائم کی کہ باوجود رئیسِ اعظم ہونے کے اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح، موجودہ پیوند لگے کپڑوں میں ہزارہا آدمیوں کے مجمعوں میں کرا دیئے اور نہایت سادہ دعوتِ ولیمہ دی۔ جب آپ ہجرت کر کے سرحد کو روانہ ہوئے تو آپ کے قافلہ میں دو ڈھائی سو آدمی تھے۔ راستہ میں بڑے بڑے رئیسوں نے آپ کی مختلف دعوتیں کرنی چاہیں مگر آپ کے حکم سے کبھی تو ندو کو ستو گھول کر پلا دیئے جاتے اور کھچڑی وغیرہ کھلا دی جاتی تھی۔ غرض سفر اور حضر میزبانی و مہمانی میں ہمہ وقت یکساں سادگی مدِ نظر رکھتے تھے۔ ان کی تبلیغ ہدف انہی کے مکان تک محدود تھی بلکہ وہ نوربانوں کے گھروں اور کسانوں کے کھیتوں پر جا کر وعظ و نصیحت کرتے۔ جب سرحد کو روانہ ہوئے تو قریہ بہ قریہ، قصبہ بہ قصبہ قیام کر کے اشاعتِ دین کرتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ پٹنہ سے دہلی تک کا سفر ڈیڑھ سال میں طے کیا تھا۔

مذہب کے لئے قربانیاں مولوی عنایت علی صاحب نے جب اپنے چھوٹے بھائی مولوی عنایت علی کو

سے ور منثور ص ۱۰

بنگال روانہ کیا تو وہ اپنی جائیداد کا انتظام دوسرے کے سپرد کر کے وہاں چلے گئے اور تمام
عمر درس و تدریس، اصلاح و تبلیغ میں صرف کر دی۔ اسی طرح مدراس و حیدرآباد، بمبئی اور
تمام صوبوں میں آپ کے خلفاء اور نائبین مقرر تھے جو مسلمانوں میں مذہبی تعلیم
پھیلاتے تھے اور انہیں منظم کرتے تھے۔ یہ لوگ کسی ایک جگہ پیر اور مخدوم بن کر نہ
بیٹھتے تھے بلکہ گاؤں گاؤں مارے مارے پھرتے تھے اور جہاں کا حکم ہوتا تھا سب
چھوڑ چھاڑ کر وہاں چلے جاتے تھے۔ حالانکہ اس زمانہ میں ریل نہ ہونے کی وجہ سے
معمولی سفروں میں ہفتے اور مہینے لگ جاتے تھے۔ مولوی عنایت علی اپنے بڑے بھائی
ولایت علی سے صرف دو سال چھوٹے تھے مگر جب بنگال میں ان کے پاس مولوی صاحب کی
سے سرحد جانے کا حکم پہنچا تو اسی وقت کمربستہ ہو کر چلے گئے اور وہاں کی لڑائیوں میں
شریک ہوئے۔ دوسری بار جب ضرورت ہوئی تو تمام متعلقات کا بیع نامہ کر کے
روانہ ہو گئے اور سرحد میں دوبارہ پہنچ کر مسلسل آٹھ دس سال تک دینی خدمات انجام
دیں۔ حتیٰ کہ بھوک کی حالت میں درختوں کے پتے اور کونپلیں کھانے کی نوبت
آئی جس سے خون کے دست آنے لگے اور اسی حالت میں صبر اور استقامت
کے ساتھ جان دے دی۔

مذہبی تبلیغ کی اہمیت

مولوی ولایت علی اور عنایت علی کے بعد ان کے صاحبزادوں کا زمانہ آیا جن پر بغاوت کے مقدمات چلائے
گئے جس صبر و استقلال کے ساتھ ان حضرات نے ان مصائب کو جھیلا وہ اسی
حالت میں مذہب کی خدمت کرتے رہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان
کے سامنے ایک مقصد اور نصب العین ہوتا ہے تو اس میں کس درجہ مضبوطی اور
پختگی آجاتی ہے۔

منجملہ ان احباب کے جو خود [illegible] مولوی [illegible] علی صاحب صادق پوری پٹنوی [illegible]

میں آپ نے مذہبی تبلیغ کی وہ عجیب وغریب ہیں۔ مولوی صاحب موصوف
پر یہ جرم عائد کیا گیا تھا کہ وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ جو سرحد میں تھے۔ خط و
کتابت رکھتے تھے اور ان کے پاس امداد کے طور پر روپیہ بھیجتے تھے۔ اس جرم میں ان
پر سنہ ۱۸۶۴ء میں مقدمہ چلایا گیا۔ حوالات میں آپ پر جو سختیاں گزریں وہ ناقابل بیان
ہیں۔ مولانا کی یہ کیفیت تھی کہ ہر وقت ذکر و شغل میں منہمک شاداں و فرحاں رہتے
اور بجز ذات باری تعالےٰ کے کسی چیز سے خائف نہ ہوتے تھے۔ آپ نے پیشی
کے وقت عدالت سے ترک مخاطبات کر رکھی تھی۔ نہ آپ کسی کو وکیل کرتے اور نہ کسی
کو جواب دیتے اور ہر وقت یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ پہلے دن جب
ظہر کی نماز کا وقت آیا تو آپ نے عدالت سے نماز کی اجازت چاہی عدالت
نے اجازت دینے سے انکار کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہماری غیر حاضری میں ہمارے
خلاف شہادت کی سماعت جاری رکھی جائے اس میں ہمارا ہی نقصان تو ہوگا۔ مگر
اس پر بھی عدالت رضامند نہ ہوئی اور نماز کی اجازت نہ دی تو کل ملزموں کے ساتھ
اجلاس کے اندر ہی سنگینوں کے پہرہ میں تکبیر کہہ کر نماز با جماعت ادا کی۔ جب دو
روز یہی ہوتا رہا تب عدالت نے ایک ایک ملزم کو باہر لے جا کر نماز پڑھنے کی
اجازت دی۔ یہ حضرات زمانہ حوالات میں تین مہینے تک کال کوٹھری میں رکھے
گئے۔ اس قیدِ تنہائی میں بھی مولوی یحییٰ علی کا فیض تبلیغ جاری رہا پہرہ کے سپاہی بالعموم
سکھ یا گورکھے ہوتے تھے آپ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔
کا وعظ سناتے۔ سپاہی کھڑا روتا جب پہرہ بدلتا تو آپ کی صحبت چھوڑ کر جانا پسند
نہ کرتا اس وقت کتنے ہی سپاہی موحد اور کتنے مسلمان ہو گئے۔ مولانا کا جسم بیشک
قید میں تھا مگر دل و زبان آزاد تھے۔ جن پر بجز حاکم حقیقی کے کسی کی حکومت نہ تھی۔
اس مقدمہ میں آپ کو سزائے موت دی گئی جو بعد میں عبور دریائے شور میں منتقل کر

دی گئی۔ سزا کا حکم ملنے پر آپ کو کنوؤں کے رہٹ چلانے کی مشقت پر لگا دیا گیا۔ اور
آپ دھوپ کی تپش میں اس کو چلاتے رہتے حتیٰ کہ پیشاب میں خون آنے لگا۔ مگر
آپ نہایت صبر و شکر کے ساتھ اُس کو انجام دیتے رہے۔ دوسرے قیدی جو نہایت
قوی اور توانا تھے تھک کر بیٹھ جاتے مگر آپ صبح سے شام تک اس میں لگے
رہتے حتیٰ کہ خود ڈاکٹر نے ان پر رحم کھا کر انہیں دری بافی کے کام میں لگا دیا۔ یہ کام کرتے
وقت آپ حمد و ثنائے باری تعالیٰ میں مشغول رہتے۔ احساسِ فرض کی یہ کیفیت تھی کہ
جیل کا کام بھی بہ احسن وجوہ انجام دیتے اور دوسرے قیدیوں کو نصیحت فرماتے کہ جب
تم سرکاری کھانا کھاتے ہو اور سرکار کا کپڑا پہنتے ہو اور اس کے مکان میں رہتے ہو تو
ضروری ہے کہ سرکاری کام کو انجام دو۔ در آنحالیکہ اُس زمانے کے کھانے کی بابت جو
جیل خانہ میں قیدیوں کو دیا جاتا تھا۔ مورّخ نے لکھا ہے کہ ہر قیدی کو دو روٹیاں ملتی تھیں
اس لئے قیدی جیل کی گھاس اور جڑیں اکھاڑ کر پیٹ بھرتے تھے۔ جو قیدی افسران
جیل کی حدول حکمی کرنے کا ارادہ کرتے مولانا اُن کو روکتے۔ آپ کی نصیحتوں سے صدہا
قیدی ایسے نیک چلن ہو گئے کہ اُن کو دیکھ کر دوسرے اہلِ کارانِ جیل حیران ہوتے
تھے۔

مضبوطی کیرکٹر کی چند مثالیں

نہ صرف مجاہدین اور مہاجرین کی مضبوطی کیرکٹر کی یہ کیفیت تھی بلکہ دیگر علماء اور عوام الناس میں بھی نہایت
درجہ پختگی کے بہترین نمونے ملتے تھے۔ مثلاً

۱۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں بدایوں کے ایک عالم مولوی رضی اللہ صاحب شریک
ہوئے تھے۔ ہنگامہ فرو ہونے پر وہ گرفتار ہو کر مسٹر کارمیکل کلکٹر کے سامنے
پیش ہوئے جنہوں نے مولوی صاحب سے عربی پڑھی تھی۔ جب کلکٹر
صاحب نے مولوی صاحب سے پوچھا تو انہوں نے صاف الفاظ میں

مسلمانوں کو شرکتِ ہنگامہ سے روکتے تھے اُن میں سے ایک صاحب مولوی
میر محبوب علی دہلوی تھے جو یہ کہتے پھرتے تھے کہ ہنگامہ کی شرکت جہاد میں
داخل نہیں ہے اس لئے اس سے پرہیز کیا جائے۔ جب ہنگامہ فرو ہو گیا تو
حکومت کی طرف سے مولوی صاحب کو گیارہ گاؤں انعام میں دیئے جانے تجویز
ہوئے۔ جس کا پروانہ لے کر ایک انگریز افسر مولوی صاحب کے پاس گئے اور
کہا کہ آپ کی وفاداری کے صلہ میں گورنمنٹ نے آپ کو یہ گاؤں عطا کئے ہیں۔
یہ سن کر مولوی صاحب بہت برہم ہوئے اور پروانہ لے کر اسی وقت پھاڑ
ڈالا اور فرمایا کیا میں تمہارے لئے یہ کرتا تھا۔ میرے نزدیک تو مسئلہ یونہی تھا
اس لئے میں لوگوں کو ہنگامہ سے منع کرتا تھا۔[1]

مندرجہ بالا مثالوں میں سے اوّل الذکر دو مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن
لوگوں کو صداقت کا اس درجہ خیال تھا کہ جان بچانے کے لئے بھی جھوٹ بولنے
پر آمادہ نہ ہوتے تھے اور تیسرا واقعہ ہمارے سامنے استغنا کی اعلیٰ مثال پیش کرتا
ہے اور بتاتا ہے کہ اس زمانہ کے مسلمان حکومت کی تائید جاگیروں و خطابوں یا کسی
دوسری قسم کی جاہ طلبی کی ہوس میں نہ کرتے تھے بلکہ وہ اپنے یقین اور ضمیر کی
رہنمائی سے بلا کسی معاوضہ کے کرتے تھے۔ یہ چند واقعات مشتے نمونہ از خروارے
لکھے گئے ہیں جن سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ سلطنت جانے کے بعد
مسلمان اخلاقاً اور مذہباً بالکل برباد ہو گئے تھے۔ دراصل مسلمانوں کی اخلاقی
بربادی کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے کہ بار بار انہیں قومی
زوال کا مرثیہ سنایا گیا۔ جس سے اُن کے دلوں پر مایوسی طاری ہوئی اور اُن کے

---

[1] ارواح ثلاثہ مرتبہ مولوی محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ص ۲۰۲

قوتیں مضمحل ہو گئے۔

مسلمانوں کی تمدنی اور اخلاقی حالت کے تذکرہ کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ زمانۂ سابق میں اُن کی تعلیم کی کیا نوعیت تھی۔

فصل دوم

مسلمانوں کی قدیم تعلیم

نظامِ تعلیم اصلاحِ معاشرت و مذہب کے بعد ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ کمپنی کی عملداری شروع ہونے کے وقت مسلمانوں کا قدیم طریقۂ تعلیم کیا تھا۔ اس زمانہ میں کیفیت یہ تھی کہ والیانِ ملک اور اُمرا تعلیم کی پوری سرپرستی کرتے تھے۔ اس کے لئے جاگیریں دیتے و جائیدادیں وقف کرتے تھے، مدرسوں درس گاہوں پر روپیہ صرف کرتے تھے۔ دہلی کی مرکزی حکومت ٹوٹ جانے پر بھی صرف ضلع روہیل کھنڈ میں جو دہلی سے قریب تر تھے، پانچ ہزار علماء مختلف مدرسوں میں درس دیتے تھے اور حافظ الملک کی ریاست سے تنخواہیں پاتے تھے۔[1] یہی حالت اودھ اور حیدرآباد دکن اور دوسری ریاستوں کی بھی کی تھی اور کم و بیش اب تک ہے۔

گر حکومت اور والیانِ ملک کی مددوں سے قطع نظر کی جائے تب بھی تمام ملک میں خود رعایا کی طرف سے ایک نظامِ تعلیم قائم تھا جس کی کیفیت نواب نصیر یار جنگ بہادر کی حسبِ ذیل تحریر سے ظاہر ہوتی ہے:

"اس وقت قصبات کا ایک عظیم الشان نظام تمام سلطنت میں قائم تھا۔ یہ قصبات زندگی کے سرچشمے تھے۔ جن سے شہر خوشحال اور سلطنت سیراب و شاداب رہتے۔ شہری آب و ہوا دو تین نسلوں کے بعد خون کو

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں، رشید خاں صاحب بریلوی بی۔ اے علیگ ص ۲۴۲

سست و پست کر دیتی تو تنہا چند اہلِ کمال تازہ زندگی دے کر پہنچتے اور بزمِ حیات کو از سرِ نو پر رونق و معمور فرما دیتے تھے دہلی مرحوم میں شاہ صاحب کا اور لکھنؤ میں فرنگی محل کا خاندان انھوں میں دو مثالیں ہیں؎

اس زمانہ میں بعض اصحاب کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کی سلطنت جانے کے ساتھ ہی علومِ اسلام اور علومِ اسلامی کا زوال ہو گیا تھا۔ حالانکہ واقعات اس کے خلاف ہیں۔ مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کی ابتدا اورنگ زیب کے انتقال سے شمار کی جاتی ہے مگر یہی وہ زمانہ ہے جب کہ ہندوستان میں دو بڑی درسگاہوں کی بنیادیں پڑیں اور ان میں علومِ مشرقی و مذہبی کی کثیر اشاعت ہوئی۔ ذیل میں ان درسگاہوں کے مختصر حالات لکھے جاتے ہیں:

علمائے فرنگی محل لکھنؤ

اس خاندان کے بانی و مورث ملا قطب الدین سہالوی معروف بہ قطب شہید تھے۔ ان کے بیٹے ملا سعد نے حضرت اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہو کر لکھنؤ میں رہنے کے لئے فرنگی محل حاصل کیا۔ جو کسی زمانہ میں فرانسیسیوں کے رہنے کی کوٹھی تھی وہاں یہ خاندان [illegible] میں جس کو یہ ڈھائی سو سال ہوتے ہیں اپنے قصبہ سہالی سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ ملا قطب شہید کے چاروں صاحبزادوں میں سب سے زیادہ قابل مولوی نظام الدین تھے جن کے نام پر فرنگی محل کا مشہور مدرسہ نظامیہ قائم ہوا اور جو اب تک خدا کے فضل سے تشنگانِ علم کو سیراب کر رہا ہے۔ آپ ہی نے عربی تعلیم کا ایک مکمل نصاب مرتب کیا تھا جو درسِ نظامی کے نام سے مشہور ہے اور اب تک عربی مدارس میں رائج اور مقبول ہے۔ ملا نظام الدین کے

؎ استاذ عماد الملک نواب صدر یار جنگ بہادر رئیس حبیب گنج علی گڑھ آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ص ۱

ایک نہایت قابل فرزند مولانا سید عبدالعلی بحرالعلوم تھے جنہوں نے مدراس میں قیام کرکے اپنی علمی تصانیف و درس و تدریس سے تمام ہندوستان کو مستفید کیا۔ پچھلے دنوں اسی خاندان میں مولوی عبدالحی صاحب یکتائے روزگار ہوئے جنہوں نے صرف انتالیس سال کی عمر پائی اور اس مدت میں مختلف علوم و فنون پر ایک سو پچاس اعلیٰ درجہ کی کتابیں تصنیف کیں۔ اسی قسم کے پرانے مدارس بریلی، بدایوان اور دیگر مقامات میں تھے۔

علمائے دہلی

علم کا دوسرا مرکز دہلی تھا۔ جہاں پر پچھلے زمانہ میں شاہ عبدالرحیم صاحب کی اولاد نے علم کی بڑی خدمات انجام دیں۔ بقول مولانا محمد میاں صاحب علومی ادیب مدرسہ شاہی مرادآباد و مصنف "علمائے ہند کا شاندار ماضی"

"قدرت کا کس قدر عجیب کرشمہ ہے کہ جس طرح اورنگ زیب کی حکومت کے دامن میں سلطنت مغلیہ کا زوال پوشیدہ ہے اسی طرح اس دامن کا آخری کنارہ اس مقدس مجددِ ملت وارث انبیاء علیہم السلام کی دولت کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے جو آئندہ تمام علمی شاخوں کے لئے اصل اصول ہے۔ یہی مجددِ ملت ہیں جو علمائے ہند کے ہر سلسلہ حدیث و تفسیر کے مرکز ہیں"

یہ مقدس ہستی شاہ ولی اللہ کی تھی جو ۱۱۱۴ھ میں اورنگ زیب کے انتقال سے چار سال قبل عالم وجود میں آئی۔ اس آخر زمانہ میں مسلمانوں کی انتہائی خوش نصیبی تھی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے بھی مثل آفتاب و ماہتاب، ستاروں اور سیاروں کے درخشاں اور تاباں ہوئے۔ چنانچہ سب سے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحب آفتابِ ہند کے لقب سے مشہور ہوئے۔ دیگر صاحبزادگان کے نام گرامی شاہ رفیع الدین و شاہ عبدالغنی ہیں جنہوں نے علوم کی روشنی سے ہندوستان کو منور کیا۔ اور سب سے اول قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں کیا جو اس وقت تک نہایت ہی [illegible]

۱۸۵۷ء میں مفتی صاحب کا تقرر صدر اعلیٰ کے عہدہ پر ہوا مگر قبل اس کے کہ جدید
عہدہ کا کام شروع کریں ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ ہو گیا جس میں آپ پر بغاوت کا الزام
قائم ہوا اور آپ جزیرہ انڈمان بھیج دیئے گئے وہاں مولوی فضل حق خیرآبادی، مفتی مظہر
اور دوسرے علماء بھی جمع ہو گئے تھے۔ جن کی برکت سے وہ جزیرہ دارالعلوم بن گیا۔
اور وہاں تصنیف و تالیف کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ جو کتابیں کہ وہاں تصنیف ہوئیں وہ زبانی
حافظہ سے لکھی گئیں مگر بڑی حرکۃ الآراء تصانیف تھیں اور ہندوستان آنے پر جب ان
کا مقابلہ حدیث کی کتابوں سے کیا گیا تو ان کی یاد کی صحت ثابت ہوئی۔ ایک انگریز کی
فرمائش پر مفتی صاحب نے تقویم البلدان کا ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ ہی ان کی انڈمان کی قید
سے رہائی کا باعث ہوا[1]۔ معلوم ہوا کہ جزیرہ انڈمان ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے قیدیوں کے لئے
قائم کیا گیا تھا اور اسے اول علماء ہند ہی نے اپنے بابرکت قدم سے شرف اندوز
کیا تھا۔

طلباء کی معاشرت

طلباء کی معاشرت حد درجہ سادہ تھی اور وہی زندگی [illegible] تھی اور جو طلباء اپنے گھروں سے خوش حال ہوتے تھے
وہ بھی غریبانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے کیونکہ انہیں بتایا جاتا تھا کہ:

> معیشت کی تنگی سے طلب میں فراخی حاصل ہوتی ہے اور تھوڑی حاجت
> روزی سب سے بڑا سبب اطمینان خاطر کا ہوتا ہے۔ امام شافعی کا
> قول ہے کہ سولہ برس میں نے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا۔ ہر طالب کو
> اہتمام ہر حال میں رکھے، لباس میں، مسکن میں، کھانے میں، پینے میں
> ان کے حلال اور جائز ہونے کی کوشش کرے، اس سے قلب میں روشنی

---

[1] دستاویز نمبر ۲ از [illegible] حدائق حنفیہ ص۔

کے ساتھ اس بنا پر مخالفت کی کہ:

"ایک مذہب کے قائم ہو جانے سے انسانوں کے مقاصد متحد ہو جاتے ہیں اور اگر یہ ہو گیا تو ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لوگوں کو اپنے مذہب میں لانے کا اصول اس اٹھارہویں صدی میں خلاف مصلحت ہے اگر چند لاکھ عیسائی بھی وہاں ہو گئے تو اس سے سخت مصیبت آ جائے گی۔ امریکہ میں درسگاہیں اور کالج قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی طرح جب نوجوان پادری ہندوستان میں پھیلیں گے تو کمپنی کے فوائد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جس ہندوستانی کو تعلیم حاصل کرنی ہو وہ انگلستان چلا آئے"

غرضکہ مالکان کمپنی کی مخالفت سے تعلیم کا رزولیوشن پارلیمنٹ میں نامنظور ہو گیا بعض مصنفین کا خیال ہے کہ یورپ کی دوسری کمپنیوں کے مقابلہ میں جو ہندوستان میں مذہبی اشاعت کرتی تھیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کی غیر جانبدارانہ پالیسی پسند کی گئی۔ اس لئے وہ ہندوستان میں اپنی عملداری قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔

انگریزی تعلیم کا مقصد ابتداء میں مگر اس کے ساتھ انگریزوں میں سے جو لوگ اشاعت تعلیم کے موافق تھے وہ مسٹر ولبر فورس کے رزولیوشن کے خارج ہونے سے ہمت نہیں ہارے چنانچہ آنریبل مسٹر چارلس گرانٹ ڈائرکٹر کمپنی نے ۱۷۹۲ء سے اجرائے تعلیم کی تائید میں ایک رسالہ لکھنا شروع کیا جو ۱۷۹۷ء میں جاکر ختم ہوا۔ اس کے حسب ذیل اقتباسات سے معلوم ہوگا کہ ان کا منشا اس ملک میں انگریزی جاری کرنے سے کیا تھا۔

تاریخ تعلیم از میجر باسو ص ۲۰۲

پادریوں کو مذہب اور تعلیم کی اشاعت کی ممانعت رہی البتہ ۱۷۹۹ء میں انگلستان سے
دو پادری ہندوستان آئے اور سیرامپور علاقہ ہالینڈ میں رہے تاکہ انگریزی علاقہ میں ان کی گرفت
نہ ہو سکے اور مسٹر کیری کے جو پہلے سے ہندوستان آئے ہوئے تھے شریک کار ہو کر
اپنا مذہبی کام کرتے رہے۔ ان اصحاب کی سرپرستی اُس زمانہ کے وائسرائے مارکوئس ولزلی بھی
فرماتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسٹر کیری کو فورٹ ولیم کے کالج میں سنسکرت کا پروفیسر
مقرر کر دیا۔ مختصر یہ کہ اصحاب نجی حیثیت پر مدارس قائم کر کے اپنے مشن کا کام کرتے
رہتے تھے۔

عہدہ داروں کے لئے کالج

البتہ مسٹر وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل نے مسلمانوں کی درخواست پر عربی و فارسی کی تعلیم کے لئے ۱۷۸۱ء
میں کالج قائم کیا جو اب تک کلکتہ مدرسہ کے نام سے جاری ہے اور اس کی نگرانی کے لئے
۱۷۹۱ء میں کپتان ارون کو سکریٹری مقرر کیا انہوں نے عربی و نصاب تعلیم پٹنہ کے
مطابق جاری کیا۔ جس میں مذہبی علوم کی جگہ علم ادب وغیرہ رکھ لیا تھا۔ اسی طرح سنسکرت کی تعلیم
کے لئے ۱۷۹۱ء میں سنسکرت کالج بنارس قائم کیا۔ ان دونوں کالجوں کے قیام کی غرض یہ
تھی کہ قانونی اور عدالتی خدمات کی انجام دہی کے لئے ہندو اور مسلمان تیار
کئے جائیں۔

اسی طرح انگریز عہدہ دار تیار کرنے کے لئے کلکتہ و مدراس میں کالج قائم کئے گئے
مگر اُن کے خرچ بہت زیادہ تھے۔ کلکتہ مدرسہ کی نسبت لکھا ہے کہ:

"ایک سو سے زیادہ طلبا کو تین تین سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ دیا جاتا تھا۔۱؎
۱۸۲۰ء میں کل خرچہ فی کس حساب طلبہ ۲۶۲ روپیہ سالانہ ہوتا تھا"

۱؎ تاریخ تعلیم از [illegible] ص ۲۲

تعلیمی کمیٹی کا قیام

بالآخر وہ وقت آیا کہ کمپنی نے اپنی تعلیمی ذمہ داری کو محسوس کیا اس کی صورت یہ ہوئی کہ لارڈ منٹو ویسرائے ہند نے ۱۸۱۱ء ایک طویل یادداشت لکھ کر کورٹ آف ڈائرکٹران کو بھیجی جس میں یہ دکھایا کہ علم کا روز بروز زوال ہو رہا ہے ہندو مسلمانوں کو مذہبی تعلیم نہ ہونے سے دروغ حلفی وہ جعلسازی کے جرائم بڑھ رہے ہیں اور سفارش کی کہ متعدد کالج قائم کئے جائیں اور تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے۔ یہ یادداشت جانے کے بعد ۱۸۱۱ء میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کے سامنے بہت بڑے انگریزوں کی شہادتیں ہوئیں اور ان شہادتوں میں پادریوں کی تعلیم سے مخالفت نہ کی گئی جتنی کی سرپرستی حکام سلطنت کی طرف سے کی جاتی تھی۔ اس کمیٹی کی سفارش پر پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس کیا گیا جس میں سب سے پہلی بار ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کا مسئلہ باقاعدہ پاس ہوا اور تعلیم کے لئے ایک لاکھ روپیہ سالانہ منظور ہوا۔ اس قانون کی بنا پر ۱۸۱۳ء میں ڈائرکٹران کمپنی کی طرف سے گورنر جنرل کے نام ایک مراسلہ جاری ہوا جس میں ہدایت کی کہ سنسکرت کی سرپرستی کی جائے اور ہندوؤں کے علوم کی ہمت افزائی کی جائے۔

یہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی حقیر رقم تھی جو کمپنی نے اپنی عملداری شروع ہونے کے پچاس سال بعد تعلیم پر صرف کی۔ لیکن منظوری کے بعد حکام وقت نے دس سال تک اس رقم کو استعمال نہیں کیا اور ۱۸۲۳ء میں جنرل کمیٹی پبلک انسٹرکشن اور جنرل ایف ورڈن نے ایک مفصل یادداشت گورنمنٹ میں پیش کی جس کا اقتباس یہ ہے:

"انصاف یہ ہے کہ ہم نے ہندیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف ان کی علمی ترقی کی

۱۔ انڈین ایجوکیشن ڈسپیچ ص ۵

ہمت افزائی کے لئے تمام ذرائع کو ہٹا لیا ہے بلکہ حالت یہ ہے کہ قوم
کے اصلی علوم بھی کم ہو جانے کا اندیشہ ہے اس الزام کو دور کرنے کے لئے
کچھ کرنا چاہیئے"

غالباً انہیں اصحاب کی تحریک پر ۱۸۲۳ء میں ایک لاکھ روپیہ کا مستقل خرچ شروع کیا۔
جس کی منظوری دس سال قبل ۱۸۱۳ء میں دی گئی تھی۔

پادریوں کا دور دورہ

۱۸۱۳ء کے مندرجہ بالا قانون کے اجراء سے کمپنی نے تو تعلیم کا انتظام برائے نام کیا۔ البتہ یورپ کے پادریوں کے لئے اس قانون کی رو سے اس پھاٹک کی ایک جھری کھل گئی جو ابتدائے عملداری سے پادریوں پر بالکل بند تھا۔ اب وہ لوگ رفتہ رفتہ ہندوستان میں داخل ہو کر جگہ جگہ انگریزی مدرس قائم کرنے لگے اور اس طرح انہوں نے مسٹر ولبرفورس اور مسٹر چارلس گرانٹ کے منصوبوں اور مذہبی اشاعت کے پروگرام کو پورا کرنا شروع کیا۔ اس زمانہ میں راجہ رام موہن رائے کلکتہ کے ایک بڑے آدمی تھے اور مذہب کے اعتبار سے بالکل غیر متعصب تھے انہوں نے اسلام اور مذہب عیسوی کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ اور خود عیسائیوں کے گرجا میں جا کر ان کی عبادت میں شریک ہوتے تھے۔ راجہ صاحب کو ایک وسیع الخیال شخص اور کلکتہ کے ایک گھڑی ساز مسٹر ڈیوڈ ہیر نے ایک انگریزی کالج جاری کرنے کا منصوبہ قائم کر کے اپنا ہم خیال بنا لیا۔ وہ بنگال کے چیف جسٹس سر ہائیڈ ایسٹ کے پاس ان کو اپنے ساتھ لے گئے اور ان کی مدد سے ۱۸۱۷ء میں کلکتہ میں یہ پہلا انگریزی کالج قائم کیا۔ جس کا نام "ہندو کالج" رکھا گیا اور جو "ودیالہ" کہلایا جاتا تھا۔

راجہ صاحب کی نسبت تحریر ہے کہ ہندوؤں کے خوف سے انہوں نے اپنے کو کالج کے انتظامات سے علیحدہ رکھا مگر اس میں کام بہت کیا۔

لہ سوشل ریفارم موومنٹ۔ ے ایڈیشن انگریزی

اسی طرح پادری کیری صاحب نے ۱۸۱۹ء میں بنارس میں عیسائیوں کا جے نرائن کالج قائم کیا۔ ان کالجوں کو دیکھ کر ۱۸۲۱ء میں پونا میں ہندو کالج قائم کیا گیا۔ ۱۸۲۳ء میں آگرہ کالج قائم ہوا اور ۱۸۲۹ء میں کلکتہ مدرسہ، کلکتہ سنسکرت کالج اور آگرہ کالج میں انگریزی کلاسوں کا نفاذ کر دیا گیا۔

اس کے بعد کمپنی کی اس پالیسی کا اعلان کہ انگریزی زبان رفتہ رفتہ سرکاری محکمہ جات میں جاری کر دی جائے، سب سے پہلی بار کورٹ آف ڈائرکٹرز کمپنی کے مراسلہ ۲۹، دسمبر ۱۸۳۰ء کی رو سے کیا گیا۔

طلباء کے عقائد میں تبدیلی پر سررشتۂ تعلیم کی مسرت

اب دیکھنا یہ ہے کہ تعلیم کا اثر طلبہ کے عقائد پر کہاں تک ہوا، اس کا اندازہ سرکاری تعلیمی کمیٹی کی رپورٹ سے ہوگا جو دسمبر ۱۸۲۳ء میں قائم ہوئی تھی اس کی ہشت سالہ رپورٹ کا جو دسمبر ۱۸۳۱ء میں شائع ہوئی حسب ذیل حصہ قابل ملاحظہ ہے:

"ہندو کالج کی حوصلہ افزائی کی طرف توجہ کرنا اس تعلیمی کمیٹی کے خاص مقصد میں شامل رہا ہے۔ اس سے جو نتائج حاصل ہوئے وہ امید سے زیادہ ہیں۔ زبان انگریزی کی واقفیت میں ترقی کے ساتھ اخلاقی اثرات بھی نمایاں ہوئے اور اپنے خاندان اور تعلیمات کی بہت سے نوجوانوں میں ہندو مذہب کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لئے بے چینی اور اپنے رسوم کی طرف سے بے اعتقادی کا رجحان ظاہر کیا جا رہا ہے اور غالباً دوسری نسل میں کلکتہ کے ہندوؤں کے خیالات اور احساسات میں بڑی مادی تبدیلی ہو جائے گی۔"

سی ٹریولین۔ تعلیم ہندوستان صفحہ ۹۳

یہ مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم سے متعلق
ہماری تجویز پر عملدرآمد ہو تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی
باقی نہ رہے گا۔"[1]

بہرحال لارڈ میکالے کے مندرجہ بالا فیصلہ کے بعد سے انگریزی زبان کا دور دورہ شروع
ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں مرکزی گورنمنٹ نے صوبوں کی گورنمنٹوں کو اجازت دی کہ بجائے فارسی زبان کے
جو اس وقت تک سرکاری دفتر کی زبان تھی، اپنے اپنے صوبہ کی زبان جاری کریں۔ اس کے
بعد ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے نے ریزولیوشن کے عنوان سے جاری کیا کہ
اب ملازمتوں میں انگریزی تعلیم یافتوں کو ترجیح دی جائے گی۔

مروجہ تعلیم کے خلاف احتجاج

مندرجہ بالا واقعات سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ انگریزی کی جو تحریک بڑی شان سے
شروع کی گئی تھی لارڈ آکلینڈ نے ۱۸۳۹ء میں وائسرائے نے مندرجہ بالا حکم سے بوکھلا کر اس کی
نسبت حمایت کی روش سے جس میں صاف ہی شائع کئے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ انگریزی کو ذریعہ
ملازمت قرار دیا جائے یا اسے اہمیت نہ دی جائے البتہ انگریزی کی مخالفت اس
بنا پر ضرور کی گئی تھی کہ اس کو مذہب عیسوی کی اشاعت کا ذریعہ بنایا جاتا تھا۔ اس بارہ میں
سب سے پہلا احتجاج مسلمانان کلکتہ نے آٹھ ہزار دستخطوں سے کیا جبکہ گورنر جنرل
وائسرائے کی طرف سے ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کے مراسلہ کے ذریعہ یہ حکم دیا گیا کہ تعلیمی اور
وظائف کا کل روپیہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف کیا جائے جس کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں
کو جو کچھ روپیہ کلکتہ مدرسہ میں عربی تعلیم کے وظائف کی شکل میں ملا کرتا تھا وہ اس سے بھی
محروم کر دیئے گئے۔ اس کے ساتھ ۱۸۳۹ء میں ہندوؤں نے بھی اس امر کا شکوہ کیا کہ

---

[1] تاریخ التعلیم از میجر باسو ص ۱۰۵

دو وجہ تعلیم کا اثر براہ راست ان کے مذہب پر پڑتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۴۶ء میں سر رشتۂ تعلیم مدراس نے یہ تجویز کیا کہ گورنمنٹ اسکولوں میں انجیل بطور اختیاری مضمون کے پڑھائی جائے۔ مارکوئیس آف ٹویڈل گورنر مدراس نے اس کی تائید میں بہت سے دلائل دیئے اور کہا:

> "رفتہ رفتہ کل لڑکے انجیل کے اختیاری مضمون کو پڑھنے لگیں گے جس سے ان میں اخلاقی ترقی ہوگی۔ سرکاری ملازمت کے لئے ضرورت ہے کہ بہ نسبت ہندو یا مسلمانوں کے مذہب کے، اخلاق کو زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جائے۔"

مگر کورٹ آف ڈائرکٹران نے ۲۳ مارچ ۱۸۴۷ء کو اسکولوں میں انجیل پڑھانے کی تجویز نامنظور کردی باوجود اس حکم کے مدراس کے افسران زیادہ تر روپیہ عیسائی اسکولوں کو دیتے تھے اور جن مقامات میں عیسائی اسکول تھے وہاں کوئی اور اسکول قائم نہ کرنے دیتے تھے۔ اس پر باشندگان مدراس نے جن میں ہر مذہب کے لوگ شریک تھے ۱۸۵۲ء میں پارلیمنٹ کی خدمت میں گورنمنٹ صوبہ مدراس کے خلاف ایک عرضداشت کے ذریعہ سخت احتجاج کیا اور اس میں لکھا کہ سرکاری روپیہ عیسائیت پھیلانے میں صرف کیا جاتا ہے اس شکایت پر حکومت کی طرف سے تعلیم کے بارہ میں غیر جانبداری کا اعلان کیا گیا۔

سرکاری کالجوں کا اثر مذہب پر

مگر باوجود غیر جانبداری کے اعلانات کے دیکھنا یہ ہے کہ جو کالج خالص دنیوی تعلیم کے لئے قائم کئے گئے تھے ان میں تعلیم پانے والوں کے مذہب پر کس قسم کے اثرات پڑتے تھے۔ اس کا پتہ سر چارلس ٹریویلین، آئی سی ایس کی شہادت سے چلتا ہے جو انہوں نے ۲۸ جون ۱۸۵۳ء کو دار الامراء کے سامنے دی تھی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

کونسل کا ممبر تھا اور جو ترقی کر کے گورنری کے عہدہ پر پہنچ گیا تھا۔ اور جو باوجود گورنمنٹ کی
طرف سے مذہبی غیر جانبداری کے اعلان کے عیسائیت کی توسیع کے متعلق بڑی خوشگوار
توقعات رکھتا تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں مذہبی تعلیم کی غیر جانبداری
کے فی الواقع کیا معنی تھے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ملک کی درسگاہوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں
کے مذہب کی کوئی تعلیم نہ ہو اور اول تو براہ راست ورنہ بالواسطہ مذہب عیسوی کی تعلیم
ہوا کرے۔

حکام کے مذہبی غلو کے نتائج بد

چنانچہ باوجود گورنمنٹ کے نامی حکام کے
مذہب عیسوی کی اشاعت و تبلیغ اور مذہب
میں مداخلت کا سلسلہ بڑھتا رہا جس سے رعایا کے دلوں میں حد درجہ کی بدگمانیاں پیدا ہوئیں
اس کا ظہور پہلی بار ۱۸۰۶ء میں مقام ویلور صوبہ مدراس میں ہوا جب کہ فوج کے سپاہیوں
کو حکم دیا گیا کہ وہ پیشانی پر کوئی نشان نہ لگائیں۔ کانوں میں کچھ نہ پہنیں اور ڈاڑھیاں منڈائیں
جس کی وجہ سے سپاہیوں نے بغاوت[1] کی تھی۔ دوسری بار بارکپور میں اور تیسری بار ۱۸۵۷ء
میں جب کہ سپاہیوں نے چربی کے کارتوسوں کو دانت سے توڑنے سے انکار کیا۔
ملک میں ہنگامہ ہوا جس کے اسباب سرسید احمد خاں کے خط میں باب دوم کی فصل دوم
میں دیئے گئے ہیں۔

یونیورسٹیوں کا قیام

حکام کے مذہبی رجحانات کے خوف شورش ہوتے ہوتے
بالآخر وہ وقت آیا کہ سررشتہ تعلیم مذہب عیسوی کی اشاعت
کے کام سے پاک ہوا۔ ۱۸۵۴ء وہ سال تھا جب کہ حکومت نے رعایا کے لئے ابتدائی
سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک انتظام کرنے کا اصول تسلیم کر لیا اور اس کے لئے ایک طویل اسکیم

---

[1] تاریخ میجر باسو ص ۱۲۰

شائع کی جس کی رُو سے ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں جدا جدا یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ یونیورسٹیوں کی تحریک اگرچہ کمپنی کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی مگر اس کا نشوونما تاجِ برطانیہ کے سایہ میں ہوا اور انہوں نے ملک میں ہزاروں گریجویٹ پیدا کر دیئے۔ ابتدا میں تو انہیں خوب ملازمتیں ملیں مگر چونکہ بڑے عہدے ہندوستانیوں کے لئے بند تھے اور انگریزی تعلیم یافتوں کو بجز ملازمت، وکالت، اخبار نویسی وغیرہ کے اور کام نہ آتا تھا، اس لئے گریجویٹوں کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ملک میں حکومت پر نکتہ چینیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۷۹۲ء میں مسٹر چارلس گرانٹ نے ہندوؤں کی نسبت یہ پیشین گوئی کی تھی کہ وہ اس قدر کمزور دل ہیں کہ ان میں سیاسی آزادی حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہونے کی ہرگز امید نہیں۔ اس لئے انہیں انگریزی کی تعلیم دی جائے۔ مگر اس کے بہتر سال بعد ۱۸۷۰ء میں لارڈ میو نے یہ محسوس کیا کہ حکومت کا کثیر روپیہ خرچ کر کے تھوڑے سے بنگالیوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اور کہا کہ اب تک ہم نے عوام الناس کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی یہ بابو لوگ انہیں نہ پڑھائیں گے۔ اس لئے اب ہمیں چاہیئے کہ عوام کی ابتدائی تعلیم کا انتظام کریں۔[۱]

اس وقت سے گورنمنٹ اعلیٰ تعلیم کو کم کرنے کے حیلے ڈھونڈا کرتی تھی اور کبھی ابتدائی تعلیم کو ترقی دینے اور کبھی علوم مشرقی کے کالج قائم کرنے کی تدبیریں کیا کرتی تھی۔ اس بارہ میں سر سید احمد خان کی تحریر قابلِ ملاحظہ ہے جو انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی قائم ہونے کے وقت ۱۸۸۷ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کی تھی وہ یہ ہے:

افسوس کہ لوگوں میں یہ خیال زیادہ پختہ ہوتا جاتا ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی کی بھی وہی حالت ہوگی جو پنجاب یونیورسٹی کی تھی۔

۱؎ ہندوستان برطانیہ کے عہد میں [illegible]

یعنی علوم مشرقی کا دشمن گردانے کر انگلش ہائی ایجوکیشن کو گویا وہ ہندوستان
دنیا کی آنکھیں بند کرنے ان کو ایک پردہ ڈالا۔ لہٰذا بے شک یہ
مہذب گورنمنٹ کو ایسا ہی کرنا چاہئے۔ ہندوستانیوں کو اس بات کا شبہ
ہے کہ گورنمنٹ نے انگلش ہائی ایجوکیشن کے معدوم کرنے کی پالیسی قرار
دی ہے یہ شبہ لارڈ میو کے زمانہ سے پیدا ہوا تھا لارڈ لٹن کے زمانہ
میں اس شبہ کو تقویت ہوئی اور لارڈ آف رپن کے زمانہ میں یہ شبہ بہت
زیادہ قوی ہو گیا۔ گو ہز اکسیلنسی نے اس سے انکار کیا مگر چونکہ قول کی نسبت
عمل بہت زیادہ یقین دلانے والا ہوتا ہے۔ اس لئے ہندوستانیوں کے دل
میں جو شبہ پیدا ہوا تھا وہ رفع نہیں ہوا۔ اسی زمانہ میں منحوس پنجاب یونیورسٹی
قائم ہوئی جو ہم کو بدبخت زمانہ لارڈ لٹن کے عہد حکومت میں نظر آیا۔ اور
ہم کو اندیشہ ہوا کہ جو آفت پنجاب پر آئی وہی ہمارے صوبے پر آنے
والی ہے۔

بلاشبہ گورنمنٹ کی یہ عادت ہے کہ جو پالیسی وہ اختیار کرتی ہے اس کو
بمشکل چھوڑتی ہے وہ جانتی ہے کہ میں غلطی کرتی ہوں۔ اس کا نتیجہ اس کو
بتلاتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ جن کو خدا نے اس کے بہتر دیکھنے کا سلوک کی
ہے مگر وہ اپنے کانشنس کو ان خوشامدیوں کی باتوں سے جو خلاف اپنے
کانشنس کے گورنمنٹ کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں اور نادان رئیسوں اور امرا
کی باتوں سے جو چند القاب یا خطابات یا دربار میں کرسی کے اول یا دوم نمبر ملنے
پر اپنی عزت کا مدار سمجھتے ہیں، اور ہندوستانی عہدہ داروں کی رایوں سے
جنہوں نے بجز کرسیوں اور سول یونیفارم کے تعلیم کے معاملہ میں ایک منٹ
بھی غور کرنے میں اپنی زندگی کو صرف نہیں کیا، ان متعصب ہندوؤں اور

ہندوؤں کی باتوں سے جو انگریزوں کی ہر ایک چیز سے دلی نفرت رکھتے
ہیں، اپنے کانشنس کو ٹھنڈا کر لیتی ہے۔ مگر یہ اصلی ٹھنڈک نہیں ہے بلکہ صرف
مصنوعی ٹھنڈک ہے جس سے اچھے اثر کی کبھی توقع نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر گورنمنٹ الہ آباد یونیورسٹی کو پنجاب یونیورسٹی کی مانند بنائے تو
ہمیں کیا کرنا چاہیئے جواب یہ ہے کہ استقلال! استقلال! استقلال! ہمت!
ہمت! ہمت! کوشش! کوشش! کوشش! ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ
پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ اور خود اپنے لئے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل
کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اگر ہم میں سلف ریسپکٹ کا کچھ اثر
باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں
پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رایوں پر اختیار نہیں ہے؛

اسی طرح سرسید نے دوسرے مضمون مورخہ ۵ رجون ۱۸۸۲ء میں کہا تھا:

”ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ملک کے حکمران اس بات کے نہایت
خواہشمند تھے کہ ہندوستان کے رہنے والے انگریزی زبان اور انگریزی
علوم و فنون سیکھنے پر آمادہ ہوں اور اب یہ زمانہ ہے کہ اس کے برخلاف
خفیہ اور علانیہ تدبیر ہوتی ہے کہ ہندوستانیوں کو انگلش ہائی ایجوکیشن سے
محروم کیا جائے اور اس پالیسی کی تبدیلی کے وجوہ خواہ صحیح ہوں یا غلط
ہندوستانی یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدا میں تمام انگریزوں اور تمام مشنری سوسائٹیوں
کو یقین تھا کہ انگریزی تعلیم سے تمام ہندوستان یا اس کا بڑا حصہ عیسائی
ہو جائے گا اور نیز گورنمنٹ کو اپنے دفتر کے کاروبار کے لئے
انگریزی خوانوں کی ضرورت تھی مگر اس تعلیم سے مشنری سوسائٹیوں کا مقصد
حاصل نہ ہوا بلکہ اس کے خلاف ظہور میں آیا اس لئے مشنری سوسائٹیاں دل

ہائی انگلش ایجوکیشن کے برخلاف آمادہ ہوئیں اور گورنمنٹ کو یہ سبق پڑھایا
کہ اس کا کام عام تعلیم پھیلانے کا ہے نہ کہ ہائی ایجوکیشن میں روپیہ صرف
کرنے کا۔ ہندوستان کے حاکم جو بجائے کشادہ دل حاکم ہونے کے
زیادہ تر مشنری اوصاف سے متصف تھے مشنریوں کی تائید پر آمادہ ہو گئے
اور انگلش ہائی ایجوکیشن کی مخالفت اختیار کی اور جو حاکم درحقیقت کشادہ دل
تھے ان کو یہ غلط خیال پیدا ہوا کہ ہندوستانیوں کو ایجوکیشن کی تعلیم دینا خود
گورنمنٹ کو اپنے ایک مخالف گروہ کا پیدا کرنا ہے۔ [illegible] ہندوستانی
یقین کرتے ہیں کہ گورنمنٹ نے ہائی ایجوکیشن برباد کرنے کی پالیسی اختیار
کی ہے اور اس پالیسی کو مختلف حیلوں سے چھپاتی ہے اور اس پالیسی کے
عملدرآمد کرنے کے لئے ایک بڑا حیلہ علوم مشرقی کے ساتھ ہمدردی ظاہر
کرنے کا اختیار کیا ہے۔"

سرسید کی ان تحریرات کے سولہ سال بعد ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے ایک تعلیمی کمیشن
بٹھایا جس کی رو سے اعلیٰ تعلیم کے اخراجات بڑھا دیئے گئے اور ایسی بندشیں لگائیں
جن سے پرائیویٹ کالج زیادہ تعداد میں قائم نہ ہو سکیں۔ اس پر ملک میں بہت چیخ و
پکار ہوئی اسی طرح آگے چل کر اعلیٰ تعلیم کے بارہ میں حکومت کی پالیسی بدلتی رہی حتیٰ کہ
ہر صوبہ میں جدا جدا یونیورسٹیاں قائم ہوئیں اور صوبہ متحدہ میں پانچ یونیورسٹیاں جاری ہو
گئیں اور آخر وہ وقت آگیا کہ ہندوستان کے لوگ اس اعلیٰ تعلیم سے اس درجہ بیزار
ہو گئے کہ اب مشکل سے کسی یونیورسٹی کے تقسیم انعام کا جلسہ ایسا ہوتا ہوگا جس میں
یونیورسٹی کے طریقۂ تعلیم کی کامل مذمت نہ کی جاتی ہو اور اس کی اصلاح کے لئے
تجاویز پیش نہ کی جاتی ہوں۔

اسی طرح اسمبلیوں کے سوالوں میں یونیورسٹی کی تعلیم کی مذمت کی جاتی ہے۔

چنانچہ صوبۂ متحدہ کی اسمبلی کے ستمبر ۱۹۲۷ء کے اجلاس میں کہا گیا کہ یونیورسٹی کی تعلیم طلباء کو عیش پرست بناتی ہے۔ یہ انہیں ہر پیشہ سے متنفر کر دیتی ہے اور زندگی کی کشاکش کے لئے تیار نہیں کرتی۔ زمانۂ سابق کی تعلیم مرادف تھی ایثار اور نفس کشی کی۔ جدید تعلیم مرادف ہے نفس پرستی کی۔ اس کا نصاب ایسا بنایا جاتا ہے جس سے اپنے ملک کی ہمدردی پیدا نہ ہونے پائے وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ اب وقت آگیا ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم ملک کی ضروریات کے مطابق بنائی جائے۔ چنانچہ بعض صوبجات کی گورنمنٹوں نے اس بارہ میں تحقیقاتی کمیشن بٹھائے۔

دہلی کالج

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیسی زبان میں تعلیم کی نسبت مختصر طور پر لکھا جائے۔

۱۹۲۹ء میں حکومت کی طرف سے انگریزی علوم جدیدہ کی کتابوں کے ترجمے اردو میں کئے جانے کا سلسلہ جاری کیا گیا اور یہ ترجمے دہلی کالج میں جو ۱۹۲۹ء میں قائم کیا تھا پڑھائے گئے۔ ۱۸۵۲ء میں اس کے پرنسپل مسٹر کارگل نے اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا :

"مشرقی شعبہ کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے"

جو لڑکے اسی کالج میں انگریزی پڑھتے تھے ان کے مقابلہ میں اردو زبان میں مختلف علوم پڑھنے والے زیادہ قابل ہوتے تھے۔ اسی طرح ۱۸۴۳ء میں گورنمنٹ صوبۂ متحدہ کی تعلیمی رپورٹ میں تحریر کیا گیا :

"اردو کے ذریعہ سے دہلی کالج میں جو سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے مسٹر ڈرٹ

لے سہ ماہی اردو جنوری ۱۹۳۳ء ص ۲۵

نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ "بڑا راز ایسی تعلیم کی جو اس ذریعہ سے دی جاتی

ہے اور خاص کر سائنس کی تعلیم کی بہت قدر کرتے ہیں۔"[۱]

اس کالج کا ایک بار نہایت قابل فوجی افسروں اور مشنریوں نے جو تعلیمی مسائل کے

ماہر تھے معائنہ کیا اور طلبہ کا امتحان لیا۔ اُن کی رائے یہ تھی:

"تمام ہندوستان میں کسی جگہ ترقی کے ایسے آثار نظر نہیں آتے جیسے

کہ یہاں نظر آتے ہیں۔"

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ علوم جدیدہ کی تعلیم دیسی زبان کی وساطت

سے اُس وقت کامیاب ثابت ہوئی تھی اور اُس سے بڑے بڑے قابل لوگ تیار ہو کر

نکلتے تھے جن میں سے مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

یہ کالج ۱۸۵۷ء تک اعلیٰ پیمانہ پر چلا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں برباد ہو گیا۔ اور پھر زندہ

ہو کر ۱۸۷۷ء تک کمزور حالت میں چلتا رہا۔ بالآخر پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ

ملحق کر دیا گیا۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

مگر دیسی زبان میں علوم جدیدہ کی تعلیم دینے کا بہترین تجربہ حال میں جامعہ عثمانیہ میں کیا گیا ہے جس کی

تحریک رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نے ۱۹۱۷ء میں کی اور تکمیل سید راس مسعود نے

۱۹۱۸ء سے شروع کی جب کہ یونیورسٹی قائم کی گئی۔

دیسی زبان کے مدرسے

اس تعلیم کے علاوہ اب ابتدائی تعلیم کا کچھ مختصر حال لکھا جاتا ہے۔ زمانہ سابق میں جو مکاتب و مدارس

جاری تھے ان کو مقامی لوگوں اور اوقاف کے علاوہ والیان ملک سے بھی مالی امداد ملتی

۱؎ رسالہ اردو جنوری ۱۹۲۳ء ص ۲۷

ان دیسی مدارس کی بے تعلقی کے نقصانات کو ہندوستانی مدتوں سے محسوس کر رہے ہیں اور یہ اُن کی ایک مستقل شکایت ہے جو گورنمنٹ کے سامنے پیش کی جاتی رہی ہے سب سے بڑا نقص اس طریقۂ تعلیم میں یہ ہے کہ اس نے پرائیویٹ کوششوں کو معطل و بیکار کر کے اپنا نظام تعلیم ایسا رکھا کہ وہ رعایا کی تعلیم کے لئے کافی نہیں ہوتا۔

اعلیٰ ثانوی اور ابتدائی تعلیم کے حالات کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں نے اُس سے کہاں تک فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کو جدید تعلیم سے فائدہ اُٹھانے کا کہاں تک موقع دیا گیا اس کا تذکرہ آئندہ فصل میں کیا گیا ہے۔
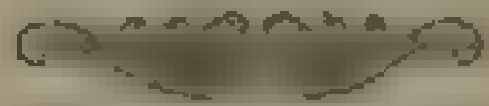
فصل چہارم

سرکاری تعلیم اور ملازمت میں مسلمانوں کی پسماندگی

مسلمانوں کی نسبت سلطنت کی پالیسی

اس ملک میں قدیم سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ جنگ میں جو شخص بھی کامیاب ہوتا اس کی اطاعت عوام الناس بے چون و چرا کرتے اور بالعموم اس کے ساتھ وفاداری کرتے۔ اسی طرح جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں برسرِ اقتدار آئی تو مختلف اقوام نے جن میں مسلمان بھی شامل تھے اس کی اطاعت کی مگر بدقسمتی سے کمپنی کے عہدہ دار مسلمانوں سے بدگمان رہے جس کا اندازہ حسب ذیل اقتباسات سے ہوگا۔ مثلاً

۱۔ لارڈ میکالے نے مسلمانوں کی نسبت لکھا:

"کلایو کسی مسلمان کو بنگال کے محکمۂ انتظامی کا سردار بنانے کے بہت خلاف تھا"

مگر چونکہ اُس وقت بنگال میں مسلمانوں کی قوت بڑھی ہوئی تھی اس لئے لارڈ کلایو کی تجویز پر کونسل عمل نہ کر سکی۔

۲۔ ۸/ مارچ ۱۸۷ء کے کلکتہ گزٹ میں مشتہر کیا گیا کہ مسلمانوں کی سلطنت تو نہایت حقیر و ذلیل ہو گئی ہے۔ ہندوؤں سے ہم کو کچھ خوف نہیں ہے گرچہ بہت آدمیوں نے یہ صلاح دی کہ مسلمانوں کو تقویت دے کر ہندوؤں کی قوت کو مغلوب کرنا چاہیئے مگر یہ تدبیر اور انتظام اچھا نہیں ہے۔ کچھ ضروری نہیں ہے کہ ہم ایسے کام کریں جو ہندوستانیوں کو ناگوار خاطر ہوں اور سلطنت جو برسرِ زوال

ہے اور وہ حقیقت میں ہماری قلبی دشمن اور رقیب ہے اس کے حامی اور مددگار ہوں[1]۔

مگر باوجود کمپنی کے منافقانہ طرز عمل کے ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی جو کچھ تعلیمی اور ذہنی حالت باقی رہی اُس کا اندازہ بنگال سول سروس کے ایک افسر کی حسب ذیل تحریر سے ہوتا ہے:

،، علوم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور نسبتاً ہندوؤں کے سامنے تغلّب مکتسب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں مختلف کاموں کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے[2]۔

بدقسمتی سے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے گورنمنٹ کی ناراضگی مسلمانوں سے اور زیادہ بڑھ گئی جس کی بابت سر آکلینڈ کالون لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ نے فرمایا:

،، غدر فرو ہو جانے پر ان ہی سے سخت انتقام لیا گیا اور دونوں قوموں (یعنی انگریزوں اور مسلمانوں) میں مصالحت کی امید جاتی رہی۔

سلطنت کے متعلق مسلمانوں کا نقطۂ نظر

اگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کی یہ پالیسی مسلمانوں کے بارہ میں محض غلط فہمی پر مبنی تھی جس کی تصدیق ڈاکٹر ہنٹر نے ان الفاظ میں کی کہ مسلمانوں کو اس کی کچھ پروا نہ تھی کہ ان کا بادشاہ کس قوم و مذہب کا شخص ہے۔ البتہ جب اس سے غرض ہوتی تو اس کے مقابلے میں آ جاتے۔ مثلاً ہنٹر صاحب نے لکھا ہے کہ جب شہنشاہ اکبر نے مذہب سے تجاوز کیا تو مسلمانوں کے استفسار پر علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ اس کے

---

[1] تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ صاحب جلد نہم ص ۲۲۶

[2] سلطنت ہند اور آئندہ پالیسی از ہنٹر صاحب ص ۳۔

خلاف بغاوت کرنا جائز ہے۔ چنانچہ بغاوت ہوئی اور قریب تھا کہ اس کی حکومت ختم ہو جاتی۔ برخلاف اس کے جب مرہٹوں نے انیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کی سلطنت کو برباد کیا اور ملک کو تاخت و تاراج کیا اور اس پر قبضہ کر کے رعایا سے چوتھ لینا شروع کیا تو علماء سے حسب ذیل استفسار کیا گیا:

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسلمانوں کا ملک کفار کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے جو مسلمانوں کو نماز جمعہ اور عیدین ادا کرنے دیتے ہیں۔ اور شریعت اسلام قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کی خواہش کے مطابق قاضی مقرر کرتے ہیں مگر مسلمان حاکم مقرر کرانے کے لئے مسلمانوں کو کفار سے درخواست کرنی پڑتی ہے۔ ایسا ملک دار الاسلام ہے یا دار الحرب؟"

تو اس کے جواب میں علماء جون پور نے فتویٰ دیا کہ ایسا ملک دار الاسلام ہے۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے پیش نظر صرف یہ امر رہا ہے کہ انہیں شریعت پر عمل کرنے کے مواقع حاصل رہیں خواہ عملداری مسلمان بادشاہ کی ہو یا کافر کی۔

ہندوستان کس وقت تک دار الاسلام رہا

نہ صرف مرہٹوں کی عملداری میں بلکہ خود انگریزوں کی عملداری میں مسلمانوں کے نزدیک ہندوستان اس وقت تک دار الاسلام رہا جب تک اس ملک میں ان کا شرعی قانون جاری رہا اور ان کا دار القضاء قائم رہا۔ البتہ بقول مسٹر ہنٹر صاحب موصوف:

"ہم نے ۱۷۹۰ء میں ایک زبردست قدم اٹھایا اور قاضیوں کے قانون کو منسوخ کر کے انہیں علیحدہ کر دیا اور میری دانست میں یہ دشمنی کے نقطۂ

---

۱ مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص ۳۶، ۳۵

کیا:[1]

بقول ڈاکٹر موصوف:

"غلطی یہ تھی کہ قاضیوں کی برطرفی سے نہ صرف یہ کہ مسلمان سرکاری ملازمتوں سے خارج ہو گئے بلکہ ایسے عہدہ سے محروم ہو گئے جو ان کے خانگی اور مذہبی قانون کو نافذ کرتا تھا۔ ملک کا چارج لینے پر جو ہمارا سب سے پہلا قانون بنایا گیا اس نے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا اور قاضی کے عہدہ کو مستقل کر دیا اور ہمارے قوانین میں تقریباً پچیس قواعد دربارہ قاضیان شامل تھے درحقیقت مسلمانوں کے خانگی اور مذہبی قانون میں قاضی کا عہدہ اس قدر ضروری ہے کہ اس بارہ میں مولویوں کے فتاویٰ یہ تھے کہ جب تک کہ ملک ہندوستان میں قاضی رکھے جائیں گے وہ دارالاسلام رہے گا۔ ورنہ ان کی برخاستگی پر دارالحرب ہو جائے گا۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں کی شکایات اور ان کے احساسات کا علم ہمیں ان کی بے چینی کے سلسلہ میں اب ہوا ہے ۱۸۶۴ء میں ایک صوبہ کے گورنر نے سرکاری طور پر قاضیوں کے تقررات پر اعتراض کیا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خیال یہ تھا کہ اس قسم کے تقررات سے گورنمنٹ ان کے تقدس کا اعتراف کرتی ہے۔ اس لئے قاضیوں کا تقرر خود مسلمانوں کی طرف سے ہوا کرے مگر کچھ بحث و مباحثہ کے بعد باوجود بمبئی والوں کے سخت احتجاج کے اس مضمون کے متعلق جس قدر پہلا قانون تھا وہ منسوخ کر دیا گیا اور گورنمنٹ نے قاضیوں کا تقرر کرنا بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زنا، ورعورتوں کے اغوا ورانہیں بھگا لے

---

[1] مسلمانانِ ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص ۱۳۹

جانے کے مقدمات کی تعداد بہت بڑھ گئی ۱۸۶۲ء کے ۱۶۲ مقدمات کے
مقابلہ میں یہ تعداد ۱۸۶۶ء میں ۱۱۶۶ ہو گئی جو سہ گونہ سے زیادہ تھی[1] افسر
انچارج مقدمات وہابیان نے اس بارہ میں تحریر فرمایا ہے کہ وہابیوں کی
تحریک کے سلسلہ میں میرے خیال میں کوئی شک نہیں ہے کہ قاضیوں کی برخاستگی
کا دو طرح سے اثر پڑا ہے اوّلاً یہ کہ اس سے پرجوش نیم ملاؤں کی تعداد بڑھ گئی
جو کوئی ذریعہ معاش نہ ہونے کے سبب سے موجودہ طریقہ حالات سے
متنفر ہونے کی وجہ سے یہ لوگ بغاوت کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں لیکن
اس کا ایک اور اثر بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر قاضی نہ ہو تو مسلمانوں کی زندگی کا اور
اس کے مذہب کا قائم رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ بعض رسوم کی
ادائیگی میں قاضی کی امداد کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی
میں ہمیشہ چھوٹے چھوٹے مذہبی مسائل اور قانونی امور پیش آتے رہتے ہیں
جن کو قاضی ہی مناسب طریقہ پر حل کر سکتا ہے۔ اگر کوئی ایسا افسر نہ ہو تو
اس سے باغیانہ خیالات کے لوگوں کو گورنمنٹ کے خلاف یہ شورش
کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے کہ یہ گورنمنٹ کے مقرر کردہ قاضی سے
مستفید ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں نے گورنمنٹ کی حکومت اور
اس کے جواز کو تسلیم کر لیا۔[2]

مسلمانوں کی دوسری ملازمتیں عہدۂ قضا کے علاوہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں
حکومت کے تمام بڑے عہدے تھے۔

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ڈاکٹر ہنٹر ص ۱۹۴

[2] ایضاً

کی بابت ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا ہے:

"انگریزی حکومت کے شروع میں سرکاری ٹیکسوں کی وصولی کا کام (یعنی سرکاری آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا اور یہ کام تقریباً اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا۔ آمدنی کا دوسرا ذریعہ پولیس کی ملازمت تھی اس کے افسر بھی مسلمان ہوتے تھے۔ آمدنی کا تیسرا ذریعہ عدالتیں تھیں۔ ان پر بھی مسلمان چھائے ہوئے تھے۔ لیکن سب سے بڑی چیز فوج تھی جس کے قبضہ میں فتوحات ملکی کی باگ ہوتی تھی۔ فوجی افسروں کو سرکاری محصولات کی وصولی پر بنک کے کم شرح سود کے بقدر تنخواہیں ہی نہیں ملتی تھیں بلکہ فوجی افسر اپنے کاشتکاروں کو فوج میں بھرتی کرتے تھے۔ اور سلطنت سے ان سب کی تنخواہیں وصول کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء کے شروع میں بنگال کے کسی اچھے خاندان کے مسلمان کا غریب ہونا ناممکن تھا۔ کیونکہ دولت کے چشمے جو ہمیشہ جاری رہتے تھے مسلم حکمرانوں کے صندوقوں کو ہمیشہ لبریز رکھتے تھے"۔[1]

اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمان دولت اور آمدنی کے ان جائز ذرائع سے کیونکر محروم ہوئے اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس وقت تک سرکاری ملازمتیں ملتی رہیں جب تک کہ مسلمانوں کا پرانا نظام تعلیم قائم رہا۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم وہ تھا جو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدوں کے لئے ان کے نوجوانوں کو تیار کرتا تھا اور بقول ڈاکٹر ہنٹر اس ذریعہ سے انہیں اعلیٰ درجہ کی ذہنی تربیت دی جا سکتی تھی۔ وہ نظام تمام دیگر تعلیمی نظاموں سے بدرجہا فائق تھا۔ انگریزی عملداری کو شروع ہوئے صرف پچھتر سال گزرے تھے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام نے ۱۳۳ء تک اپنا نظام تعلیم

۱؎ مسلمانانِ ہند: ڈاکٹر ہنٹر ص ۸۰۔

کو بیش کل کر لیا۔ جس سے مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے بند ہو گئے[1]۔ مسلمانوں نے جدید طرز تعلیم سے اس لئے فائدہ نہیں اٹھایا کہ وہ اُن کی روایات اور ضروریات کے خلاف تھی مسلمانوں کو یہ شکایت تھی کہ اگرچہ مثل دوسری اقوام کے وہ بھی تعلیمی ٹیکس حکومت کو ادا کرتے ہیں لیکن نظام تعلیم جو قائم کیا گیا ہے وہ اُن کے حسب حال نہیں بقول ڈاکٹر ہنٹر مسلمانوں کی زبان ہندی ہے روایات و بھی ہندوانی ہیں[2]

تعلیمی اوقاف کی ضبطی

دوسری وجہ مسلمانوں کی تعلیم کو نقصان پہنچنے کی یہ ہوئی کہ مسلمان نوابوں نے جو معافیات مسلمانوں کو تعلیم کے لئے دی تھیں وہ بقول مسٹر جیمس گرانٹ اُن کا تخمینہ صوبہ بنگال کے رقبہ کے چوتھائی سے کم نہ تھا۔ ۱۸۲۸ء میں انگریزی حکومت نے ضبط کر لیں۔ اس کارروائی پر بقول ڈاکٹر ہنٹر مسلمانوں کے نظام تعلیم پر ایک کاری ضرب لگی انہیں ضبطیوں سے مسلمانوں کے تعلیمی زوال کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

اس ضبطی کی کارروائی سے بھی بڑھ کر وقف ہگلی کا بے جا استعمال تھا جس نے مسلمانوں کے ایک بڑے ذریعہ تعلیم کو برباد کر دیا۔ یہ وقف ایک مسلمان رئیس حاجی محمد محسن نے ۱۸۰۶ء میں کیا تھا۔ گورنمنٹ نے واقف کے منشاء کے خلاف ہگلی کی اسلامی درسگاہ کو انگریزی کالج بنا دیا۔ اور مسلمانوں کو نہ صرف اُس کے انتظام سے عملاً بے دخل کیا بلکہ اس کی تعلیم سے بھی محروم کر دیا۔ جس وقت یہ مدرسہ انگریزی کالج بنا اس وقت بقول ڈاکٹر ہنٹر اس میں تین سو طلبا میں سے صرف تین مسلمان طالب علم تھے۔

مسلمانوں کو ملازمت رکھنے کی ممانعت

لیکن یہ واقعہ ہے کہ باوجود اس قدر شدید رکاوٹوں کے مسلمانوں نے

---

[1] مسلمانانِ ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص ۱۰۸

[2] ایضاً ص ...

یہ دیکھ کر کہ بغیر انگریزی پڑھے روزی اور رزق کے دروازے اُن پر بالکل بند ہوتے جاتے ہیں، تھوڑی بہت انگریزی پڑھنی شروع کردی تھی جس کے جواز کا فتویٰ شاہ عبدالعزیز صاحب جیسے مستند عالم نے دے دیا تھا۔ لیکن اس پر بھی ان کو ملازمتیں ملنے میں مشکلات پیش آتی تھیں۔[1] بعض جگہ تو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ملازمت پانے سے صاف طور پر روک دیا گیا۔ چنانچہ سرولیم ہنٹر نے کلکتہ کے فارسی اخبار مورخہ ۱۴ جولائی ۱۸۶۹ء کے حوالہ سے لکھا ہے:

"اس خبر کی کوئی تردید نہیں کی گئی کہ سندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا تھا کہ جو ملازمتیں خالی ہیں ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے۔"[2]

اس خبر کے بعد تحریر ہے:

"مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی قابلیت بھی حاصل کر لیتے ہیں تب بھی انہیں سرکاری اعلانات کے ذریعہ خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کر دیا جاتا ہے۔ ان کی بے کسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا بھی اپنی کسرشان سمجھتے ہیں۔"[3]

---

[1] مسلمانوں کی تعلیم اور ملازمت سے خارج کئے جانے کے حالات مفصل معلوم کرنے ہوں تو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی ایک سب کمیٹی کی رپورٹ موسومہ مسلمانوں کی تعلیم کا علاج مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۲۳ء طلب کرکے مطالعہ کی جائے۔ یہ رپورٹ کی تائید منشی عبدالمجید صاحب قرشی نے رسالہ [illegible] مورخہ ۸ جنوری ۱۹۲۴ء میں جو پنجاب سے شائع ہوتا ہے [illegible] تیار کرکے تقسیم کی تھی۔

[2] مسلمانانِ ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص ۱۸۰

[3] ایضاً

پنجاب کی تعلیمی پالیسی

بنگال کے بعد پنجاب کی تعلیمی پالیسی کے متعلق جو سرکاری
کے بارہ میں تھی ایک افسر سررشتہ تعلیم نواب بہادر خورشید
خان کی حسب ذیل تحریر قابل ملاحظہ ہے:

"پنجاب کے سررشتہ تعلیم کی رپورٹ جو سب سے اول ۱۸۵۶-۵۷ء میں
شائع ہوئی تھی اس وقت مسٹر آرنلڈ سررشتہ تعلیم کے افسر تھے انہوں
نے مسلمانوں کے متعلق لکھا کہ بہ حیثیت قوم کے ہندو مسلمانوں کے
ہاتھوں میں سب نقشہ پلٹ گیا ہے اسکولوں میں مسلمان بچوں کی بہت زیادہ
بیشی نظر آ رہی ہے۔ بہر طرح یہ امر بلاشک و شبہ درست ہے کہ تعلیمی
پیشہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہے۔ ایک اور امر قابل لحاظ یہ ہے کہ مسلمانوں
کے اسکولوں میں فارسی پڑھنے کے لئے اتنے بہت سے ہندو لڑکے ان
پر اعتماد کر کے پڑھنے آتے ہیں یہ بھی سمجھنے پر مجبور کرتا ہے کہ مسلمانوں کی
جو تعداد پنجاب میں مسلسل بڑھ رہی ہے وہ اسی عقیدہ کا نتیجہ ہے۔ اور
اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو اس سے گورنمنٹ کا تمام زور
مسلمانوں کی طرف بڑھ جائے گا۔ یہ ایک ایسا میلان ہے جسے جہاں تک ہو
روکنے کی ضرورت ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر آرنلڈ کی اس پالیسی پر عملدرآمد ہوتا رہا۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء
کی رپورٹ میں کپتان فلر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے لکھا:

"مسلمان استادوں کی بیشی جو ان درسگاہوں میں تربیت حاصل کر رہے
ہیں بالکل عیاں ہے ۴۳ مسلمان ۲۲ ہندو اور دوسری قوموں کے
ہیں۔ ابھی جلد اس کی نسبت کو مساوی کرنے کا کوئی موقعہ نہیں معلوم ہوتا بجز
بنگالہ کے حصہ کے ہر جگہ دیسی زبانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے

اور جب تک کہ وہ ہر دلعزیز نہ ہوں ہم اُن کی جگہ دوسری قوم کے اُستاد مقرر نہیں
کر سکتے البتہ افسرانِ ضلع رفتہ رفتہ راستہ صاف کر کے تبدیلی پیدا کرنے کی
یہ صورت نکال سکتے ہیں کہ زیادہ ہندوؤں کو ٹریننگ میں جانے کی ترغیب
دیں اور انہیں ایسے سکولوں میں مقرر کریں جہاں شدت کے ساتھ
مسلمان استادوں کے تقرر نہ ہوں“

پیٹرسن صاحب موصوف نے تحریر فرمایا:

”مندرجہ بالا عبارت پڑھنے کے بعد اس مضمون کی توضیح کی چنداں
ضرورت معلوم نہیں ہوتی اس کے بعد یہ طریق اختیار کیا گیا کہ ایک طرف
تو مسلم اُستادوں کی تعداد تعلیم عامہ کے صیغہ میں گھٹائی گئی۔ دوسری طرف جو
انگریزی اسکول ضلعوں کے صدر مقامات میں قائم کئے گئے وہ بالکل غیر مسلموں
کے ہاتھوں میں دے دیئے گئے چنانچہ ضلع اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں
کی فہرستوں سے معلوم ہوا کہ ۳۲ ہیڈ ماسٹروں میں سے صرف تین مسلمان
تھے۔ اگر نتائج کو صحیح حالات کا معیار قرار دیا جائے تو مسلمان استادوں
اور طلباء کی کمی تعداد کو مسٹر آرنلڈ کی پالیسی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس
کا نتیجہ غالباً گورنمنٹ نے کیا۔ یہ پالیسی اس قدر کامیاب ہوئی کہ ۲۵ سال
کے عرصہ میں حالات بالکل بدل گئے اور تعلیم سے مسلمانوں کا عنصر بالکل
خارج ہو گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۷۰ء سے ۱۹۰۰ء تک نقشوں سے واضح
ہے کہ معائنہ کنندگان اور اُستاد سب کے سب ایک مذہب کے
تھے یعنی ہندو ہو گئے۔ نیز کبھی کسی مسلمان کا نام جو شاذونادر نظر
آتا تو وہ محض اس وجہ سے کہ اس وقت صوبہ سرحدی پنجاب کے تحت
میں تھا۔ اور وہاں ہندو استاد جانا پسند نہ کرتے تھے اس لئے مسلمان

وہاں بھیجے جاتے تھے[1]

حکام گورنمنٹ کی مندرجہ بالا پالیسی کا اثر طلبا کی تعداد پر یہ پڑا کہ پنجاب میں باوجود مسلمانوں کی ۱۲ء۳ فی صدی آبادی ہونے کے ۱۹۰۳ء میں مسلمان طلبا کی تعداد صرف ۳ء۹ فیصد تھی[2] اسی طرح مدراس گورنمنٹ نے ۱۸۷۲ء میں اس امر کو تسلیم کیا کہ:

"موجودہ طرز تعلیم کا قالب ہندوؤں کی ضروریات کے مطابق بنایا گیا مسلمانوں کو اس بارہ میں اس قدر زیادہ گھاٹے میں رکھا گیا تھا کہ سکولوں میں مسلمان بچوں کا کم تعداد میں ہونا حیرت انگیز امر نہیں ہے بلکہ ان حالات میں محض ان کا وجود ہی حیرت انگیز ہے"[3]

مسلمانوں کے تنزل کی اصلی وجہ

اور مسلمانوں کے تنزل کی اصل وجہ کو ڈاکٹر ہنٹر نے حسب ذیل الفاظ میں تحریر کیا ہے:

"مسلمانوں کا تنزل ہماری سیاسی جہالت اور غفلت کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے۔ ہماری عملداری سے قبل مسلمانوں کا وہی مذہبی عقیدہ تھا وہ وہی کھانا کھاتے تھے اور تمام جزئیات میں ویسی ہی زندگی بسر کرتے تھے جیسی کہ اب کرتے ہیں۔ اب تک وہ وقتاً فوقتاً قومیت اور جنگجویانہ حوصلہ مندی کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں مگر تمام دیگر امور میں وہ انگریزی حکومت میں ایک برباد شدہ قوم ہیں"[4]

---

[1] حکومت خود اختیاری ص ..

[2] تاریخ تعلیم مصنفہ سید محمود ص ۱۰۱

[3] ایضاً

[4] "مسلمانانِ ہند" از ڈاکٹر ہنٹر ص ۱۹

اسی طرح مسٹر ای سی بیلی سکریٹری گورنمنٹ ہند نے لکھا تھا:

"تعلیم یافتہ مسلمان اپنی پرانی قسم کی تربیت پر بھروسہ رکھنے کے باوجود اپنے کو حکومت کے عہدوں اور منافع سے جن پر اب تک وہ قابض تھا محروم پاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ تمام نفع کے کام قابل نفرت ہندو کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ اچھے تعلیم یافتہ لوگوں کے دل بے حسی سے لبریز ہو گئے ہیں۔ یہ احساس اس خیال پر مبنی نہ بھی ہو کہ ان لوگوں کو ان کے مذہب کی وجہ سے ستایا جا رہا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے مذہب ہی کی وجہ سے ان کے ساتھ بے اعتنائی برتی جا رہی ہے"[1]

مسلمانوں کے بارہ میں پالیسی کی تبدیلی

بالآخر ۱۸۷۱ء میں وہ وقت آگیا کہ حکومت نے سمجھ لیا کہ وہ مسلمانوں کو تعلیم اور ملازمت سے نکال کر ان کی ذہنیت نہیں بدل سکتی۔ اس کی نسبت میجر باسو نے لکھا ہے:

"لارڈ میو (وائسرائے ہند) نے محسوس کیا کہ تعلیم اور ملازمت سے علیحدگی کی وجہ سے مسلمان ناراض ہیں اور سرحدیوں کو امداد بھیجتے ہیں۔ جہاں سے ہندوستان کو خطرہ رہتا ہے"[2]

غالباً یہی وجہ ہے کہ لارڈ میو کو مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ ہوئی۔ اس لئے ان کی بابت کہا گیا:

"نقشوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک لاکھ ہندوؤں کے مقابلے میں صرف

---

[1] مسلمانانِ ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص ۱۸۱

[2] ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں ترجمہ باسو انگریزی ص ۱۲۵

چونکہ مسلمان طلبا کم ہیں اس لئے تجویز کیا گیا کہ مسلمانوں کے لئے عربی فارسی اور اُردو کی کلاسیں کھولی جائیں اور انہیں وظائف دیئے جائیں۔[1]

ہندوؤں کی مخالفت مسلمانوں کی ترقی سے

ناظرین کو معلوم ہوگا کہ گزشتہ سو سال میں حکامِ وقت نے مسلمانوں کو گرا کر ہندوؤں کو کس قدر بڑھایا تھا۔ اس کا اثر شہروں کی ملازمتوں سے گزر کر دیہات تک پہنچ گیا تھا۔ جہاں ہندو زمینداروں نے مسلمانوں کی داڑھیوں پر ٹیکس لگا دیا تھا۔ اب جب کہ ہندوؤں نے دیکھا کہ مسلمان پھر اُبھر رہے اور پڑھ رہے ہیں تو قدرتی طور پر اُن میں بے چینی کے آثار نمایاں ہوئے اور انہوں نے اخبار میں اس کا چرچا کیا۔ اب خدا کی قدرت دیکھئے کہ اُسی حاکم (یعنی مسٹر جیمس اوکینلی) نے جو مسلمانانِ انڈیا کی تحقیقات کے لئے مقرر ہوا تھا اور تحقیقات کے نتیجے میں بہت سے [illegible] شروع کئے گئے تھے۔ کلکتہ ریویو ۱۸۷۱ء میں ایک مدلل مضمون نکالا جس میں مسلمانوں کے بارہ میں تبدیل پالیسی کی سفارش کی اور بعض ہندوؤں کے خفیہ طرزِ عمل کے متعلق حسب ذیل لکھا:

"چونکہ انگریزی اور مسلمانوں کے اخبارات، گورنمنٹ پر زور دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو اُن کی پست حالت سے اُبھاریں اور اُن کو ملک کی گورنمنٹ میں اپنا متناسب حصہ حاصل کرنے میں مدد دیں تو ہندوؤں کا جو عنصر سامنے آکر پبلک کو یاد دلاتا ہے کہ مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت غیر وفادار لوگوں کی ہے جسے تمام مسلمانوں کی ہمدردی حاصل ہے چنانچہ ۲۱ اگست ۱۸۷۱ء کے ہندو پیٹریاٹ میں ایک مضمون شائع ہوا:

---

[1] ہندوستانی تاریخ برطانیہ کے عہد میں [illegible] ۱۲۸۶ء

گویا کمپنی کی ابتدائی عملداری میں ہندو مسلم رقابت کا جو بیج بویا گیا تھا اس نے ۱۸۷۱ء میں پہلی بار زمین سے سر نکالا اور وہ آگے چل کر پھولا پھلا اور خوب بار آور ہوا۔

مسلمانوں کو تعلیم میں ابھارنے کا تہیہ بہر حال حکومت نے ہندوؤں کی مخالفت کے باوجود مسلمانوں کو ابھارنے کا تہیہ کر لیا اور مسٹر جیمس اوکینلی موصوف نے مندرجہ بالا مضامین کے سلسلے میں لکھا:

"ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی بے بنیاد ہے۔ سالہا سال سے مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے یا انہیں ایسا سمجھا جاتا ہے جن کی حالت بہت مشتبہ ہے ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ اُن کے اوقاف کی آمدنیوں کو جو اسلامیہ کالجوں کے لئے تھیں وہ دوسرے کاموں میں صرف کیا جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ موجودہ غفلت کے بعد ایک عاقلانہ و فیاضانہ حکمت عملی اختیار کی جائے گی۔"[1]

دوسرے موقعہ پر صاحب موصوف نے فرمایا:

"میرے نزدیک مسلمان کاشتکاروں پر وہابیوں کے عقیدہ کا اثر اس وجہ سے ہے کہ ہم نے ان کی تعلیم سے غفلت کی ہے۔ ہماری ریاست میں نچلے طبقے کے لوگوں میں ذرائع معاش کا نہ ہونا ان کے لئے کس قدر مضر ہے۔ جن کی تعلیم کا انتظام ہمارے سکولوں میں نہایت کمی کے ساتھ ہے انبالہ کی سازش کے مقدمہ میں ایک ملزم مسمی عثمان علی نے

---

[1] کلکتہ ریویو اکتوبر ۱۸۷۰ء ص ۱۹۱

کے لئے تدابیر اختیار کرنی شروع کیں۔ اُسی کے ساتھ وائسرائے نے تمام صوبجات سے رپورٹیں طلب کیں اور اُن کے موصول ہونے پر ۱۳ر جون ۱۸۷۳ء کو ایک نہایت مفید رزولیوشن جاری کیا۔ اس رزولیوشن کا خلاصہ یہ ہے:

"مسلمان اُن مضامین کے خلاف نہیں جو گورنمنٹ نے درسگاہوں میں جاری کئے، بلکہ اُس نظام کے خلاف ہیں جس کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے"[1]

اور یہ طے کیا کہ جہاں مسلمان پس ماندہ ہیں یا خوش حال اور با اثر نہیں ہیں وہاں گورنمنٹ ان کی امداد کرے اور اُن کی تعلیمی کمی کو پورا کرے۔ چنانچہ مختلف صوبوں نے مسلمانوں کی تعلیمی امداد کا انتظام کیا۔ بالخصوص بنگال میں کلکتہ مدرسہ کی اصلاح کی اور محسن فنڈ کی نسبت یہ انتظام کیا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم پر صرف کیا جائے جو اب تک زیادہ تر غیر مسلموں کے صرف میں آتا تھا۔ اور پچاس ہزار روپیہ کی امداد صوبۂ بنگال کے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے مقرر کی۔ یونیورسٹیوں میں عربی اور فارسی کے پروفیسر مقرر کرنے کی تجویز کی۔ مسلمان طلباء کے لئے وظائف مقرر کئے اور تمام صوبوں نے یونیورسٹیوں سے لے کر ابتدائی تعلیم تک مسلمانوں کے لئے مراعات کا انتظام کیا۔

ہنٹر کمیشن کی سفارشات پر گورنمنٹ کے احکام

مندرجہ بالا احکام جاری ہونے کے

نو سال بعد گورنمنٹ نے ۱۸۸۲ء میں تعلیمی کمیشن ڈاکٹر ہنٹر کی صدارت میں مقرر کیا۔ جس کی غرض یہ تھی کہ جو احکام ۱۸۷۱ء میں جاری ہوئے تھے معلوم کیا جائے کہ اُن کی تعمیل کہاں تک ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کمیشن نے کامل تحقیقات کر کے طویل سفارشیں کیں۔ جن پر

---

[1] تاریخ تعلیم از سید محمود ص ۵۰

تک پہنچنے کے لئے نیا نظام قائم کرنا پڑے گا۔ لیکن اس پر جو خرچ گورنمنٹ
کرے گی اس کا معاوضہ کافی مل جائے گا۔ ایسا نظام ایک زمانہ میں ہندوؤں
کے لئے ہندوؤں کی سمجھ آیا تھا۔ مسٹر ہارڈنگ نے ایسے اضلاع کی تعلیم کے
لئے جہاں کے لوگ خود تعلیم پھیلانا نہ چاہتے تھے بہت سے مدارس
قائم کئے تھے جن پر گورنمنٹ کو خود فیس کے ۱۱۰۰ سو پونڈ سالانہ صرف
کرنا پڑتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ اوّل ایک عارضی اسکول قائم کر دیا جاتا تھا
جس میں گاؤں کے بچوں کو تعلیم قریبا مفت ملتی تھی لیکن جب اس کی قدر
ہوتی تو فیس بڑھا دی جاتی اور جب وہ اسکول چل نکلتا تو اس روپیہ سے دوسرے
رقبہ میں اسکول دیا جاتا۔ اس طریقہ سے غربی بنگال کے جنگلوں کے اندرونی
رستوں میں تعلیم پھیلا دی گئی۔ میرے خیال میں مشرقی اضلاع میں بھی یہ طریقہ
اختیار کیا جائے جہاں کے لوگ مذہبی مجنون ہیں اور ایسے ضلعوں میں جو گورنمنٹ
کے پشتینی بدخواہ اور ہمارے طریقہ تعلیم کے مخالف ہیں امداد کے ذریعہ کارآمد
نہیں ہو سکتے البتہ بیچ میں سستے مدرسے جن میں تھوڑی تنخواہ کے مسلمان
مدرس رکھے جائیں اور جن کے اخراجات کا بڑا حصہ گورنمنٹ ادا کرے تو
ایک ہی نسل میں مشرقی بنگال کا عام پسند رنگ بدل دیں گے۔ ایسے مدارس
شروع میں کم کامیاب ہوں گے مگر وہ رفتہ رفتہ نہ صرف مسلمان کاشتکاروں
کے بچوں کو بلکہ مسلمان استادوں کو جن کی آمدنی غیر یقینی ہے کھینچ لائیں
گے ان کے لئے ۵ شلنگ فی ہفتہ کا زائد معاوضہ نعمت غیر مترقبہ ہوگا۔
اس طریقہ سے ہمیں اس جماعت کو اپنا طرفدار بنا لینا چاہیئے جو اب تک سخت
شدت کے ساتھ ہماری مخالف ہے۔[1]

---

[1] [illegible]

مسلمان ڈپٹی انسپکٹر مقرر کرنے کی غرض

مسلمانوں کے تعلیمی مطالبات سے مدتوں قبل ڈاکٹر ہنٹر نے یہ تجویز کیا تھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے مسلمان ڈپٹی انسپکٹر مقرر کئے جائیں۔ جنہیں مقرر کرنے کی غرض اُن کی کتاب کے حسب ذیل اقتباس سے معلوم ہوگی:

"مسلمانوں کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے ایک سپیشل یا خصوصی ڈپٹی انسپکٹر کی جو اُن کا ہم مذہب ہو ضرورت ہوگی اس کا پہلا فرض ان مسلمان مدرسوں اور کالجوں کے متعلق رپورٹ کرنا ہوگا جو دیسیوں کی نگرانی میں ہیں جنہیں امید نہیں کہ وہ انگریز افسران کے باقاعدہ معائنہ کو گوارا کریں گے لیکن ان میں سے بہت سے سرکاری امداد لینے کے لئے اپنے ہم مذہب ڈپٹی انسپکٹر کے معائنہ کی آسان شرط پر رضامند ہوجائیں گے۔ اسی طرح ہم کو بنگال میں سب سے زیادہ باغی درسگاہوں کو اپنے ساتھ کرلینا چاہیئے۔ اگر وہ وفادار نہ بھی ہوں تو کم از کم امن پسند تو ہوجائیں گے۔"[1]

اسلامی کالجوں کو زیر اثر لانے کا طریقہ

اسی سلسلہ میں ہنٹر صاحب نے مسلمانوں کی ثانوی تعلیم کے متعلق حسب ذیل تحریر فرمایا:

"ان دو درجات (یعنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم) کے لئے تو ہم کچھ خرچ بھی کریں لیکن مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم میں تو ہمارا ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوگا جو رقم محسن مرحوم نے ہگلی مدرسہ کے لئے مقرر کی ہے اور نیز ہگلی فنڈ

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ڈاکٹر ہنٹر ص ۲۰۰

[2] ایضاً

مذہبی جنون اور پولیٹیکل بدخواہ سمجھے جاتے تھے تاکہ بقول ڈاکٹر ہنٹر ایک ہی سال میں پسند
رنگ بدل دیا جائے۔ اور مخالفوں کو اپنا طرفدار بنا لیا جائے۔ مسلمانوں کے جن دینی مدارس
میں انگریز انسپکٹروں کی رسائی نہ ہوسکتی تھی وہاں مسلمان ڈپٹی انسپکٹر مقرر کیا جائے تاکہ بنگال
کی سب سے زیادہ باغی درسگاہوں کو اپنے ساتھ کرلیا جائے۔ اسی طرح کلکتہ مدرسہ
میں جو مسلمانوں کی مذہبی درسگاہ تھی انگریز پرنسپل مقرر کرکے وہاں شرعی قانون کی تعلیم بند
کردیا جائے۔ اور اس کی جگہ انگریزی اور فارسی لٹریچر جاری کیا جائے۔

اس عہد میں مختلف ممالک کے علما میں یہ تحریک پیدا ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کو بیہودہ رسوم باطلہ کی پابندیوں سے آزاد کر کے صحیح معنوں میں مسلمان بنایا جائے۔

دارالعلوم دیوبند

مذکورہ بالا مدارس میں زیادہ نمایاں دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور ہیں جن میں سے اول الذکر مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اور ثانی الذکر کو مولوی محمد مظہر نے ۱۸۶۶ء میں قائم کیا۔ اول تو بالعموم تمام عربی مدارس حکومت کی نظروں میں مشتبہ تھے مگر دیوبند کی طرف نظر عتاب بالخصوص اس وجہ سے تھی کہ اس کے بانیوں میں متعدد اصحاب وہ تھے جن کی نسبت حکام وقت کا یہ خیال تھا کہ انہوں نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا تھا۔ علاوہ مسلمانوں کا مذہبی جوش قائم رکھنے اور سرحد کے لوگوں سے تعلقات جاری رکھنے کے لئے یہ مدرسہ قائم کر رہے تھے۔ مدرسہ کے بانیوں میں سے کئی علما ایسے تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں تحصیل شاملی ضلع مظفرنگر پر قبضہ کر لیا تھا جسے انگریزوں کی فوج نے واپس لے لیا تھا۔ اس پر اضافہ یہ ہوا کہ ان مدارس نے نہ کبھی سرکاری امداد لینی گوارا کی اور نہ ڈپٹی انسپکٹروں کو اپنے ہاں آنے کا موقع دیا جو انہیں سرکار کی وفاداری پر مائل کرتے بلکہ شرع محمدی کی تعلیم کو مقدم رکھا جس کو حکام وقت ناگواری کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ بالخصوص مدرسہ دیوبند کے بانی تو نہ صرف حکومت بلکہ امرا کے تعلقات سے بھی احتراز کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے وصیت نامہ میں تحریر ہے:

> ۱۔ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں ہے تب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ تعالیٰ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی یقینی ایسی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں نزاع پیدا ہو

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

مگر دیسی زبان میں علوم جدیدہ کی تعلیم دینے کا بہترین تجربہ حال میں جامعہ عثمانیہ میں کیا گیا ہے جس کی تحریک رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نے ۱۹۱۷ء میں اور تشکیل سر سید راس مسعود نے ۱۹۱۰ء میں شروع کی اور عثمانیہ یونیورسٹی قائم کی اس میں تمام یورپی علوم دیسی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی لازمی قرار دی گئی ہے گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں تمام دیگر علوم کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے جسے پڑھ کر وہاں کے طلبہ یورپ کی یونیورسٹیوں میں نمایاں کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔

تحریک سر سید احمد خاں

پچھلے باب میں مسلمانوں کی قدیم معاشرت اور مذہبی و تعلیمی حالت کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان اپنے قدیم طریقہ تعلیم و قدیم روایات کی بدولت کس قسم کے مضبوط کیرکٹر کے حامل تھے۔ اس کے بعد حالات زمانہ کے مطابق سر سید احمد خاں نے [illegible] سے اپنا عظیم الشان اصلاحی کام شروع کیا جو تحریک سر سید کے نام سے مشہور ہے مگر اس سے پہلے بھی سر سید نے مختلف طریقوں سے قومی خدمات انجام دیں جو فصل اوّل میں بیان کی جاتی ہیں:-

فصل اوّل

سر سید احمد خاں کی ابتدائی خدمات

[illegible]

ملازمت کی پابندیوں کے آپ کے ہاتھوں سے عظیم الشان کام انجام پائے۔ آپ کی تصانیف کی نسبت نواب صدر یار جنگ بہادر نے فرمایا ہے:

"دورانِ ملازمت میں جو انہوں نے بہت سے ایسے کام کر لئے جن میں سے ایک ہی معمولی آدمی کی عمر بھر کی کارگزاری کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ مثلاً آثار الصنادید کی تالیف، آئین اکبری کی تصحیح، تاریخ بجنور، تبیین الکلام کی تصنیف۔"

اسی سلسلہ میں نواب صاحب موصوف نے تحریر فرمایا ہے:

"عالمانہ حیثیت سے نکل کر عاملانہ صیغہ میں آیئے تو یہاں بھی سرسید کے کارناموں کی آب و تاب آنکھوں کو روشن کرتی ہے۔ مرادآباد میں قحط کا انتظام، ۱۸۵۷ء کے غدر میں کارگزاری وغیرہ وغیرہ۔ سرسید میں ایک نمایاں بات یہ تھی کہ سرکار اور رعایا دونوں پر ان کی عظمت کا یکساں سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جس میدان میں گئے مرد میدان اور جس راہ سے گزرے آزادانہ۔"(۱)

ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں خدمات

سرسید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کے شاہی دربار کا آخری ٹمٹماتا چراغ دیکھا تھا پھر ایک عہدہ دار ہونے کی حیثیت سے آپ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا نیا دور دیکھا جس کے خلاف ناراضی کی آگ ملک میں آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی۔ وہ بالآخر ۱۸۵۷ء میں بھڑک اٹھی اور تمام شمالی ہند میں پھیل کر صدہا خاندانوں اور بیسیوں شہروں و قصبوں کی بربادی کی موجب ہوئی۔ یہ آگ جب دبی تو اگلے سال ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان سے کمپنی کی عملداری ہٹا کر پارلیمنٹ کی حکومت قائم کر دی۔ بچپن سے سرسید کے کانوں

---

(۱) رپورٹ ... نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی۔

بھی مسلمانوں کی کمزور شخصی سلطنت کے زمانہ کی بے امنی کے نقصانات پڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کے ہولناک منظر دیکھے اور انہیں خوب بھگتا۔ اس کے بعد جب کوئی گورنمنٹ کا قائم ہونا اور ہر طرف امن کا قیام انہیں نہایت غنیمت معلوم ہوا۔ اس لئے وہ انگریزوں کی سلطنت کے سچے دل سے حامی تھے۔ وہ اس سلطنت کو ملک و قوم کے لئے حد درجہ مفید سمجھتے تھے مگر غدر کے زمانے میں جب گورنمنٹ نے انہیں ایک بہت بڑی جاگیر دینی چاہی تو اس بنا پر کہ وہ جائداد ایک مسلمان کا ضبط شدہ علاقہ تھی اسے لینے سے انکار کر دیا۔ البتہ اس کے بدلے میں دو سو روپیہ ماہوار کی خدمت پنشن منظور کر لی۔

سرسید کی قومی خدمات کا محرکِ اوّل

یوں تو سرسید ۱۸۵۷ء سے قبل بھی علمی مجالس کے مختلف کاموں میں مصروف رہتے تھے مگر ان کے سیاسی و تعلیمی کاموں کی ابتدا دراصل ۱۸۵۷ء کے ہولناک واقعہ سے ہوتی ہے جس نے سرسید کے قلب پر زبردست اثر ڈالا۔ اس کی نسبت سرسید کے ذی علم سوانح نگار مولانا حالی نے تحریر فرمایا ہے:

> اور دلی مراد آباد اور بجنور کے مسلمان خاندانوں کی تباہی سے سرسید کا حال بعینہ اس شخص کا سا تھا جس کے گھر کا ایک حصہ آگ سے جل گیا ہو اور باقی حصوں کے بچانے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا پھرتا ہو۔ گورنمنٹ تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے بدگمان ہو گئی ہے۔ مسلمان گورنمنٹ کے شدید انتقام اور سخت سزاؤں سے جو غدر کے انسداد میں آئیں اس کی مہربانی اور شفقت سے بالکل مایوس ہو گئے تھے۔ ہندو قوم مسلمانوں کو دشمن کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ انگریزی اخبارات میں ہر روز مسلمانوں کے خلاف آرٹیکل لکھے جاتے تھے جن سے انگریزوں

کا دل روز بروز مسلمانوں سے زیادہ پھٹتا جاتا ہے۔ کچہریاں روز بروز مسلمانوں
سے خالی ہوتے جاتے ہیں فوج میں اُن کی بھرتی کم ہوگئی ہے، اور درباروں
میں کم بلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ تمام آثار اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ
اب مسلمانوں کا ہندوستان میں عزت اور اعتبار کے ساتھ رہنا غیر ممکن ہے
ان تمام باتوں پر نظر کر کے اوّل اوّل تو سرسید کا بھی جی چھوٹ گیا تھا یہاں
تک کہ اُنہوں نے ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جا کر
بودوباش کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا مگر آخر کار اُن کو وہ ارادہ فسخ کر کے
قوم کی آگ میں کودنا پڑا۔؎۱

قوم کی آگ میں کودنے کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد
جب حکامِ وقت بغاوت کا سرا تمام ہندوستانیوں پر لگا کر انہیں پامال کر رہے
تھے تو سرسید احمد خاں اُن حالات کو برداشت نہ کر سکے اور اُنہوں نے ۱۸۵۹ء میں
رسالہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ کر خود حکامِ گورنمنٹ کو اس ہنگامہ کا ذمہ دار قرار دیا
اور خاص کر مسلمانوں کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے "وفادار مسلمانانِ ہند" کے
نام سے مضامین کا ایک سلسلہ شائع کیا جس میں گورنمنٹ کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری
کے حالات درج ہوتے تھے۔ جس جرأت اور مردانگی کا اظہار بالخصوص بغاوت
کی حالت میں اس وقت پر سرسید نے کیا اس کی نظیر اس زمانہ میں مشکل سے ملے گی۔ رسالہ ا
سبابِ بغاوتِ ہندوستان کی [illegible] حکومت کی یک طرفہ [illegible] تصویر ہے
اور سیاست پر ایک ہندوستانی کا سب سے پہلا [illegible] تبصرہ ہے [illegible]
کے سامنے ایک اہم مسئلہ رکھا [illegible] جب [illegible] چھپ کر سید نے گورنمنٹ میں

؎۱ حیاتِ جاوید ص ۱۴۱

بھیجنا چاہا تو اُن کے دوست رائے شنکر داس منصف نے کہا کہ تمام کتابوں کو جلا ڈالو اور ہرگز اپنی جان کو معرضِ خطر میں نہ ڈالو۔ مگر سرسید جیسا شخص اِس مشورہ کو کیسے مان سکتا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے "اسباب بغاوتِ ہند" کی پانچسو جلدیں ممبران پارلیمنٹ کے پاس اور ایک جلد وائسرائے ہند کے پاس بھیجدی۔ کونسل کے ایک انگریز ممبر مسٹر سیسل بیڈن فارن سکرٹری گورنمنٹ ہند نے اُسے باغیانہ قرار دیا مگر وائسرائے نے اُسے خیر خواہی پر محمول کیا۔ یہ رسالہ نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ کل ہندوستان کی سیاست کا سنگِ بنیاد ہے۔ جس پر ملکی سیاست کی تعمیر ہوئی اور جو حقیقت میں سرسید کی اصل و بنیادی پالیسی تھی۔ اس رسالہ کا خلاصہ اور سرسید کی سیاسی خدمات باب ہشتم میں دی گئی ہیں۔

عام مذہبی خدمات

انگریزی عملداری کی ابتدا سے عیسائی مشنری اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے اور ہندوؤں کو عیسائی بنانے میں ایک حد تک کامیاب ہوتے تھے۔ اس لئے نہ صرف پیشہ ور پادری بلکہ بڑے مرتبے کے انگریز حتیٰ کہ ممبران پارلیمنٹ اور کمپنی کے بڑے عہدہ دار اسلام کے خلاف کتابیں لکھتے تھے اور اُن کے جوابات مسلمان علماء دیتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر سرسید نے مناظرہ کے مخاصمانہ طریقوں کو بدلنے کی کوشش کی اور اُنہوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد توریت و انجیل کی تفسیر "تبیین الکلام" کے نام سے لکھی جس سے اُن کا یہ منشا تھا کہ [illegible] عیسائیت میں جو [illegible] ہیں [illegible] کی تشریح کر کے دونوں [illegible] کو [illegible] کیا جائے۔ سرسید نے مختلف طریقوں سے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان منافرت دور کرنے کی جو تدبیر اختیار کی تھی یہ تصنیف بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔

ملکۂ معظمہ کوئین وکٹوریہ اور پرنس آف ویلز کی خدمت میں باریابی ہوئی۔ سی۔ ایس۔ آئی کا تمغہ
ملا۔ بڑے بڑے عمائد کے یہاں اور مختلف اداروں میں اُن کے ڈنر ہوئے اور تقریریں
ہوئیں۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ انگلستان اور ہندوستان دونوں میں سرسید حد درجہ
باوقعت ہیں گورنمنٹ انہیں اپنا معتمد سمجھتی ہے مسلمان انہیں اپنا پشت پناہ اور حامی
سمجھتے ہیں۔ ہندو انہیں ملک کا بہی خواہ جانتے ہیں۔ اُن کی عقلمندی کی تمام زمانہ میں دھاک
ہے۔ حتیٰ کہ اُن کی نسبت عوام میں مشہور ہو گیا کہ گورنمنٹ نے اُن کا سر خرید لیا ہے
تاکہ اُن کے انتقال کے بعد عمل جراحی کر کے دیکھا جائے کہ اُن کے دماغ میں کیا خاص
بات ایسی ہے جس کی وجہ سے وہ اس قدر عقلمند ہیں۔

سرسید کے قیام انگلستان کے دوران میں ایک قانون پاس ہوا تھا جس کی رو
سے جنرل گورنر ہند کا مزید اقتدار بڑھایا گیا تھا اس کی بابت انہوں نے نواب محسن الملک
کو ۲۰ اگست سنہ[۱۲۹] کو ایک خط لکھا تھا جس سے اُن کی آزادیٔ خیال کا اندازہ ہوتا
ہے۔ وہ یہ ہے:

> "یہ قانون دراصل پارلیمنٹ نے نہایت نیک نیتی سے ہندوستان
> کا فائدہ سمجھ کر پاس کیا ہے مگر یہ ایسی غلطی ہوئی کہ جس کا بیان نہیں
> ہو سکتا۔ حقیقت میں ہندوستان ختم ہو گیا اور یہ امر ہندوستان کے لئے
> نہایت مضر ہے کہ انگلستان میں یہ قانون جاری ہوتا تو سب رعیت اُس کی
> منسوخی کی درخواست کرتی۔"

تحریکِ سرسید کی تشکیل سرسید کے قیام [illegible]
[illegible]

[illegible]

سٹیل اور ایڈیسن کے رسالہ جات "ٹیٹلر" اور "اسپکٹیٹر" کے چھپنے سے تھے جن کے
ذریعہ سے ۱۷۰۹ء سے لے کر ۱۷۱۳ء تک انگریزوں کے اخلاق و عادات، رسم و رواج اور
طرز خیالات کی اصلاح کی گئی تھی۔ سرسید نے اصلاح معاشرت پر اصلاح مذہب کا
اضافہ کر کے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ نکالا جس کا سرورق آپ نے
انگلستان میں تیار کرایا تھا۔ اس کام میں آپ کو اس قدر جلدی تھی کہ ۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو
ہندوستان پہنچے اور ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اس رسالہ کا پہلا پرچہ نکال دیا۔ آپ کے
مشن کا تیسرا رکن تعلیم تھا جس کے لئے آپ نے سید محمود کی امداد سے انگلستان کی
یونیورسٹیوں کا بخوبی مطالعہ کیا اور مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ایک سکیم تیار کی اور اس
پر عمل درآمد کرنے کے لئے "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" اور "کمیٹی خزینۃ البضاعۃ"
قائم کیں جن کی تفصیل باب ہذا کی فصل سوم میں کی گئی ہے۔ غرض کہ اصلاح معاشرت و
مذہب و اشاعت تعلیم کے کام آپ نے ایک ساتھ شروع کئے۔

سرسید کے کام کی مشکلات

جیسا کہ دوسرے موقع پر بیان کیا گیا ہے سرسید کی طبیعت اثر پذیر تھی اور ان میں ملی درد کی
بڑی قوت تھی اور اسی کے ساتھ ان کے کام کی مشکلات بھی بے حد تھیں۔ مسلمان ایک
مدت سے زوال کے چکر میں چل رہے تھے اور ان کی ترقی کی تمام راہیں بند کر دی گئی تھیں
ان کے ایک تنگ دائرہ میں رہنے سے ان کی نظریں محدود ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔
تنگ نظری کی حالت میں ان کی رہی سہی قوت، مذہبی مسائل کی موشگافیوں اور فرقہ بندیوں
میں صرف ہوتی تھی۔ سرسید جن کے دل میں مسلمانوں کی ترقی کی لگن تھی ان تمام حالات کا
ذمہ دار مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کو سمجھتے تھے اس لئے ابتدا ہی میں خود انہوں نے
ان سے ٹکر لی جن کا اثر عوام پر زیادہ تھا اور ان کی مخالفت سے سرسید کے
مشن میں بڑی رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی جب نیچریوں کے تحت

"ہم نے تمام معاملات زندگی میں بلکہ بعض امور مذہبی میں بھی ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی بسبب اختلاط اور ملاپ اختیار کر لی ہیں مگر جب ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے طریق معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر پہنچائیں تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں وہ ہم کو بہ نظر حقارت نہ دیکھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام رسوم و عادات کو بہ نظر تحقیق دیکھیں اور جو بری ہوں ان کو چھوڑیں اور جو قابل اصلاح ہوں ان میں اصلاح کریں۔"[1]

سر سید خاص طور پر ایک انگریز مورخ کے اعتراضات سے بہت متاثر ہوئے تھے جنہیں سر سید نے تہذیب الاخلاق کے سب سے پہلے پرچہ میں نقل کیا تھا۔ اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

"ہندوستان کے مسلمان ذلیل ترین امت محمد صلعم سے ہیں اور قرآن کے مسئلوں اور ہندوستان کی بت پرستی سے مل کر ان کا مذہب ایک عجیب مجموعہ ہوگیا ہے۔"[2]

ایک دوسرے مورخ نے لکھا تھا:

"عیسائیت اس بڑی سے بڑی خوشی کے جو تمدن و منطق نے انسان کو دی ہے صرف موافق اور مطابق ہی نہیں بلکہ اس کو ترقی دینے والی ہے۔ وہ برخلاف اس کے اسلام اس کو خراب کرنے والا اور ذلت میں ڈالنے والا ہے۔"[3]

---

[1] تہذیب الاخلاق مضامین سر سید جلد دوم ص ۲

[2] تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۳

[3] تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۳

سرسید ان تحریرات سے اس درجہ متاثر تھے کہ آپ نے آخرالذکر اقتباسات کی
نسبت تحریر فرمایا:

"یہ مت سمجھو کہ اس مصنف کا صرف یہ قول ہی قول ہے بلکہ حالات اور
واقعات موجودہ اہلِ اسلام سے اس کا ثبوت بھی ہے اور جب
اُن سب کو دیکھا جائے تو بجز رونے کے اور کچھ چارہ نہیں۔ اپنی ٹانگ
کھوٹ اور آپ ہی لاچار مریئے"[1]

ان خیالات کے ساتھ مسلمانوں کو ذلت سے نکالنے کے لئے سرسید نے دو
طریقے اختیار کئے۔ اوّل اصلاحِ معاشرت کے لئے سرسید نے ۱۸۵۷ء کے بعد
ہی سے انگریزی تمدن اختیار کر لیا تھا اور انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا تھا
جو عام مسلمانوں کو ناگوار تھا مگر انگلستان سے لوٹ کر سرسید نے یہ اضافہ کیا کہ اس
امر کی باقاعدہ تبلیغ شروع کر دی۔ یہی طریقہ ترکوں نے بھی اپنے ملک میں جاری کیا تھا۔
اس لئے سرسید کو اپنے خیالات میں بہت تقویت ہوئی۔ چنانچہ آپ نے تہذیب الاخلاق
میں کہا:

"ترکوں کا تمام لباس بجز ٹوپی کے بالکل یورپین ہے۔ سب نے
زمین پر بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے میز کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ میز پر چھری کانٹوں
سے کھانا کھاتے ہیں۔ اُن کے مکان کی آراستگی اور طریقہ بالکل یورپین
کا سا ہے۔ جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں فرنچ اور انگریزوں میں مل کر بیٹھتے
ہیں تو ہمرتبہ معلوم ہوتے ہیں اور اُمید ہے کہ روز بروز اور زیادہ مہذب
ہوتے جائیں گے۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی ہم یہی چاہتے

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۳

ہے کہ اپنے تعصبات اور نخوت خام کو چھوڑ دیں اور تربیت شائستگی
میں قدم بڑھائیں۔"

انگریزی تمدن عارضی علاج تھا

سرسید نے اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں بکثرت مضامین عمدہ دلیلوں کے متعلق شائع کئے جن میں قدیم طریقوں کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا ان کے جواب میں انگریزی معاشرت کے خلاف اخبارات میں مضامین نکلتے تھے اور ایک دوسرے پر پھبتیاں اڑائی جاتی تھیں جس سے مسلمانوں میں بھی بحثیں رہتی تھیں اور ان بحثوں نے ناگواری پیدا کر دی تھی۔ یہ یقینی امر ہے کہ حاکم و محکوم کے لباس اور طرز ماند و بود میں بہت زیادہ فرق ہونے سے بالعموم تمام ہندوستانی اور بالخصوص مسلمان جو تعلیم اور دولت میں پسماندہ تھے، خود اپنی نظروں میں بہت ذلیل ہو گئے تھے۔ اور بڑے بڑے عہدہ دار اور رؤسا انگریز حکام کے سامنے حقیر معلوم ہوتے تھے۔ ان کے ہاتھوں بے آبروئی سے ہر وقت خائف رہتے تھے۔ ریل کے ڈبے میں اگر ہندوستانی اور انگریز کا سامنا ہو جاتا تو بعض وقت ہندوستانیوں کو طرح طرح کی ذلتیں اٹھانی پڑتی تھیں اس لئے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت فوری علاج یہی تھا کہ روشن دماغ ہندوستانی انگریز حکام کا لباس اختیار کر کے اس ذلت کی کچھ تلافی کرتے۔ ہندوؤں نے ابتدا میں یہی کیا تھا اور انگریزی معاشرت اختیار کی تھی مگر یہ تبدیلی خاموش طریقہ سے کی تھی۔ برخلاف اس کے سرسید نے اس کو صراحت کے ساتھ ایک مشن کے طور پر کیا اس لئے انہیں سخت مزاحمت اور مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ مزاحمت صرف پرانے خیال کے مسلمانوں کی طرف سے نہ تھی بلکہ انگریز حکام کی طرف سے بھی تھی جو ہندوستانیوں کو اپنی وضع و معاشرت میں اپنے برابر دیکھنا پسند نہ کرتے تھے اس دوہری لڑائی میں سرسید کی ہمت

اور فقہاء کے فتوے جو دنیوی ترقی کے مانع ہوتے تھے انہیں قومی
تعصبات پر مبنی ہوتے تھے اور مسلمانوں کی پولیٹیکل حالت کو بھی اس سے
بہت کچھ تعلق تھا اس لئے سرسید نے مذہبی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔"

(ماخوذ از حیاتِ جاوید)

مندرجہ بالا نظریہ کے مطابق عیسائیوں کے ساتھ کھانے پینے میں چونکہ اُن کا ذبیحہ
مانع تھا اس لئے سرسید نے مسلمانوں کے لئے گردن مروڑی مرغی کا کھانا آیات و احادیث
سے جائز قرار دیا۔ جوتا پہن کر نماز پڑھنا عام طور پر معیوب تھا، کھڑے ہو کر پیشاب
کرنا اور داڑھی منڈانا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ان سب چیزوں کے جواز کو سرسید نے مذہب
سے ثابت کرنے کی کوشش کی اور قبل اس کے کہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی حقیقی ترقی
کے لئے دوسرے ذرائع اختیار کئے جاتے اس قسم کی بحثوں سے سرسید سے مسلمان
بالعموم بھڑک گئے۔ سرسید سے قبل راجہ رام موہن رائے نے انیسویں صدی کے شروع
میں بنگال میں جب ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کیا تھا تو اسی کے ساتھ
ہندوؤں کے تمدن و معاشرت اور مذہب کی اصلاح کی تھی اور ویدوں اور اپنشدوں کو
خدا کے قول اور فعل میں تطبیق کرنے کی کوشش کی تھی اسی کے ساتھ انہوں نے
برہمو سماج کا جس کے وہ بانی تھے، ایک مندر قائم کر کے اجتماعی عبادت کا انتظام کیا تھا
اور اس عبادت کی خصوصیت یہ رکھی تھی کہ اس میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب شریک ہو
اس طرح راجہ موہن رائے نے مثل دیگر مصلحین کے سوسائٹی کے اندر رہ کر اس کی اصلاح
کی تھی۔ ہندوؤں کے مذہب میں انفرادی عبادت کا طریقہ رائج ہے، اجتماعی نہیں مگر
راجہ صاحب نے اہتمام کے ساتھ مذہبی اور اجتماعی عبادت جاری کی تھی اور اس میں وہ خود
شریک ہو کر اور سوسائٹی کے اندر رہ کر اس کی اصلاح کرتے تھے۔ سرسید نے بھی بذریعہ
تحریرات کے خدا کے قول اور خدا کے فعل میں تطبیق کرنے والے مضامین کے ذریعہ

مسلمانوں کی ذہنی سطح بلند کرنے کی کوشش کی مگر یہ سب کچھ عام سوسائٹی سے علیحدہ رہ کر کیا۔ مسلمانوں کے مذہب کی خصوصیت جمعیت اور جماعت ہے۔ اور اُن کے ہاں انفرادی عبادت صرف مجبوری کی حالت میں کی جاتی ہے۔ مگر سر سیّد مسلمانوں کے مذہبی اجتماعات سے نہ صرف علیحدہ رہتے تھے بلکہ خوشی کے مواقع پر بھی مسلمانوں کے مفلس اور جاہل ہونے کا سوگ مناتے تھے۔ اور سیّد کے رفیق کبھی کبھی مسلمانوں کی بربادی کے متعلق مضامین لکھتے تھے جن میں روزہ رکھنے والوں اور تراویح پڑھنے والوں کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔

مذہب کے دراصل دو اہم جزو قرار دیئے گئے ہیں۔ ایک عقیدہ دوسرے عمل یا عبادت۔ مذہبی اصطلاح میں عقیدے کو ایمان سے اور عبادت کو اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر سیّد کا تمام تر زور صرف عقیدہ یا ایمان پر تھا۔ کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ مسلمان پادریوں کی تبلیغ اور علوم جدیدہ کے اثر سے مرعوب ہو کر عیسائی یا دہریئے نہ ہو جائیں۔ مگر عقیدہ کا تعلق چونکہ محض دماغ سے ہے اس میں دو آدمیوں کا بھی متفق ہونا مشکل ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جو چیز بہت سے آدمیوں کو ایک رشتہ میں پرونے والی اور جماعت بنانے والی ہے اور جس کا تعلق جذبات سے ہے وہ عمل یا عبادت ہے۔ غالباً اسی لئے عبادت پر حد درجہ زور دیا گیا ہے وہ اُسے عین اسلام اور دین قرار دیا گیا ہے۔ خود سر سیّد نے اس کی اہمیت کو ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے:

> "عبادت کے طریقے جو لوگوں نے بمقتضائے فطرت انسانی اُس کے لئے قرار دیئے ہیں وہ امور ہیں جن پر دین کا اطلاق ہوتا ہے"[1]

مگر حقیقت یہ ہے کہ سر سیّد کو عمل یا عبادت کے ذریعہ مسلمانوں کی جمعیت قائم رکھنے کی طرف توجہ نہ تھی۔ وہ ذہانت اور ذہنیت دونوں اعتبار سے عام مسلمانوں

---

[1] تفسیر سر سیّد جلد سوم ص ۳۸

فصل سوم

علی گڑھ کالج، مسلم یونیورسٹی اور دیگر درسگاہیں

مسلمانوں کی جداگانہ تعلیم کا فیصلہ

باب چہارم فصل چہارم کے مطالعہ سے ناظرین کو اس امر کا اندازہ ہوگا کہ کن وجوہ سے مسلمان تعلیم میں پسماندہ رہے اور کن حالات میں اُن کے متعلق پالیسی بدلی گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے گورنمنٹ کی اس بدلی ہوئی پالیسی سے کہاں تک نفع اٹھایا۔ اس وقت مسلمانوں کے سب سے بڑے اور مسلم رہنما سرسیّد احمد خاں تھے اُنہوں نے سرکاری نظام تعلیم پر متعدد بار اظہار رائے کیا تھا مگر سرسید کی کوئی تحریر ایسی نہیں ملتی جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ سرکاری نظام تعلیم سے مطمئن تھے بالخصوص انگلستان کے سفر میں وہاں کی یونیورسٹیاں دیکھ کر تو سرسیّد کا نقطۂ نظر تعلیم کے بارہ میں بالکل بدل گیا تھا اور انہوں نے اعلیٰ قسم کی تربیت کو جو سرکاری مدارس میں مفقود تھی تعلیم کا اہم جزو قرار دیا تھا۔ بہر نوع سرسیّد نے انگلستان سے لوٹ کر دسمبر ۱۸۷۰ء میں دو کمیٹیاں قائم کیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ا۔ "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان"، جس کی غرض اس اشتہار سے ظاہر ہوتی ہے جو سرسیّد نے دسمبر ۱۸۷۰ء میں جاری کیا اور جس کا منشا یہ تھا کہ انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے عام طور پر لوگ اُٹھا رہے ہیں اور مسلمان اُن سے مستفید نہیں ہوتے تو اُن کے اسباب دریافت کئے جائیں نیز یہ کہ اس بیماری کی اصل جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضروری ہے۔ پس مناسب ہے کہ مسلمانوں سے اس مسئلہ پر انعامی مضامین لکھائے جائیں چنانچہ اس اشتہار پر پچیس مضامین آئے جن میں

نواب محسن الملک، وقار الملک اور دوسرے قابل لوگوں کے مضامین تھے اُن کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

۱۔ ہندوستان کے سمجھدار مسلمان اُن تعصبات کو جو پرانے خیال کے مسلمان انگریزی تعلیم کی نسبت رکھتے ہیں لغو اور مسلمانوں کے حق مضر جانتے ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کی تعداد سرکاری مدرسوں میں بمقابلہ ہندو طلباء کے جتنی ہونی چاہیئے اس سے بہت کم ہے۔

۳۔ جن خیالات سے مسلمان سرکاری مدارس میں اپنی اولاد کو نہیں بھیجتے اُن میں سے کچھ ناواجب اور اکثر واجبی ہیں اور سرکاری طریقۂ تعلیم مسلمانوں کے لئے کافی نہیں ہے۔

۴۔ اگر گورنمنٹ مسلمانوں کے لئے اپنے طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلی بھی کر دے تو بھی اُن کی تمام ضرورتیں رفع نہیں ہو سکتیں۔

۵۔ مسلمانوں کو اپنے علوم قدیمہ کے محفوظ رکھنے، علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کرنے کے لئے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ وہ اپنی تعلیم کی فکر آپ کریں۔ اسی رپورٹ میں مجوزہ کالج کی اسکیم اور طریقۂ تعلیم بھی مندرج ہیں جو سر سید نے کمیٹی کے سامنے پیش کئے[1]۔"

کمیٹی مندرجہ صدر کا یہ فیصلہ گویا کہ جدید خیال کے اصحاب کا متفقہ فیصلہ تھا جس سے سر سید بھی کلیتہً متفق تھے۔ سب کے نزدیک یہ طے شدہ امر تھا کہ سرکاری

---

[1] حیات جاوید ص ۹۔

مدارس اور ان کا طریقِ تعلیم مسلمانوں کی ضروریات کے مطابق نہیں ہے اور اگر گورنمنٹ مسلمانوں کے لئے اپنے طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلی پیدا کر دے تو بھی ان کی ضرورتیں رفع نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے مسلمانوں کی تعلیم کا خود انتظام کیا جائے۔ اس نتیجہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ قدیم خیال کے جو لوگ انگریزی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھاتے تھے ان کا بھی کوئی قصور نہ تھا اور ان پر بے جا تعصب کا جو الزام لگایا جا سکتا تھا وہ صحیح نہ تھا۔ اسی طرح حکامِ گورنمنٹ بھی یہی کہتے تھے کہ مروجہ تعلیم مسلمانوں کے حسب حال نہ تھی اس لئے وہ مسلمانوں کی ضرورتوں کے مطابق تبدیلیاں کرنے کو تیار تھے مگر باوجود حکام کی اس آمادگی کے کمیٹی مذکور کے ممبر سرکاری تعلیم سے مستفید ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور انہوں نے یہ طے کیا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کا خود انتظام کریں۔ اس قرارداد کی وجہ سے مسلمان سرکاری سررشتہ تعلیم سے مستفید ہونے سے دیدہ و دانستہ محروم ہو گئے درانحالیکہ سررشتہ تعلیم کے اخراجات کا بار ہندو مسلمانوں پر یکساں تھا۔ مزید بدبختی یہ ہوئی کہ تعلیمی تحریک کے ساتھ اصلاح مذہب اور معاشرت کا کام بڑی شدومد کے ساتھ اٹھایا گیا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں علی گڑھ تحریک سے روز بروز مخالفت بڑھتی گئی۔

۲۔ تعلیمی مشن کے متعلق دوسرا کام سرسید نے یہ کیا کہ ۲۶ دسمبر ۱۸۷۰ء کو کمیٹی "خزینۃ البضاعۃ" قائم کی اور اس کے ذریعہ چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ گو عام مسلمان سرسید کی مذہبی تحریک سے ناراضی کی وجہ سے چندہ میں شریک نہ ہوئے۔ البتہ حکامِ وقت کی مدد سے چندہ ملنا شروع ہوا سب سے اول سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر صوبۂ متحدہ نے خود ایک ہزار روپیہ اپنی جیب سے دیا اور ان کی توجہ سے ہز ہائینس نواب کلب علی خاں والی رامپور اور دیگر رؤسا و عظام نے چندہ میں شرکت کی اور لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہند نے ۱۸۷۲ء میں یعنی کالج قائم ہونے سے

سب جج تھے جلسہ کا انتظام کیا۔ اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جو ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا سر سید
کی موجودگی میں جو بنارس سے جہاں وہ سب جج تھے علی گڑھ آگئے تھے مولوی محمد کریم
ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ کی صدارت میں مدرسہ کا افتتاح کیا گیا۔ اور پانچ برس کی کشمکش کے بعد چھاؤنی
کے پرانے بنگلوں میں یکم جون ۱۸۷۵ء سے تعلیم شروع کردی گئی۔ یہی اسکول بعد میں کالج اور پھر
یونیورسٹی بنا اور تمام دنیا میں مشہور ہوا۔

مسٹر بیک کا تعلیمی دور

علی گڑھ کالج کے سب سے پہلے پرنسپل مسٹر سڈنس تھے پھر حسب ضرورت انگریز استادوں کا تقرر ہوتا
رہا۔ مگر اس زمانہ کے انگریز اُستاد تعلیمی اوقات کے بعد طلباء سے الگ تھلگ رہتے
تھے۔ لیکن نومبر ۱۸۸۳ء میں مسٹر تھیوڈور بیک ایک ایسے انگریز ملے جو طلباء سے بڑی
محبت کا برتاؤ رکھتے تھے اور اپنا تمام تر وقت اُن کی بہبودی میں صرف کرتے تھے۔ اُن کے
آنے کے بعد جو انگریز اُستاد اور آتے رہے وہ مسٹر بیک کا طریقہ اختیار کرتے گئے۔
اسی زمانہ میں طلباء کی مختلف انجمنیں مثل یونین کلب، ڈیوٹی سوسائٹی، اخوان الصفا، بر
ادرہڈ وغیرہ کے مسٹر آرنلڈ اور مسٹر ماریسن کی سرپرستی میں قائم ہوئیں۔ کرکٹ، فٹ بال
کلبوں نے ترقی کی۔ ان انگریز استادوں کی وجہ سے حکام ضلع، کالج کے طلباء سے کھیلوں
اور پارٹیوں وغیرہ میں ملتے تھے اور اُن سے اچھا برتاؤ کرتے تھے اور رفتہ رفتہ انگریزی حکام
میں علی گڑھ کے طلباء کی نہایت وقعت ہوگئی جو سر سید کی انتہائی خوشی کا باعث تھی۔
چنانچہ ۱۸۹۰ء میں جب سر آکلینڈ کالون لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ علی گڑھ آئے تو
اُنہوں نے فرمایا:

"علی گڑھ کے طلباء اپنی تعلیم و تربیت کی علامات ایسے ہی واضح طور پر

ان طلباء کی جماعت جو وطن کے لئے باعث فخر ہوا کرتی ہے۔

ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور ہماری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلباء ظاہر کرتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کا ایک طالب علم فیاضانہ خیالات اور اعلیٰ تربیت اور آزادانہ خصائل رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ ہندوستانیوں کے اس فرقہ کا ایک نمونہ بن گیا ہے جو انگریزوں کی خواہش کی پوری داد دیتا ہے۔ لیکن وہ بھی یہ توقع کرتا ہے کہ ہم بھی ان کی خواہشوں کی اسی طرح پر داد دیں۔[1]

مولوی سمیع اللہ خاں کی علیحدگی

مگر اسی دور میں علی گڑھ کالج کو اپنے عروج و ترقی اور نیک نامی کا ایک ٹیکس دینا پڑا اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابتدائے قیام کالج سے اس کی انتظامیہ کمیٹی میں چند ایسے صاحب تھے جو زبان تعلیم کے حامی تھے۔ ان کے سرگروہ مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم تھے جو ابتدا سے سرسید کے شریک کار تھے اور انہیں کے اصرار سے علی گڑھ میں یہ مدرسہ کھولا گیا تھا۔ انہیں کے اثر سے علی گڑھ کے رؤسا کالج کے مددگار تھے۔

مولوی سمیع اللہ خاں اور ان کے ہم خیال صاحب کا نظریہ تھا کہ کالج میں نہایت بڑی تنخواہ کے یورپین پروفیسر زیادہ تعداد میں نہ رکھے جائیں بلکہ ہندوستانی پروفیسروں سے زیادہ کام لیا جائے۔ اس سے مسٹر بیک اور مولوی سمیع اللہ خاں میں کشیدگی رہتی تھی۔ اس باہمی کشاکش میں بالآخر مسٹر بیک کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے سرسید سے پرانی مینجنگ کمیٹی کو معطل کرا کے ایک جدید انتظامی جماعت "بورڈ آف مینجمنٹ" کے نام سے قائم کرائی جس میں کچھ تو ممبر مینجنگ کمیٹی کے اور کچھ ممبران اسٹاف میں سے لئے گئے اور تمام انتظامی کام اس جماعت کے سپرد کر دیے۔ اس میں مولوی سمیع اللہ خاں

---

[1] [illegible] مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ ص ۱۰۲

ناتمام پڑی تھیں۔ اسکول اور کالج کے طلبا کی تعداد ۲۲۳ تھی جن میں سے ۲۲۹ بورڈر اور ۴۰ ہندو طلبا رہتے تھے۔ سر سید کی ۲۲ سالہ سکریٹری شپ میں ۲۲۰ طلبا ڈگری یافتہ گریجویٹ ہوئے تھے جن میں سے ۷۰ مسلمان تھے۔ یہ تعداد اس وقت نہایت کم معلوم ہوتی ہے مگر اس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے غنیمت تھی۔ کیونکہ ۱۹۰۳ء میں جب جسٹس سید محمود نے تعلیمی نقشے بنائے تھے تو معلوم ہوا تھا کہ جس قدر مسلمان طلبا تمام ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے پاس ہوئے تھے اُن میں سے ایک چہارم کے قریب مسلمان علی گڑھ کالج کے تھے۔

نواب محسن الملک کے زمانہ کی ترقی

سر سید کے انتقال کے بعد نہ صرف یہ کہ کالج کی مرکزیت قائم رہی بلکہ نواب محسن الملک بہادر کی پالیسی سے پچھلے نقصانات کی تلافی کا دور شروع ہوا۔ سر سید کے انتقال کے بعد سید محمود صاحب علی گڑھ کالج کے آنریری سکریٹری ہوئے مگر اُن کی خرابیٔ صحت کی وجہ سے سر سید میموریل فنڈ کے ذریعہ فراہمیٔ روپیہ کا کام نواب محسن الملک مرحوم کے سپرد کیا گیا۔ اور دس ماہ بعد ۳۱ر جنوری ۱۹۰۰ء کو نواب صاحب موصوف، کالج کے آنریری سکریٹری منتخب ہو گئے۔ آپ کی کوشش سے تھوڑے عرصہ میں نہ صرف کالج کے ذمہ کا پچھلا قرضہ ادا کر دیا گیا۔ بلکہ لاکھوں روپیہ کا فنڈ جمع ہو گیا اور جو عمارتیں سالہا سال سے ناتمام پڑی چلی آتی تھیں وہ مکمل ہو گئیں۔ ایک بڑا کام نواب صاحب نے یہ کیا کہ اپنے جلسوں اور قومی تقریبات میں علمائے دین کو شریک کر کے جو رکاوٹ جدید اور قدیم تعلیم یافتگان میں عرصہ سے چلی آتی تھی۔ اُسے دور کیا اور اس طرح تمام مسلمانوں کو بہت کچھ ایک مرکز پر لانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کا ایک بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ تین سال کے عرصہ میں تعداد طلبا دوگنی کے قریب ہو گئی۔

انگریز استادوں کا احسان

سرسید کے انتقال کے بعد مسٹر بیک نے سرسید میموریل فنڈ اور علی گڑھ کالج کی ترقی کے لئے حد درجہ کوشش کی اس سے اُن کی صحت خراب ہوگئی ہر چند انہیں کام سے منع کیا گیا مگر بیماری کی حالت میں جب کہ وہ تعطیلات کے زمانہ میں شملہ میں تھے کام کرتے رہے حتیٰ کہ ستمبر ۱۸۹۹ء میں وہاں اُن کا انتقال ہوگیا۔ اُن کے انتقال کے بعد مسٹر (تھیوڈور) ماریسن نے بہ حیثیت پرنسپل کے نہ صرف تعلیمی کام بلکہ انتظامی کام حد درجہ کی تن دہی سے انجام دیئے طلباء کے لئے ملازمت کی ایجنسی قائم کی، اپنے غیر معمولی رسوخ سے جو انہیں حکام کے حلقہ میں حاصل تھا طلباء کو سرکاری ملازمتیں دلواتے تھے۔ تمام طلباء کالج کے لئے وہ بہ منزلہ خاندان کے ایک بزرگ کے تھے جو نہ صرف طالب علمی کے زمانہ میں بلکہ اُن کی کاروباری زندگی میں بھی یکساں مددگار رہتے تھے دورانِ ملازمت میں اپنے شاگردوں کی ترقی اور بہبودی میں برابر ساعی رہتے تھے اور مصیبت میں ان کی مدد کرتے تھے۔

مسٹر ماریسن کے زمانہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ نہ صرف جسمانی ہمت اور کھیل کود اور مباحثہ میں بلکہ تعلیم میں بھی علی گڑھ کے طلباء بہت نمایاں ہوئے اور نتائج کے اعتبار سے الہ آباد یونیورسٹی میں اونچے رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً تمام یونیورسٹی میں اوّل آتے تھے۔ جس سے ثابت ہوگیا تھا کہ مسلمان لکھنے پڑھنے میں دیگر اقوام سے کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو علی گڑھ کالج کے سابق طلباء کو اپنی مادر درسگاہ سے وابستہ کرنے کا تمام تر سہرا مسٹر بیک، مسٹر ماریسن، مسٹر [illegible] کے انگریز استادوں کے سر ہے جو طلباء کی مختلف انجمنیں بناتے، انہیں منظم کرتے، اُن سے بے انتہا محبت کرتے کالج چھوڑنے کے بعد اُن سے مستقل تعلقات رکھتے اُن کے سالانہ جلسے اور ڈنر منعقد کرتے اور ان کے

ذریعہ تمام ملک میں کالج کی خوبیوں کا پروپیگنڈا کرتے تھے کالج کے لئے چندے جمع
کرانے کے علاوہ اور تمام جو انگریز اُستادوں نے کئے وہ سب انہیں کی ایجاد تھے
جو اُنہوں نے درجہ کمال پر پہنچا دیئے انہیں کی بدولت یہاں کے پڑھے ہوئے طلبا
کی ایک مستقل برادری قائم ہو گئی جنہوں نے علی گڑھ کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا کر
علی گڑھ کالج کو تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا مرکز بنا دیا۔ اس قماش کے انگریز
اُستادوں کا سلسلہ آخر ۱۸۸۳ء سے شروع ہو کر اس وقت ختم ہوا جب کہ ۱۹۰۵ء
میں مسٹر ماریسن اپنی ذاتی ضروریات سے انگلستان چلے گئے۔ ان کے بعد جو انگریز
اُستاد آئے اُنہوں نے بھی ان روایات کو قائم رکھنے میں نہایت کوشش کی گو اب زمانہ
کی ہوا بدل گئی تھی۔ بیرونی سیاسی خیالات سے علی گڑھ کیسے علیحدہ رہ سکتا تھا۔ انگریز
اُستاد جو طلباء کے لئے ملک میں رسوخ کا ذریعہ سمجھے جاتے تھے ان کی نسبت
شبہ ہونے لگا کہ وہ حکومت کی پالیسی کا نفاذ کرتے ہیں۔ فریقین کی بدگمانی
نے محبت کی فضا کو شک و شبہ کی فضا میں بدل دیا۔ اور باوجود فریقین کی کوششوں کے
وہ کیفیت پھر عود نہ کر سکی۔

سکرٹری اور پرنسپل کا اختلاف

نواب محسن الملک بہادر کے انتقال کے بعد ۵ر دسمبر ۱۹۰۷ء کو نواب وقار الملک بہادر جو
ابتدا سے سرسید کی تحریک میں شامل تھے آنریری سکرٹری مقرر ہوئے۔ انہی کے
زمانہ میں ۲۲ر فروری ۱۹۰۹ء کو سر جان ہیوٹ لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ علی گڑھ تشریف
لائے اور اُنہوں نے ٹرسٹیان کالج کے ایڈریس کے جواب میں فرمایا کہ کالج سٹاف
(یعنی اُستادوں کی تعداد) کم ہے فی کلاس ساٹھ طلباء سے زیادہ نہ ہوں۔ پروفیسر
چار پیریڈ یعنی تین گھنٹے روز سے زیادہ نہ پڑھائیں۔ علی گڑھ کالج کو اعلیٰ
سے ڈگری کلاسوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ تعداد طلبہ

محمود جب ہوئے تو نواب وقار الملک نے مسٹر آرچبولڈ پرنسپل سے مطالبہ
کیا کہ یہ دریافت کیا جائے کہ استاد کتنا پڑھاتے ہیں اس کے جواب میں
پرنسپل صاحب نے اپنا استعفیٰ نواب صاحب کے پاس بھیج کر اس کی ایک نقل
لفٹنٹ گورنر صوبہ مربی کالج کی خدمت میں بھیجدی اس کے ساتھ انگریز استادوں
نے ایک متفقہ یادداشت پرنسپل صاحب کے پاس بھیجی کہ آپ نے آنریری سکریٹری
کی مداخلت پر تنگ آکر استعفیٰ دے دیا۔ اگر یہ معاملہ طے نہ ہوا تو ہز آنر لفٹنٹ
گورنر کی مداخلت سے طے ہوگا۔ انگریز استادوں نے یہ بھی لکھا ہیں کی بنا پر پرنسپل
صاحب ہز آنر لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں لکھنؤ گئے جنہوں نے نواب وقار الملک
کو بذریعہ تار کے لکھنؤ طلب کیا۔ پرنسپل اور نواب صاحب باقاعدہ وہاں لاٹ
صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔ پرنسپل صاحب نے اپنی چند شکایات پیش
کیں اور نواب صاحب سے جواب مانگا گیا۔ مجبوراً انہیں بغیر سابقہ تیاری کے جواب
جواب دینا پڑا۔ اسی وقت ہز آنر نے اپنا فیصلہ بھی دے دیا جو زیادہ تر آنریری
سکریٹری کے خلاف تھا۔ فیصلہ پر لاٹ صاحب نے نواب وقار الملک کے دستخط
کرانے چاہے۔ موصوف نے اس وقت انکار کر دیا مگر دوسرے روز لکھنؤ کے مقامی
ٹرسٹیان کے اصرار سے دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد نواب صاحب علی گڑھ
واپس تشریف لائے وہاں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور دیگر ٹرسٹی صاحبان نے اس فیصلہ
سے ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہز آنر کو بحیثیت مربی کالج کے حقوق صرف اس قدر
حاصل ہیں کہ وہ اپنی تجویز ٹرسٹیوں کے پاس بھیجیں جو یا تو اُن تجویز کو مانیں ورنہ
اپنے وجوہ اختلاف ہز آنر کے پاس بھیجدیں چنانچہ ٹرسٹیوں نے اپنا باقاعدہ جلسہ
کر کے اپنے وجوہ اختلاف ہز آنر کی خدمت میں بھیجدیئے دوسری طرف ان ٹرسٹیوں کی
تائید میں تمام ہندوستان کے مختلف شہروں میں مسلمانوں کے جلسے منعقد ہوئے

جن کی رو سے وہ ہز آنر کی خدمت میں بھیجی گئیں بالآخر نواب محمد مزمل اللہ خان صاحب
کی وساطت سے ہز آنر نے یہ طے کیا کہ ٹرسٹیوں کا ایک وفد ان کی خدمت میں حاضر ہو اور
باہمی تبادلہ خیال کیا جائے چنانچہ یہی ہوا اور ہز آنر نے متنازعہ فیہ امور کو دیکھ لیا اور
دو فریقین میں صفائی ہو گئی۔

مسلم یونیورسٹی کا قیام

یوں تو یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ اسی وقت سے تھا جبکہ
سرسید نے تعلیمی تحریک شروع کی تھی مگر اس کے نام سے
چندہ کا کام سرسید کے انتقال کے بعد شروع ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں ہز ہائی نس سر آغا خاں
نے نواب وقار الملک کی سکریٹری شپ کے زمانہ میں یہ تجویز کیا کہ آئندہ سال ملک معظم
ہندوستان آنے والے ہیں۔ اس وقت تک سرمایہ فراہم کر کے اس کا چارٹر (فرمان)
ملک معظم سے حاصل کیا جائے۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں نے اس تحریک کو بڑے زور سے
اٹھایا۔ تمام ملک میں انہوں نے چندہ کے لئے دورہ کیا اور بہت سے وفود بنائے
اس سے تقریباً مطلوبہ رقم جمع ہو گئی مگر یونیورسٹی کی شرائط پر مسلمانوں اور گورنمنٹ کے درمیان
اختلاف ہو گیا اور وہ روز بروز بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں نے جو یونیورسٹی قائم
کرنے کی تحریک بہت بعد میں اٹھائی تھی، انہیں شرائط کو منظور کر کے بنارس میں ہندو یونیورسٹی
قائم کر لی۔ اس زمانہ میں مسئلہ خلافت کی وجہ سے حکومت و مسلمانوں میں کشمکش ہو رہی
تھی۔ اور مسلمانوں کی ایک جماعت یہ یقین کرتی تھی کہ جو تعلیم حکومت کے زیر اثر
ہو گی وہ کسی طرح مسلمانوں کے مرض کی دوا نہ ہو گی اس لئے جب ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات
اٹھی جس میں سرکاری اور امدادی درسگاہوں سے مقاطعہ کیا جاتا تھا تو آزاد خیال مسلمانوں
نے علی گڑھ کالج پر حملہ کیا اور جب اس پر مستقل قبضہ کرنے میں ناکامی ہوئی تو پھر ایک
جداگانہ درسگاہ جامعہ ملیہ کے نام سے علی گڑھ میں قائم کر کے نئی تعلیمی تجویز کا تجربہ
اس میں شروع کیا۔ اسی زمانہ میں کارکنان علی گڑھ کالج نے گورنمنٹ سے انہیں شرائط پر

بلاشبہ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کے دو ٹکڑے ہو جانے سے اُس زمانہ میں مسلمانوں میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی مگر اب جب کہ جامعہ ملیہ علی گڑھ کالج کے تجربے سے علیحدہ ہو کر مثل چاند کے روشن و تاباں ہے تو وہ ہر طرح مادر درس گاہ کے لئے باعث فخر و مباہات ہے۔

مسلم گرلس کالج علی گڑھ

علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کا ایک اہم جزو علی گڑھ کا مسلم گرلس کالج ہے۔ سرسید احمد خاں مرحوم سے جب کوئی شخص لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام کرنے کو کہتا تو آپ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے لڑکوں کو پڑھا لو جب وہ پڑھ جائیں گے تو وہ لڑکیوں کو خود پڑھا لیں گے۔ چنانچہ سرسید کے پڑھائے ہوئے لڑکوں میں سب سے اول خان بہادر شیخ محمد عبداللہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل علی گڑھ اس کام پر کمربستہ ہوئے۔ موصوف نے سنہ میں ماہوار رسالہ خاتون جاری کیا اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کو لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی اُسی سال سب سے پہلے بارہ سو روپیہ سالانہ کی امداد حضور سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال نے مرحمت فرمانی شروع کی۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں آپ نے ہز آنر سر جیمس لاٹوش لفٹیننٹ گورنر میں ایک وفد لے جانا طے کیا۔ اس وفد میں جانے والوں کے نام بھی طے پا گئے مگر وقت پر بڑے رؤساء میں سے کوئی نہ پہنچا۔ شیخ صاحب معہ مولوی نسیم صاحب وکیل لکھنؤ اور خواجہ غلام الثقلین صاحب وکیل میرٹھ کے لاٹ صاحب کے سامنے حاضر ہوئے۔ لاٹ صاحب نے پوچھا کہ وہ صاحب وفد میں کیوں نہیں آئے۔ شیخ صاحب نے جواب دیا کہ حضور نے اب تک لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی ہے اس لئے یہ صاحب نہیں آئے۔ لڑکوں کی تعلیم کے لئے سرسید احمد خاں کے مددگار مسلمانوں میں اسی وقت پیدا ہوئے تھے۔ جب گورنمنٹ نے

سنہ ۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی نے اپنی علالت کی وجہ سے اس شعبہ کو چھوڑ دیا تو موصوف
کی تحریک سے (نواب صدر یار جنگ) مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شیروانی سکریٹری مقرر
ہوئے۔ کانفرنس کی طرف سے پانسو روپیہ سالانہ مقرر تھا، کریم روپیہ کو وثیقہ رقم متعلقہ
اس روپیہ سے اور نیز ڈپوٹی بک ڈپو کی مدد سے جو اس زمانہ میں (میر ولایت حسین صاحب
کے ہاتھ میں تھی ہر سال کتابوں کی معقول تعداد انگریزی سے ترجمہ ہو کر مستقل طور پر تصنیف
ہو کر شائع ہوتی رہی نواب صاحب موصوف کے دستکش ہونے پر ۱۹۱۰ء میں مولوی عزیز
مرزا نے اس شعبہ کا چارج لیا جن کا انتقال سال بھر بعد ہو گیا۔

۱۹۱۲ء کے اجلاس کانفرنس منعقدہ لکھنؤ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں آنریری
جوائنٹ سکریٹری کانفرنس نے مولوی عبدالحق کا نام پیش کیا اور بقول مولوی صاحب موصوف
"انہوں نے ڈرتے ڈرتے اس بار گراں کو اپنے ذمہ لیا" اس وقت سے ترقی اردو
کا کام پورے انہماک سے شروع کیا۔ چندہ دینے والے ارکان بنائے گئے۔ اسی
سال کے اجلاس ۱۹۱۳ء میں بمقام آگرہ اس شعبہ کی وہ سالانہ رپورٹ پیش کی وہ عجیب
تھی۔ ساڑھے سات ہزار روپیہ کے قریب اپنی ذاتی کوشش سے چندہ جمع کیا جو کانفرنس
کی سالانہ امداد کے علاوہ تھا۔ علیا حضرت سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال سے تین ہزار
روپیہ کی منظوری حاصل کی اور سب سے بڑی بات یہ کی کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کی سرپرستی
حاصل کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی طرف سے حیدرآباد میں دارالترجمہ قائم ہوا اور
آگے چل کر "عثمانیہ یونیورسٹی" قائم ہوئی جس میں زبان اردو میں جملہ علوم و فنون کی
تعلیم دی جاتی ہے۔

شعبہ ترقی اردو کی رپورٹ، کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں ۱۹۲۰ء تک پیش
ہوتی رہی۔ اس دوران میں مولوی صاحب کی بے انتہا سرگرمی اور کوشش سے شعبہ
نے "انجمن ترقی اردو" کی شکل اختیار کر لی جو سرمایہ کے اعتبار سے کانفرنس سے مستغنی

جمن۔ اس نے بے شمار کتابیں تیار کر کے شائع کیں۔ ہندوستان کے مختلف مقامات میں اس کی شاخیں قائم کیں۔ بہت سے کتب خانے جاری کرائے۔ غرضکہ جس کام کو سر سید نے اُٹھایا تھا اور ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے، ڈرتے ڈرتے اپنے ذمہ لیا تھا۔ اُسے نہایت جرأت مردانگی اور استقامت کے ساتھ انجام دیا۔ اور اپنا تن من دھن نثار کر کے، انجمن ترقی اُردو کو اعلیٰ مرتبہ پر پہنچایا۔ اُس کا صدر دفتر اورنگ آباد دکن میں تھا جو اب دہلی منتقل ہو گیا ہے۔ جہاں اس کے لئے عالیشان محل کی تعمیر زیر تجویز ہے۔

سر سید احمد خاں کی تحریک کے نتائج کے بعد آئندہ باب میں ہندوستان میں سیاسی تحریک پیدا ہونے کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے۔

اور انگریزی کتابوں کے ذریعہ سے پارلیمنٹ کی کارروائیاں ہندوستان میں آتی تھیں۔
جنہیں تعلیم یافتہ لوگ پڑھ کر ان سے متاثر ہوتے تھے۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا
کمپنی کی عملداری سب سے اول ۱۷۵۷ء میں قائم ہوئی اور سب سے پہلے گورنر لارڈ کلائیو
ہوئے۔ ان کی نسبت پارلیمنٹ میں یہ الزام قائم کیا گیا کہ انہوں نے علاوہ ۲ لاکھ ۳۴ ہزار روپیہ
انگلستان بھیجنے اور ۲۷ ہزار پونڈ سالانہ کی جائیداد پیدا کی۔ بعد میں لارڈ موصوف نے
خودکشی کر لی۔ دوسرے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز ہوئے ان کی کثرت دولت سے اور ان کی
بیگمات اودھ کے متعلق جو واقعات سے انگریزوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں تو ان پر بھی الزام
قائم کر کے پارلیمنٹ کی طرف سے مقدمہ چلایا گیا۔ اور ایڈمنڈ برک وغیرہ سے قابل ترین
انگریزوں کی تقریریں جب ہندوستان میں پڑھی گئیں تو ہندوستانیوں میں سیاسی روح پیدا
ہونے کے ساتھ ساتھ برطانیہ کی عظمت فراخدلی اور ہمدرد انگریزوں کی محبت اور ایسٹ انڈیا
کمپنی کی عداوت کے جذبات پیدا ہوئے۔ سلطنت برطانیہ کی عظمت ہندوستانیوں کے
دلوں میں اس وجہ سے اور زیادہ ہوئی کہ ہر بیس سال کے بعد کمپنی کے ٹھیکہ کی تجدید کے
وقت لوگوں کی باقاعدہ شہادتیں ہوتی تھیں جن میں ہندوستان کے معاملات کی خرابیاں
دکھائی جاتی تھیں چنانچہ ۱۸۱۳ء میں راجہ رام موہن رائے کی جب کہ وہ انگلستان گئے
ہوئے تھے شہادت ہوئی۔ یہ سب امور ایسے تھے جن کی وجہ سے ہندوستان کے
لوگ سمجھتے تھے کہ کمپنی کے اوپر بادشاہ اور پارلیمنٹ موجود ہیں جو ہندوستان میں
انصاف قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے باوجود دور دراز فاصلے کے یہاں کے لوگ اپنی
شکایات پارلیمنٹ تک پہنچاتے تھے حتیٰ کہ گورنروں اور افسروں کی شکایتیں پارلیمنٹ
تک بھیجی جاتی تھیں اور ان شکایات میں انگلستان کے ہمدرد انگریز امداد کرتے تھے
یہ درحقیقت ہندوستانیوں کا پہلا سیاسی سبق تھا۔ اسی طرح پارلیمنٹ کے حالات
پڑھ پڑھ کر ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ جذبات پیدا ہوتے تھے کہ وہ بھی

کوئی جماعت قائم کر کے دھواں دھار تقریریں کیا کریں۔

چنانچہ ۱۹۲۹ء میں سر چارلس ٹریولین نے جو سپریم کونسل ہند کے ممبر تھے اور بعد میں گورنر مدارس ہوئے اُن کے اثرات کا جو نوجوانوں پر انگریزی تعلیم سے پڑتے تھے حسب ذیل الفاظ میں تذکرہ کیا۔

"ایک تو وہ لوگ تھے جو ہمارے طرز حکومت سے ناواقف تھے اور اپنی بہبودی و ترقی کا کوئی ذریعہ بجز اس کے نہیں سمجھتے تھے کہ انگریزی حکومت کا خاتمہ ہو جائے برخلاف اس کے جب میں بنگال گیا جہاں ہندوستانی تعلیم یافتہ ہیں تو میں نے دیکھا کہ اُن کے دلوں میں یہ جذبہ ہے کہ وہ جوڑی یا مجسٹریٹی کی کرسیوں پر بیٹھیں یا ان کے دلوں میں کوئی قومی اسمبلی قائم ہو جس میں وہ انگریزی میں فصیح و بلیغ تقریریں کیا کریں۔ اول الذکر خیالات کا نتیجہ انقلاب ہوتا ہے اور ثانی الذکر خیالات کا نتیجہ ارتقاء یا تدریجی ترقی ہوتا ہے۔ اور انگریزی تعلیم کا نتیجہ تدریجی ترقی ہوگا نہ کہ انقلاب گرچہ دونوں کا انجام جلد یا بدیر انگریزی سلطنت کا خاتمہ ہو گا۔"[1]

دیگر ممالک کی آزادی کے اثرات

اہلِ ہند کے دلوں میں اپنے ملک کی شاہی حکومتوں کی بڑی قدر تھی۔ اور اُن کے مقابلہ میں انہیں کمپنی کی عملداری کی کوتاہیوں کی شکایتیں تھیں مگر اس کے ساتھ یورپ کی جدید حکومت سے اس امر کی بڑی توقعات تھیں کہ اس کے ذریعہ سے اس ملک میں جمہوری حکومت قائم ہوگی۔ اور ان کا ملک آزاد ہوگا۔ چنانچہ جب یورپ سے کسی ملک کے آزاد ہونے کی خبر آتی تو یہاں خوشی منائی جاتی اور جب اُس کے برخلاف خبر آتی تو

---

[1] تاریخ التعلیم انگریزی از سید محمود ص ۲۰۰

رنجیدہ ہوتا تھا۔ جب اسپین میں آئینی حکومت قائم ہونے کی خبر ہندوستان آئی تو راجہ رام موہن رائے نے کلکتہ ٹاؤن ہال میں ایک بڑی دعوت دی[1] اور جب فرانس کے انقلاب کی خبر آئی تو ہر وقت اسی کا خیال اور اسی کی باتیں ہوتی تھیں اور آزادی کی فتح پر خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ اسی طرح انیسویں صدی کے شروع میں آسٹریا کے لوگوں نے اپنے بادشاہ کو مجبور کرکے جمہوری حکومت حاصل کر لی تھی۔ مگر جب سنہ ۱۸۲۱ء میں ہندوستان میں خبر آئی کہ وہاں پھر شخصی حکومت قائم ہو گئی ہے تو راجہ رام موہن رائے کو بڑا رنج ہوا اور انہوں نے اپنے ایک خط میں اپنے ایک انگریز دوست کو لکھا:

"اب مجھے اُمید نہیں کہ میں اتنے دنوں زندہ رہوں گا کہ یورپ اور ایشیا کی قوموں کو آزاد دیکھوں۔ بالخصوص اہل یورپ کی نوآبادیات کو دیکھوں کہ وہ موجودہ حالت کے مقابلہ میں آزادی کے برکات سے متمتع ہوں[2]"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اس وقت تک ہندوستان کی حیثیت انگریزوں کی نوآبادیات کے بالکل مشابہ تھی۔ اور سب کی یکساں تمنا تھی کہ انہیں حکومت خود اختیاری حاصل ہو۔

بالآخر سنہ ۱۸۶۷ء میں کینیڈا کو حکومت خود اختیاری ملی اور اس کے بعد دس بارہ سال کے اندر تمام بڑی نوآبادیات میں اسی قسم کا طرز حکومت قائم ہو گیا۔ مگر ہندوستان بجنسہ اُسی غلامی کی حالت میں اپنی بدقسمتی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا رہا۔ پھر آئرلینڈ کے لئے مسٹر گلیڈسٹون کی وزارت کے زمانہ میں ہوم رول کا مسئلہ چھڑا تو اس سے قدرتی طور پر اہل ہند متاثر ہوئے اور جو خوشگوار توقعات انہوں نے انگریزی عملداری سے قائم کی تھیں اُن

۱؎ ماخوذ از سوانح راجہ رام موہن رائے مطبوعہ نٹیسن مدراس صفحات ۴۲، ۴۳

۲؎ ایضاً ص ۴۲

میں مایوس کر دیئے جانے پر اُن کے دلوں میں سیاسی احساس جاگزیں ہوا۔

اخبارات کی آزادی

ان سب امور سے زیادہ ہندوستان میں سیاسی حرکت پیدا کرنے میں اخبارات کا نمایاں حصہ رہا ہے اور ملک کی آزادی کے لئے تکلیف اُٹھانے اور قربانیاں دینے میں سب سے زیادہ پیش پیش اخبارات کے مالک اور ایڈیٹر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام مسٹر ولیم بولٹس کا ہے جنہوں نے ۱۷۶۹ء میں کلکتہ میں پریس کھولنے کا ارادہ کیا اور اس پر انہیں ملک بدر کر دیا گیا۔ پھر ۱۷۸۰ء میں بنگال گزٹ جاری ہوا جسے مسٹر جے اے ہکی شائع کرتے تھے۔ وارن ہسٹنگز نے اُسے ۱۷۸۰ء میں بند کر دیا۔ پھر ۱۷۹۶ء میں سر جان شور گورنر جنرل کے زمانہ میں مسٹر ڈوین گورنمنٹ ہاؤس میں طلب کئے گئے جسے وہ دعوت سمجھے۔ مگر وہاں پہنچنے پر حراست میں لے لئے گئے اور انگلستان بھیج دیئے گئے۔ انیسویں صدی میں پہلے شخص مسٹر بکنگھم تھے جو کلکتہ جرنل کے ایڈیٹر تھے۔ وہ ۱۸۲۳ء میں مسٹر ایڈمسن گورنر جنرل کی ناراضی کا نشانہ بن کر ہندوستان سے خارج البلد کئے گئے۔ اُن کے اخراج کے بعد گورنر جنرل موصوف نے ایک قانون جاری کیا جس کی رُو سے پریس کی آزادی پر بندشیں لگا دی گئیں۔ اُس کے خلاف ہندوستانیوں کی طرف سے ایک احتجاج کیا گیا۔ عرضداشت پر چند معزز بنگالیوں کے دستخط تھے۔ جن میں سے ایک راجہ رام موہن رائے تھے۔ یہ عرضداشت گورنر جنرل کے حکم ورن کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف اوّل عدالت العالیہ کے سامنے اور پھر ملک معظم کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اس عرضداشت میں جدید انگریزی سلطنت کی خوبیاں بیان کی گئی تھیں۔ مگر اسی کے ساتھ دکھایا گیا تھا کہ مسلمانوں کی حکومت میں ہر قسم کے لوگوں کو جملہ سیاسی حقوق، بڑے سے بڑے عہدے، فوجوں اور صوبوں کی گورنریاں مثل مسلمانوں کے حاصل تھیں۔ اور مذہب یا مقامِ پیدائش کی بنا پر کوئی شخص اُن مراعات سے محروم نہ رکھا جاتا تھا۔ وہ مراعات گرچہ اب ہمیں حاصل نہیں ہیں تاہم پریس کی آزادی سے

اس درد کی تلافی ہوجاتی ہے۔ لیکن پریس کی آزادی کے سلب ہوجانے سے تو صریح نقصان
کی تفصیلات ہے۔ اس سلسلہ میں زمانہ سابق کی نسبت دکھایا گیا کہ اگرچہ پہلے زمانہ میں اخبارات
نہ تھے جن سے بادشاہوں کو رعایا کی تکلیفوں اور شکایتوں کا علم ہوتا۔ مگر ان کی طرف سے
ہر صوبہ کے حاکم اور نواب کے ہاں وقائع نویس رہتے تھے اور جب ان میں سے کسی کا
ظلم یا زیادتی ثابت ہوجاتی تو باوجود بادشاہ کا رشتہ دار ہونے کے اس حاکم کی برخاستگی
عمل میں آتی تھی یا اسے سزا دی جاتی تھی۔ برخلاف اس کے انگریز کے لازم ہوجاو احکومت
لندن سے نصف کرۂ زمین کے فاصلہ پر ہندوستان میں حکومت کرتے تھے اور ان کی
زیادتیوں کے متعلق جب اخبارات میں شائع ہونے پر ان سے کوئی باز پرس نہ
کی جاتی تھی تو اب اخبارات کی آزادی چھن جانے پر رعایا کا کیا حال ہوجائے گا اور
وہ کیسے دیسی کی مخالفت پر پہنچ جائیں گے۔ آخر میں لکھا گیا کہ ہندوستانی پریس
سے یہ بندش نہ ہٹائی گئی تو باشندگان ہند دوامی طور پر مظلوم اور ذلیل رہیں
گے۔

۱۸۳۵ء میں سر چارلس مٹکاف نے اخبارات کو آزادی دے دی جس سے
بکثرت دیسی اخبارات نکلنے لگے۔ اور اس سے ہندوستانیوں نے ذہنی ترقی کی
پھر ۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن نے صرف دیسی اخبارات پر بندش لگائی اس وقت سے
انگریزی و دیسی اخبارات کے طریقوں میں دوری ہوگئی جس کا اندازہ مسٹر جان برائٹ
ممبر پارلیمنٹ کے حسب ذیل الفاظ سے ہوگا:

"یہاں دو قسم کے اخبارات ہیں ایک انگریزوں کے دوسرے
ہندوستانیوں کے۔ اول الذکر اخبارات عہدہ داروں کے ہیں جو ہندوستان
کے خرچہات گھٹانے کی تائید میں نہیں اور وہ ٹیکس پر حملہ کرتے رہتے
ہیں۔ دوسرے وہ اخبارات ہیں جنہیں سرکاری عہدہ دار اس نیت سے

دیکھتے ہیں کہ وہ ایسی باتیں تو نہیں لکھ رہے ہیں جو حکومت کو خوشگوار نہ ہوں یا ناراضی پھیلانے والی ہوں مگر کبھی اس غرض سے نہیں دیکھتے کہ لکھنے والے کی رائے سے متاثر ہوں۔

جس پریس کا اثر گورنمنٹ میں ہے وہ انگریزوں کا ہے جو ملک کی توسیع عہدوں اور تنخواہوں میں اضافہ اور انجام کار پنشنوں میں اضافے کا حامی رہتا ہے ؎

اس اقتباس نے اس امر کو بالکل واضح کر دیا کہ اُس وقت ہندوستان میں دو پارٹیاں قائم ہو گئی تھیں۔ ایک ہندوستانیوں کی، جو انتظامی اخراجات میں کمی چاہتی تھی۔ دوسری سرکاری عہدہ داروں کی جماعت تھی جو ذاتی ترقیوں کے درپے رہتی تھی مگر غنیمت یہ تھا کہ انگریزوں میں بہت سے ایسے اصحاب بھی تھے جو غریب ہندوستانیوں کی طرفداری کرتے تھے۔ ان میں سے چند اصحاب کے حالات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

انگریز حامیانِ ہند انگریزوں کے لئے ہندوستان کا سب سے زیادہ تابناک زمانہ وہ تھا جب کہ اُن میں سے بعض نواب صاحب ہندوستان کی حمایت کرتے تھے۔ اُن میں سب سے نمایاں نام

(الف) "مسٹر ایڈمنڈ برک" کا ہے جنہوں نے سب سے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے خلاف پارلیمنٹ میں معرکۃ الآرا تقریریں کی تھیں۔ اُن کے اقتباسات متعدد مقامات میں دیئے گئے ہیں۔

(ب) "جان برائٹ" دوسرے انگریز ہیں جنہوں نے ۱۸۵۳ء میں ہندوستانی

؎ اہلِ ہند کا ارتقاء دوازدہ سی مزمدار انگریزی ص ۱۰

کے نظام سلطنت کو ناقص قرار دے کر اس میں تبدیلی کرنے پر زور دیا۔ مقدمات کے
فیصل کرنے میں تعویق، عدالتوں کے ناقابل برداشت خراجات، پولیس کی خرابیاں،
سڑکوں اور نہروں کی طرف سے غفلت، لوگوں کا افلاس، باوجود اعلانِ شاہی کے بڑے
بڑے عہدوں سے ہندوستانیوں کی محرومی، ناقابلِ برداشت ٹیکسوں کی بھرمار، نمک
کے محصول کی ناواجبیت، غیر ضروری لڑائیوں پر مالیہ کی بربادی، سول سروس کی بڑی بڑی تنخواہیں،
کمشنروں کے غیر محدود اختیارات، پارلیمنٹ سے ہندوستان کی بے تعلقی اور اُس کی
طرف سے بے توجہی، غرض مشکل سے کوئی اُس زمانہ کی خرابی ایسی ہوگی جو ان کی فصیح و بلیغ
تقریروں میں بیان نہ کی جاتی ہو۔ موصوف نے ایک تقریر میں فرمایا تھا:

"ہندوستانیوں سے زیادہ کوئی حلیم قوم کبھی نہ تھی۔ تمہیں خدا نے
فرانس سے دس گونہ وسیع ملک دیا ہے جو تمہاری شان و شوکت کی حرص و آز
کی اشتہا کو بجھانے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے ملک گیری کو بند کرو
اور دانشمندی کے ساتھ اس ملک پر حکومت کرو جس سے رفتہ رفتہ اختلاف
قومیت رفع ہو جائے تاکہ وہ تمہیں بجائے فاتح کے اپنا محسن سمجھیں۔ اگر
تمہیں ان کا عیسائی بنانا پسند ہے تو بھی بجائے دوسرے طریقوں کے
عیسائیت کے اعلیٰ اخلاق اختیار کر کے اُن کے سامنے عمدہ نمونہ ہو"۔[1]

پھر جب ۱۸۵۸ء کے بعد گورنمنٹ ہند کی جدید تنظیم کا مسئلہ پارلیمنٹ میں پیش
ہوا تو جان برائٹ نے کہا کہ دنیا بھر میں کسی ملک میں ایسے سخت معاملات نہیں پائے
گئے جیسے کہ ہندوستان میں ٹیکس، پولیس، عدالت، تعلیمات اور مالیات کی ناقابلِ
اطمینان حالت ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے ۱۸۵۹ء کے اعلان شاہی

---

[1] ہند کا ارتقاء از ... مزیدر ... ص ...

کا مسودہ تیار کرنے میں جان برائٹ کا خاص حصہ تھا۔ ایک بار جب پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے ہندوستان کے لوگوں سے کچھ نامناسب باتیں منسوب کیں تو جان برائٹ نے غصہ میں آکر کہا کہ:

"میں اپنی موجودگی میں کسی شخص کو جو ہندوستانیوں کی تحقیر کرے بغیر ملامت کئے نہ چھوڑوں گا۔"

جان برائٹ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۸۹ء تک مسلسل ۴۲ سال پارلیمنٹ کے ممبر رہے اور برابر ہندوستان کی حمایت کرتے رہے۔ در لطف یہ کہ ہندوستان کے عہدۂ وزارت کے قبول کرنے سے ۱۸۶۹ء میں انکار کر دیا۔ ایسے ہی بے نفس انگریزوں کے نمونے تھے جو ابتدا میں بے کس و ناچار ہندوستانیوں کے سامنے آئے اور جنہوں نے ان میں اعلیٰ سیاسی جذبات پیدا کئے۔

(ج) "ہنری فاسٹ" ہندوستان کے تیسرے نامی بہی خواہ تھے جو ۱۸۶۵ء میں ممبر پارلیمنٹ ہوئے اور جنہیں "ممبر ہند" کا لقب عطا ہوا۔ یہی وہ صاحب ہیں جنہوں نے سب سے اوّل ۱۸۶۹ء میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ سول سروس کا امتحان جس وقت لندن میں ہو اُسی وقت کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں بھی ہوا کرے تاکہ ہندوستانیوں کو سول سروس میں آنے میں آسانی ہو۔ ہنری فاسٹ کا ہندوستان کے معاملات میں انہماک اُن کے حلقۂ ممبری کے فرائض میں مخل ہوتا تھا، جس کی وجہ سے اُن کے انتخاب کنندگان اُن کے شاکی رہتے تھے۔ مگر اپنے حلقہ میں بھی وہ ہندوستان کے افلاس و اس کی بے کسی کا وعظ کیا کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ:

"غریب ہندوستانیوں کو تو حق انتخاب بھی حاصل نہیں کہ وہ کسی ریلوے کمپنی ہی کی برابر پارلیمنٹ پر اثر ڈال سکیں۔ اس لئے میرے امکان میں جو کچھ

(۵) ہندوستان کے عہدہ دار

انگلستان کے علاوہ خود ہندوستان کے انگریز عہدہ دار ہندوستانیوں کی حمایت صاف الفاظ میں کرتے تھے جس کی صدہا مثالیں ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب مسٹر جان سیلوان ممبر اگزکٹو کونسل مدراس تھے۔ انہوں نے انگریز عہدہ داروں کی نسبت کہا تھا:

"انقلاب کے بعد بادشاہ کی جگہ کمشنر لیتا ہے اور اس کے تین چار ساتھی ایک درجن بڑے عہدہ داروں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہمارے چند سو گورے ہزاروں دیسی سپاہیوں کی جگہ لے لیتے ہیں جن کی پرورش ہندوستانی سردار کرتا تھا۔ اسی طرح وہ چھوٹا سا دربار غائب ہو جاتا ہے۔ تجارت گر جاتی ہے سرمایہ ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ غریب ہو جاتے ہیں اور انگریز خوشحال بنتا ہے۔ اور ایک اسپنج کی طرح گنگا کے کنارے سے دولت چوس کر دریائے ٹیمس کے کنارے لے جا کر نچوڑ دیتا ہے۔[1]"

اسی طرح ہندوستان کی سول سروس میں اور اعلیٰ عہدہ داروں میں بہت سے انگریز ایسے تھے جو ہندوستان کی حمایت میں حکام بالادست سے لڑتے رہتے تھے اور اگر ان پر سماعت نہ ہوتی تھی تو اپنے جلیل القدر منصب سے مستعفی ہو جاتے تھے۔ چنانچہ مسٹر ڈالفنسٹن گورنر بمبئی کو ہندوستانی مصنوعات کی حمایت میں گورنری کا عہدہ چھوڑ دینا پڑا۔ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہند افغانستان کی طرف برٹش گورنمنٹ کی پالیسی کے مخالف تھے۔ جب ان کی رائے نہ مانی گئی تو ۱۸۷۶ء میں مستعفی ہو کر چلے گئے۔ ان کی جگہ لارڈ لٹن آئے تو وہ بھی ہندوستانیوں کو انگریزوں کے برابر عہدے نہ ملنے پر سخت ناراضی کا اظہار کرتے رہے۔ پھر لارڈ رپن ۱۸۸۰ء میں آئے

---

[1] ہندوستان تاریخ برطانیہ کے عہد میں۔ ترجمہ [illegible]

جنہوں نے آتے ہی امیر کابل سے صلح کر کے جنگ افغانستان کا خاتمہ کیا۔ اور سرحد بڑھانے کے تباہ کن اخراجات کو بند کیا اور اندرون ملک میں دیسی اخبارات پر سے بندشیں اٹھا کر اہل ہند کو دماغی غلامی سے آزاد کیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کیا کہ لوکل بورڈوں میں طریقۂ انتخاب جاری کر کے حکومت خود اختیاری کی بنیاد قائم کر دی۔ لارڈ رپن نے ایک اور زبردست کام یہ کیا تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے "البرٹ بل" پیش کرایا تھا جس کی غرض یہ تھی کہ یوروپین اور امریکن مجرموں کے مقدمات ہندوستانی مجسٹریٹ کر سکیں تاکہ ہندوستانیوں پر سے اس ذلت کا دھبہ دور ہو۔ اس پر اینگلو انڈین اصحاب نے زبردست شورش کی۔ جن کے شریک ایک صوبہ کے لفٹنٹ گورنر و دیگر حکام تھے۔ ان اصحاب نے اس کام کے لئے "اینگلو انڈین ڈیفنس ایسوی ایشن" کے نام سے ایک جماعت بنائی اور اس کے ذریعے ہندوستانیوں پر سخت حملے کئے۔ چونکہ ہندوستانیوں کی اس وقت کوئی سیاسی جماعت نہ تھی اس لئے اینگلو انڈین اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے۔ اور فریقین کے سمجھوتہ سے قانون مذکور کو ڈسٹرکٹ جج اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ذاتوں تک محدود کر کے پاس کر دیا گیا۔ اس شورش کے دوران میں اینگلو انڈین اصحاب نے ایک سازش کی تھی کہ رپن کو زبردستی ایک جہاز میں بٹھا کر انگلستان کو چلتا کر دیا جائے۔ مگر اس کا پتہ چل گیا اور لارڈ رپن اس دست درازی سے محفوظ رہے۔ مگر دوسرے طریقوں سے اینگلو انڈین اصحاب نے ان کی تذلیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ جس کی وجہ سے انہیں اپنی مدت ملازمت ختم ہونے سے ایک سال قبل ولایت کو واپس جانا پڑا۔

جب لارڈ رپن اپنا دور حکومت ختم کر کے روانہ ہونے لگے تو تمام ہندوستان میں ان کے الوداعی جلسے اس دھوم کے ساتھ ہوئے کہ ان کی نظیر نہیں۔ رخصت کے وقت وہ مدراس نہ جا سکے تو وہاں کے لوگوں نے جلسہ کر کے ایک وفد منتخب کیا جو لارڈ رپن کو رخصت کرنے بمبئی گیا۔ سر سید احمد خاں بھی سیاسیات میں لارڈ رپن کے ہم عقیدہ

کے لئے وہ اصلاح رسوم اور اصلاح تمدن کی انجمن قائم کریں۔ مگر لارڈ ڈفرن نے انہیں حسب ذیل الفاظ میں یہ مشورہ دیا:

"اس ملک میں ایسے لوگوں کی کوئی جماعت نہیں ہے جو مثل انگلستان کے بطور ملک معظم کی مخالف جماعت کے کام کرتی ہو چونکہ انگریزوں کو یہ علم نہیں ہے کہ ہندوستانیوں میں ان کی نسبت اور ان کی پالیسی کی نسبت کیا خیالات ہیں۔ حاکم و محکوم دونوں کے لئے یہ مفید معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیاست داں اصحاب سالانہ جمع ہو کر گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ اس کا نظام کن امور میں ناقص ہے اور اس کی حالت کس طرح بہتر کی جا سکتی ہے۔"[1]

یہ مشورہ دیتے وقت لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم سے کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ وائسرائے ہیں تب تک اُن کے مشورہ کا اظہار لوگوں پر نہ کیا جائے۔ چنانچہ جب تک وہ وائسرائے رہے اس کا اظہار نہ کیا گیا۔ ورنہ اُن کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد یہ واقعہ روشنی میں آ گیا۔ لارڈ ڈفرن سے معاملات طے کرنے کے بعد مسٹر ہیوم انگلستان گئے اور وہاں پارلیمنٹ کے ممبروں سے گفتگو کی اور بہت سے بااثر اصحاب سے ہمدردی اور امداد کے وعدے لئے۔ ہندوستان واپس آ کر تمام صوبوں سے جدا جدا ڈیلیگیٹ طلب کر کے کانگریس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۵ء میں بمقام بمبئی منعقد کیا۔ اس طرح جو لوگ شریک جلسہ ہوئے وہ مختلف صوبوں و مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندے تھے۔ اسی لئے مسٹر ہیوم نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ یہ مجلس آئندہ زمانے میں ہندوستان کی پارلیمنٹ ہوگی۔ اس وقت کانگریس کا تعلق حکومت سے اس قدر قریب تھا کہ مسٹر ہیوم نے وائسرائے سے یہ کوشش کی تھی کہ کوئی گورنر کانگریس

---

[1] اہل ہند کا قومی ارتقاء، اے سی مزمدار انگریزی ص ۵۰

کی صدارت کرے گر وائسرائے نے کہا کہ گورنر کی موجودگی میں لوگ آزادی سے اظہار رائے نہ کر سکیں گے۔ اس لئے یہ مناسب نہیں۔ غرض ان خوشگوار حالات اور عمدہ فضا میں اس قومی پارلیمنٹ کی ابتدا ہوئی اور ہندوستان میں جو سیاسی احساس انگریزی عملداری کے آنے کے وقت سے پیدا ہوا تھا اُس نے بتدریج نشو ونما پا کر ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی شکل اختیار کی۔

نیشنل کانگریس قائم ہونے کے بعد اُس کی ایک شاخ لندن میں قائم ہوئی جس کے صدر مسٹر ولیم وڈربرن صوبہ بمبئی کے پنشنر سول سرونٹ تھے۔ وہ مسلسل ۲۹ سال تک جب تک کہ زندہ رہے کانگریس کی خدمت کرتے رہے۔ اور ایک ہزار پونڈ سالانہ کی کل پنشن اسی کام میں صرف کر دیتے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں انہوں نے بمبئی کے جلسہ کانگریس میں انگلستان سے آکر صدارت کی۔

فرقہ پرستی پیدا کرنے کے ذرائع

مگر کانگریس نے جو مفید سیاسی احساس پیدا کیا اُس کے مقابلہ میں جو فرقہ وارانہ احساس پیدا ہو کر بتدریج بڑھا اُس کے بارہ میں بھی کچھ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ احساس ایسے حکام کی بدولت پیدا ہوا جو قومی منافع کی بنا پر ہندوستانیوں کی ترقی کی ہر تدبیر کی مخالفت کرتے تھے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ہندوستانی خود اپنا انتظام کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ بڑے عہدوں کے اہل نہیں ہیں اور اس لئے باوجود بار بار شاہی اعلانات ہونے کے کہ ہندوستانی اور انگریز اعتبار سے برابر رکھے جائیں گے یہ احکام اور اعلانات پر عملدرآمد نہ ہونے دیتے تھے۔ ان صاحبوں کی سب سے بڑی کوشش یہ رہتی تھی کہ ہندوستانی متحد نہ ہونے پائیں اور اس کے لئے انہوں نے ہندوستان میں فرقہ وارانہ جذبات پیدا کئے جن کا یہاں وجود نہ تھا۔ اس امر کی تصدیق کہ زمانہ سابق میں یہاں مذہبی اختلافات نہ تھے بے شمار اقوال سے

ہوتی ہے۔ اُن میں سے صرف سر جان میلنارڈ سابق ممبر انتظامی کونسل پنجاب کا قول نقل کرنا کافی ہوگا۔ انہوں نے فرمایا:

"ہندو مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی"[1]

اُس کے بعد جو طریقہ اختیار کیا گیا اُس کا حال سر جان میلکم کے قول سے معلوم ہوگا وہ یہ ہے:

"اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ان کی تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں۔ جب تک یہ لوگ اس طریقے سے جدا رہیں گے اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی"[2]

اس اصول کے تحت میں بہت سی تدابیر اختیار کی گئیں جن میں سے بعض عارضی ہوتی ہیں اور بعض مستقل۔ ان میں مستقل وہ تاریخیں ہیں جو کمپنی کے دورِ حکومت میں لکھی گئیں۔ اُن میں سے ایک مشہور تاریخ "مسٹر ہنری ایلیٹ" کی ہے جنہیں یہ بات سخت ناگوار تھی کہ لکھے پڑھے ہندو مسلمانوں کے گزشتہ عہد حکومت کی تعریف کیا کرتے تھے اور عہد جدید کی عیب جوئی کرتے تھے۔ اس زمانہ میں جس قدر کتابیں اور تاریخیں خود ہندو مصنفین کی لکھی ہوئی تھیں اُن سب سے مسلمانوں کی عظمت و رفعت کا

---

[1] ماخوذ از ان ہیپی انڈیا مصنفہ لالہ لاجپت رائے ص ۳۰۹

[2] کمپنی کے عہد کی تاریخ تعلیم انگریزی نمبر ۲ ص ۴

خیمہ زن ہے، وہ اس کو بعض انگریز برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے سب سے اوّل سر ہنری ایلیٹ نے جو ہندوستان میں بڑے بڑے عہدوں پر رہے تھے اور آخر میں گورنمنٹ ہند کے صیغۂ خارجہ کے سکریٹری ہو گئے تھے ہندوستان کی ایک تاریخ لکھ کر اس کی پہلی جلد ۱۸۴۹ء میں شائع کی۔ یہی وہ سب سے پہلی تاریخ ہے جس نے زمانۂ قدیم اور بالخصوص مسلمانوں کے عہد کے خلاف خوب زہر اُگلا ہے اور تاریخی میدان میں یہی وہ پہلی کتاب ہے جس کے ترجمے دیسی زبان میں کرا کے اُن کے ذریعہ اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے غبار اور دشمنی کا بیج بویا گیا۔ اگر کسی شخص کو اس تاریخ کے لکھے جانے کا مقصد معلوم کرنا ہو تو اس کے لئے صرف اس کا دیباچہ پڑھ لینا کافی ہوگا۔ جس میں مورخ نے اپنے منشاء کو واضح اور صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے۔ مثلاً صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"بڑا افسوس ہندو مصنفین پر آتا ہے جن سے ہمیں توقع ہو سکتی تھی کہ اس قوم کے احساسات توقعات اور معتقدات ہمیں معلوم ہوتے مگر وہ تو احکام اور ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں ماہ محرم کو "محرم شریف" اور قرآن کو "کلام پاک" لکھتے ہیں۔ اپنی تحریرات کو "بسم اللہ" سے شروع کرتے ہیں"

ایلیٹ صاحب کو ہندو مصنفین کی اس بات پر سخت غصہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے مراسم اور مذہب کی اس قدر عزت کیوں کرتے ہیں۔ ایک قدیم ہندو مصنف نے کہیں لکھ دیا تھا کہ وہ اپنی رعیت کے قریب و اپنی قبر کے کنارے کھڑا ہے تو ایلیٹ صاحب ناراض ہو کر فرماتے ہیں کہ اُسے علم ہو گا کہ میری دوسری جلد اس کی لاعلمی میں چھپ جائے گی۔ پھر اس نے قبر کے کنارے کھڑا ہونا کیوں لکھا دراصل مصنف مذکور نے جو کچھ لکھا تھا وہ محض اس لئے لکھا تھا کہ ایک بات کو مختلف پیرایوں میں لکھنا لٹریچر کی ایک خوبی سمجھا جاتا ہے سب سے زیادہ ایلیٹ صاحب کو اس بات پر غصہ تھا کہ:

"اب جب کہ ہندو اپنے ظالم یعنی مسلمان آقاؤں کے چنگل سے نکل کر آزاد ہو گئے اور بغیر روک ٹوک کے اپنے دل کی باتیں ظاہر کر سکتے ہیں تب بھی ان غلامانہ ذہنیت کے لوگوں میں سے ایک بھی اپنے ملک کے محسوسات کے مطابق نہیں لکھتا۔ یا طول زمانہ کی محکومیت کے خیالات و جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔"

مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کو اگر مسلمانوں کے زمانہ میں تکلیف پہنچی ہوتی تو وہ آزادی کے زمانہ میں ضرور اس کا اظہار کرتے۔ البتہ ایلیٹ کو جب کہ اس سے سخت تکلیف پہنچی تھی کہ ہندو، مسلمانوں کے عہد حکومت کی تعریف کرتے تھے اور انگریزوں کے عہد کی عیب جوئی کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کوشش کی کہ تاریخوں کے پرانے انباروں میں سے ایسے ایسے واقعات نکالیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ مسلمانوں کا عہد ظالمانہ اور انگریزوں کا عہد خدا کی رحمت تھا۔ چنانچہ اس مقصد کو انہوں نے حسب ذیل الفاظ میں واضح کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"اگرچہ پرانی تاریخوں کی قدر و قیمت کم ہے تاہم بہ محنت ادا کرنے سے ان میں بہت سا مواد مل سکتا ہے ان کے ذریعہ جہالت کا مقصد دور کیا جا سکتا ہے جس نے ہندوستان کی معلومات کو تاریک کر رکھا ہے۔ اور یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد کی تاریخ جو کچھ کہ باقی ہے اس سے رعایا کو ان بے شمار فوائد کا احساس کرایا جائے گا جو ہماری نرم اور منصفانہ حکومت سے حاصل ہوتے ہیں۔"

ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایلیٹ صاحب کو گزشتہ زمانہ کے ہندو مسلمان مورخوں پر ہی غصہ نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ ہندوستانیوں پر بھی غصہ ہے جن کے لئے وہ تحقیر کے طور پر بابو کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

موجودہ تاریخ کا جزو بنا دی گئیں۔ چنانچہ یہی وہ تعلیم ہے جس کا پھل پکنے سے ہندوستان میں مذہبی افتراق پیدا ہوا۔ اس کی تصدیق سر جان مینارڈ ممبر گزٹمو کونسل پنجاب کے حسب ذیل قول سے ہوتی ہے :

"ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم عناد ہے اور یہ ایک حقیقت ہے۔ اگر یہ رجحان نہ ہوتا تو جدید حکومت قائم نہ ہو سکتی نہ برقرار رہ سکتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں میں عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی اگرچہ اس سے پہلے بھی بعض بادشاہ گزرے ہیں جن میں سے کسی نے غیر مسلموں پر جزیہ لگایا کسی نے ذبیحہ گاؤ پر مجنونانہ جوش میں سزائیں دیں لیکن یہ واقعات کبھی کبھی پیش آتے تھے شجر علم کا پھل پکنے سے پہلے عوام میں مذہبی افتراق نہ تھا خواہ ہندو ہوں یا مسلمان دونوں ایک ہی معبد میں مصروف پرستش ہوتے تھے۔"[1]

اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسا پھل تھا جس کے پکنے سے مذہبی فرق پیدا ہوا اس کا جواب صاف یہ ہے کہ نہ علوم قدیمہ میں کوئی ایسی بات تھی جس سے مختلف قوموں میں افتراق ہوتا نہ علوم جدیدہ میں کوئی ایسا مضمون تھا جس سے ہندو مسلم فسادات ہوتے اور نہ عام تاریخوں میں کوئی ایسی سمیت تھی۔ بلکہ سمیت جو کچھ تھی وہ اس قسم کی تاریخوں میں تھی جس کی ابتدا ایلیٹ صاحب نے کی تھی اس کے بعد مسٹر کیسن ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے اسی نوعیت کی ایک تاریخ لکھی جس کی شکایت سر سید احمد خان نے کی ہے۔

---

[1] تھوٹس آن انڈیا مصنفہ ۔ ۔ جیت رائے ص ۲۰۱

اسی قسم کی کتابیں سکولوں کے درس میں داخل کی گئیں ان کے ترجمے اُردو میں کرا کے تمام ملک میں پھیلائے گئے جنہوں نے ملک کے من کو باہمی خلفشار اور کشاکش میں بدل دیا۔ اسی قسم کی فضا میں ملک میں فرقہ وارانہ اور نام نہاد سیاسی جماعتیں پیدا ہوئیں جو ملک کی سیاسی ترقی میں مزاحم ہو کر غیر ملکی حکومت کی بالواسطہ امداد کرتی رہتی ہیں۔

سرسید احمد خاں کی سیاست کے پچیس سال

۱۸۵۹ء تا ۱۸۸۴ء

اسبابِ بغاوتِ ہند کی تصنیف سرسید کی سیاسی زندگی ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ اس ہنگامہ میں سرسید انگریزوں کے معاون و مددگار رہے جس کی تفصیل باب پنجم میں بیان ہو چکی ہے لیکن سرسید کے دل میں سیاسی احساس اور اپنے ملک کی ہمدردی کا جذبہ موجود تھا۔ ہنگامہ کے فرو ہو جانے پر جو لوگ انگریزی لکھے پڑھے تھے اُن کے دماغوں میں جدید قسم کے سیاسی خیالات پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی لیکن سرسید عجیب آدمی تھے اور طرفہ یہ کہ انگریزی ملازمت کی قید و بند میں جکڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہنگامہ سے متاثر ہو کر نہایت جرأت اور بہادری کے ساتھ ہنگامے کے اسباب، حکومت اور اُس کے عاملوں کی حکمت عملی پر نکتہ چینی کی اور اپنے سیاسی خیالات ۱۸۵۸ء میں دنیا کے سامنے اپنی کتاب "اسباب بغاوت ہند" کے صفحات میں پیش کر دیے جس کا خلاصہ باب دوم کی فصل سوم میں دیا گیا ہے۔ اس سے سرسید کی دھاک تمام ملک میں بیٹھ گئی اور وہ ہندوستان کے اوّل درجہ کے سیاسی لیڈر تسلیم کر لیے گئے۔ اُن کی تجویز کے مطابق گورنمنٹ نے

یہ طے کر دیا کہ وائسرائے کی کونسل میں تین ہندوستانی ممبر رکھے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۶۲ء
میں سر دنکر راؤ وزیر ریاست گوالیار سب سے پہلے ممبر اِن کونسل میں سے تھے۔

سرسیّد کا سیاسی مسلک

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگلستان کے کچھ انگریزوں
نے ہندوستان کے مفاد کے لئے انگلستان میں
ایک جماعت قائم کی اور اس کی شاخیں ہندوستان کے بڑے شہروں میں قائم ہوئی تھیں۔
اُن کے ذریعہ سے ہندوستانیوں اور بالخصوص زمینداروں کی عام تکالیف براہِ راست
پارلیمنٹ تک پہنچائی جاتی تھیں۔ اور چونکہ اس جماعت میں ملازمان سرکار بھی شامل ہو
سکتے تھے اس لئے برٹش انڈین ایسوسی ایشن گویا ایک نیم سیاسی جماعت تھی۔ سر
سیّد احمد خاں صاحب جب کہ علی گڑھ میں سب جج تھے تو اُنہوں نے ۱۰ مئی ۱۸۶۶ء
کو اس کی ایک شاخ علی گڑھ میں قائم کی جس کے افتتاحی جلسہ میں انگریزوں اور رؤسا اور
ملازمان سرکار شریک ہوئے۔ اُس زمانہ میں سیّد صاحب کے سیاسی مسلک کا اندازہ
اُن تحریروں اور مضامین سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ جن کے اقتباسات حسب ذیل
ہیں:

۱۔ ہندوستانیوں اور انگریزوں کی مساوات کے بارہ میں آپ نے
فرمایا:

"مجھ کو یقین واثق ہے کہ جب تک قومی امتیازات کو ملک کے
قانون میں دخل رہے گا اس وقت تک دونوں قوموں انگریز و ہندوستانی کے
درمیان میں اصلی دوستانہ خیالات کی ترقی میں مزاحمتیں قائم رہیں گی۔ زندگی
سوشل خوشی و موافقت پولیٹیکل ہمسری سے ایک ہی قانون کے زیر حکم
رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے جب کہ ہندوستان
کے تمام باشندے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یوروپین ہوں یا یوریشین

اِس بات کو سمجھنے لگے ہیں کہ وہ ہمسر رعایا ہیں اور اُن کے پولیٹکل حقوق یا
کانسٹی ٹیوشنل رتبہ میں قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیئے۔"

مندرجۂ بالا اصول کے تحت میں سرسید نے جب وہ وائسرائے کی کونسل کے
ممبر تھے۔ ۱۸۸۳ء میں البرٹ بل کی پُرزور تائید کی جو لارڈ رپن کے زمانے میں گورنمنٹ کی
کی طرف سے پیش ہوا تھا اور جس کا منشا یہ تھا کہ ہندوستانی مجسٹریٹ انگریزوں کے
مقدمات بھی طے کیا کریں۔ بالعموم انگریز حکام اس بل کے سخت مخالف تھے۔ صرف
لارڈ رپن وائسرائے اس کے حامی تھے۔ سرسید اسی مساوات کے احساس کی وجہ سے
آگرہ دربار میں جب انگریزوں کی کرسیاں چبوترہ اور ہندوستانیوں کی کرسیاں نیچے زمین
پر رکھی ہوئی دیکھیں تو اُس وقت ہندوستانیوں کی ذلت نہ برداشت کر سکے اور دربار
چھوڑ کر چلے آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی تعلیم پا کر ہر طرح انگریزوں
کے برابر ہو جائیں۔ اس بارہ میں آپ نے اپنے رسالہ تعلیم میں فرمایا:

"یہ بات گورنمنٹ پر لازمی ہو گئی ہے کہ ہندوستانیوں کو اس قسم کی
تعلیم دے کہ اُن کو اپنے حقوق حاصل کرنے کی قدرت ہو جائے۔ یا
یوں کہیئے کہ وہ اپنے تئیں ایسا لائق کرنے کی کوشش کریں کہ جو عہدے
انگریزوں کو ملتے ہیں وہ یہ بھی پائیں۔ اگر گورنمنٹ ہندوستانیوں کو اس
درجہ تک تعلیم نہ دے گی تو اس نے اپنے اقرار کو پورا نہیں کیا۔ اور ہندوستانیوں
کے حق میں ناانصافی ہوئی۔ کیونکہ وہ بے فائدہ ایسی کشاکش میں کیوں ڈالے
گئے کہ جہاں تک اُن کو پہنچانا ہے وہاں تک کا رستہ ہی نہیں۔"

ہندوستانیوں اور انگریزوں کا اختلاف مٹانے اور ان میں مساوات پیدا کرنے
کے لئے آپ نے ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی کی عمارت تعمیر
کرائی جس میں ہندو، مسلمان، انگریز تینوں قوموں کے لوگ شریک ہوتے تھے

اور علمی مضامین پڑھتے تھے۔

۲۔ طریقِ انتخاب کی تائید

سرسید انتخابی جماعتوں کو پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ ضلع کے انتظامات کے متعلق سرسید نے فرمایا:

"لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں حتی الامکان وہ لوگ شریک ہوں جو رعایا کے واسطے بطور اُن کے حامیوں کے منتخب کئے گئے ہوں۔"[1]

ہندوستان کے آئندہ نظام کے متعلق آپ نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ وہ دن کچھ دور نہیں جب کہ ہر ضلع میں سے ایک شخص کونسل میں خود داخل ہوگا اور تم ازخود ہی قانون بناؤ گے اور خود ہی اُس پر عمل کرو گے۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں تحریر فرمایا تھا:

"کوئی وقار اور کوئی عزت کسی قوم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ حکمراں قوم کے ساتھ درجہ حاصل نہ کرے اور اپنے ملک کی حکومت میں حصہ نہ لے۔ دوسری قومیں مسلمانوں یا ہندوؤں کی محرومی یا ادنیٰ عہدوں کو دیکھ کر عزت نہیں کر سکتیں بلکہ جو گورنمنٹ اپنی رعایا کو اس قسم کے اعزاز سے محروم رکھے وہ بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھی جا سکتی۔ عزت تب ہی حاصل ہوگی جب ہمارے ملکی بھائی حکمراں قوم کے ساتھ برابر کے عہدے رکھتے ہوں گے۔ گورنمنٹ نے صداقت اور نیک نیتی و انصاف سے اپنی ہر ملک کی رعایا کو ان عہدوں کو پانے کے لئے برابر حق دیا ہے البتہ ہندوستانیوں کے لئے بہت سی مشکلات اور بے انتہا موانع

---

[1] حیاتِ جاوید حصہ ۲ ص ۲۲۳

سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوب صورت دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر
ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔[۱]

سرسید بہ کل ملک کے لیڈر ۱۸۸۴ء میں جب سرسید علی گڑھ کالج کے چندہ کے لئے پنجاب گئے تو ہر مذہب و ملت نے بھی اُن کی یکساں آؤ بھگت کی اُس وقت آپ کے بارہ میں اخبار رہبر ہند لاہور نے لکھا تھا:

"ہم اُس شخص کے کارنامے سن کر جیسے کہ ہم اکثر اپنے مسلمان ہم وطنوں کی زبانی نہیں سنتے دل سے خوش ہوتے ہیں۔ جو نظیر سید احمد خاں بہادر نے قائم کی ہے وہ صرف ان کے ہم مذہبوں کی پیروی کے لائق نہیں ہے بلکہ ہندوؤں کی پیروی کے بھی لائق ہے۔"[۲]

گورنمنٹ اسکول جالندھر کے طلبا کے ایڈریس میں جسے بھگت رام نے پڑھا تھا تحریر تھا:

"جناب سید صاحب صرف ایک قوم یا ایک خاص فرقہ کے ہمدرد نہیں ہیں بلکہ وہ جناب بہ حیثیت ہمدرد مسلمین وہ ہمدرد ہندوستان کے ہندوؤں کو بھی اسی نظر عنایت سے دیکھتے ہیں کیونکہ وہ خاص مسلمانوں کے ہی ہمدرد نہیں ہیں بلکہ وہ کل ملک کے جاں نثار ہیں۔"[۳]

اسی طرح برہمو سماج اور آریہ سماج کے وفد نے اپنے سپاسنامہ میں لکھا تھا:

---

۱ سرسید کے آخری مضامین ص ۵۵
۲ [illegible] سید [illegible] لاہور
۳ ایضاً ص [illegible]

"ہم تمام ہندوؤں کی طرف سے آپ کی اُن کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو آپ نے قانونی کونسل میں اور نیز مختلف اوقات میں ہندوستان کے لئے کی ہیں۔ ہندو رجوہ مہاراجہ جن سے بہت کچھ اُمید کی جاتی تھی ملک کے خیر خواہ ثابت نہ ہوئے لیکن آپ نے حب وطنی کو ہاتھ سے نہ دیا اور البرٹ بل اور دیگر ملکی تجویزوں کی کونسل میں مستقلال کے ساتھ حمایت کی"[1]

سول سروس کی عمر کے بارے میں سر سید کی رائے

سول سروس کے امتحان کے داخلہ کے لئے جو اُس وقت صرف انگلستان میں ہوتا تھا ۲۱ سال کی عمر کی شرط تھی۔ مگر گورنمنٹ نے اُسے گھٹا کر انیس سال کر دیا تھا۔ اِس سے ہندوستانیوں کی کامیابی کے مواقع کم ہو گئے تھے اور وہ اُس کے لئے بے چین تھے (۳) سر سریندر ناتھ بنرجی نے اُس وقت بنگال کے لیڈر تھے اِس عمر کی قید کے خلاف احتجاجی جلسے کرنے کے لئے شمالی ہند میں دورہ کیا اور اس دورہ کے سلسلہ میں وہ مئی ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ تشریف لائے سر سید نے اُن کے جلسہ کا انتظام انسٹی ٹیوٹ ہال میں کیا اور خود اس کی صدارت کی اور اپنی تقریر میں مسٹر بنرجی کے مشن کی تائید کی اور جلسہ کے بعد ۵ر اور ۱۲ر جون کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں تائیدی مضامین لکھے اِس جلسہ میں مسٹر بنرجی نے جو تقریر کی اُس کا تذکرہ آیندہ فصل میں اپنے موقع پر آئے گا۔

خلافت اسلامیہ کے متعلق سر سید کا رویہ

اس سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ خلافت کے بارہ

---

[1] مقالات سر سید مطبوعہ کشمیری پریس ص ۵

میں سرسید کا مسلک بیان کیا جائے۔ خلافت اور خلیفہ کی اطاعت ہزار ہا سال سے سنیوں کے عقائد کا جزو رہی ہے۔ یہاں تک کہ سلاطین ہند خلیفۂ وقت کی اطاعت کا حلف اُٹھاتے تھے اور حکومت کے لئے اُس سے سند حاصل کرتے تھے اور اُن کے احکام کی تعمیل کرتے تھے۔ ہندوستان میں جب مسلمان بادشاہوں کی حکومت ختم ہوگئی تب بھی سلاطین ترکی کا اثر مسلمانوں کے دلوں پر قائم رہا اور جمعہ میں انہیں کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے اسی عقیدہ سے فائدہ اُٹھا کر انگریزی حکومت نے خلیفۂ وقت سے جنوری ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کے نام ایک خط منگایا تھا کہ وہ انگریزوں کے مقابلہ میں فرانسیسیوں کی امداد نہ کریں۔ اس کی تعمیل ٹیپو سلطان نے کی۔ سن ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزی حکومت نے سلطان عبدالمجید سے مسلمانان ہند کے نام ایک فرمان اس مضمون کا منگایا کہ چونکہ انگریز ہمارے دوست ہیں اس لئے تم اُن سے تعلق رکھو چنانچہ اس کا اثر ہوا۔[1]

انگریزی اور ترکی حکومت کے خوشگوار تعلقات کے زمانہ میں سرسید نے ترکوں کا لباس اختیار کیا تھا۔ جو یورپ کے لباس اور تمدن سے قریب تر تھا۔

مگر انگریزوں اور ترکوں کے درمیان ۱۸۸۲ء میں جب مصر کے بارہ میں بدمزگی ہوئی تو سرسید نے انگریزوں کی تائید کی اور اُن کی تحریک سے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب جو علی گڑھ کالج قائم کرنے میں اُن کے دست راست تھے حکومت کی طرف سے مصر بھیجے گئے اور انہوں نے مصری نوجوانوں کے خیالات انگریزوں کی طرف سے درست کرنے اور سیاسی امور میں مدد کرنے کا باعث

---

[1] "خلافت اور اسلام" انگریزی از ڈاکٹر سید محمود ص ۹۰

بنانے میں نمایاں حصّہ لیا جس کے صلہ میں انہیں سی۔ایم۔جی کا خطاب ملا۔

اُس زمانہ میں جمال الدین افغانی مصر سے ملک بدر ہو کر ہندوستان میں رہتے تھے۔ وہ مصریوں کی مخالفت کی بنا پر سر سید احمد خاں اور مولوی سمیع اللہ خاں سے نہایت ناراض تھے اور عربی رسالوں میں اُن کے خلاف مضامین نکالتے تھے۔

اس کے بعد چند سال بعد ۱۸۹۷ء میں ترکی اور یونان کی جنگ میں جب انگریزوں نے یونانیوں کی حمایت کی تو مسلمانانِ ہند نے عام طور پر انگریزوں سے ناراضی کا اظہار کیا۔ اس وقت سر سید اور حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس علی گڑھ نے انگریزوں کی حمایت میں مضامین کا ایک سلسلہ لکھا۔ عام طور پر مسلمانوں کی طرف سے کہا جاتا تھا کہ: أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ کی رُو سے مسلمانان خلیفہ وقت کی اطاعت لازم ہے۔ اُس کے مقابلہ میں سر سید کی طرف سے کہا جاتا تھا کہ: أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ میں انگریز خود شامل ہیں۔ یہ مولوی صاحب تو ترکی و تعلقات کے یہاں لکھے گئے ہیں۔ ورنہ اب تو نہ خلافت باقی رہی نہ اُس کی اطاعت۔

گذشتہ صفحات میں سر سید کے سیاسی کارناموں اور اُن کے سیاسی مسلک کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ مگر اب کچھ واقعات ایسے پیش آئے جن سے مسلمانوں کی سیاست کی باگ سر سید کے ہاتھوں سے نکل کر مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج اور اُن کے جانشینوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اس کی مفصل کیفیت آئندہ باب میں درج کی گئی ہے۔

تثلیثی دَور کی سیاست کے پچیس سال

سنہ ۱۸۸۵ء تا ۱۹۱۰ء

پچھلے باب کے آخر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سر سید احمد خاں باوجود حمایتِ تعلیم اصلاحِ مذہب اور جدید کاموں میں منہمک رہنے کے سیاسی امور میں کس طرح پیش پیش تھے۔ مگر اب مسلمانوں کی سیاست نے پلٹا کھایا جس کی تفصیل یہ ہے کہ نومبر ۱۸۸۳ء میں مسٹر تھیوڈور بیک علی گڑھ کالج کے پرنسپل ہوکر آئے۔ وہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کے سیاسی رہنما بن گئے۔ ان کے بعد کالج کے دو انگریز پرنسپل ہوئے وہ بیک کے قدم بقدم چلے اور حسن اتفاق سے تینوں صاحب مذہب عیسوی رکھتے تھے۔ اس لئے اس دور کا نام "تثلیثی دَور رکھنا" بے موقع نہ ہوگا۔ اس تثلیثی دَور کو تین فصلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جن میں سے پہلی فصل مسٹر بیک کی سیاسی خدمات کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

فصل اوّل

بیک کی رہنمائی کے پندرہ سال!

۱۸۸۵ء تا ۱۸۹۹ء

ہندو مسلم اتحاد کا آخری نظارہ

مسٹر بیک جب علی گڑھ کالج کے پرنسپل ہو کر آئے تو بالکل نوعمر تھے مگر ان کا دماغ بڑا سیاسی تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے اور کہا کرتے تھے کہ میرا ارادہ پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے کوشش کرنے کا تھا مگر سید محمود صاحب نے جب مجھے تحریک سرسید کے مقاصد بتائے تو میں اس ارادہ کو ترک کر کے یہاں چلا آیا۔ جب وہ کالج میں آئے تو ان کی نسبت عام شکایت تھی کہ وہ پڑھانے کی طرف توجہ نہیں کرتے اور سیر چلتے پھرتے میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے مولوی سمیع اللہ خاں ان سے ناراض تھے۔ مگر انگریز ہو کر ان میں ہندوستانیوں کے ساتھ اس قدر محبت کا تھا کہ ہر شخص ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ سرسید ابتدا ہی سے ان کے شیدائی ہو گئے۔ وہ اپنی تحریک کا انہیں قوتِ بازو اور حامی سمجھنے لگے اور تھوڑے ہی روز میں ان دونوں پر "من تو شدم تو من شدی" کی مثل صادق آنے لگی۔ اُن کے اس غیر معمولی طرزِ عمل کو دیکھ کر بعض لوگ مسٹر بیک کو شک کی نظر سے دیکھتے۔ چنانچہ (خان بہادر) مولوی بشیر الدین (اٹاوہ) اسی زمانہ میں مسٹر بیک کی نسبت کہا کرتے تھے کہ یہ اُسی قسم کے لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اول ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی بنیاد قائم کی تھی۔

پچھلے باب میں دکھایا گیا ہے کہ ۱۸۸۷ء میں سر سید احمد خاں کی صدارت

میں (سر) سریندر ناتھ بنرجی نے سول سروس کے امتحانات کے بارہ میں ایک تقریر کی تھی اُس تقریر کے وقت حاضرین کے جذبات کی جو کیفیت تھی اُس کا اندازہ نواب محسن الملک کے حسب ذیل الفاظ سے ہو گا:

«اُس روز کا جلسہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ اور وہ کئی طرح پر قابلِ یادگار ہے اُس کے بعد کبھی میں نے ایسا جلسہ نہیں دیکھا جس میں سیاسی یا نیم سیاسی امور کے لحاظ سے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے دلوں میں ایک قسم کے خیالات ہوں[1]»

اب سوال یہ ہے کہ سیاسیات میں ہندو مسلم یگانگت کا یہ جلسہ آخری کیوں تھا؟ اس کا جواب نواب صاحب موصوف ہی کے حسب ذیل الفاظ میں ملے گا:

«مسٹر بنرجی نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ ہم لوگ محصولات ادا کرتے ہیں اور ایک یوروپین کی طرف جو اُس وقت جلسے میں موجود تھے اشارہ کر کے کہا کہ یہ لوگ جس طرح ان کا جی چاہتا ہے ان محصولات کو صرف کرتے ہیں اور اُن سے حظ اُٹھاتے ہیں[2]»

بد قسمتی سے یہ یوروپین شخص مسٹر بیک تھے جن کی نسبت نواب محسن الملک نے فرمایا تھا کہ:

«وہ ہندوستان کے سیاسی معاملات میں محض نو آموز تھے انہوں نے مسٹر بنرجی کی تقریر کے وقت اپنے تئیں ایک عجیب مشکل کی حالت میں پایا»

---

[1] و [2] "ہندو مسلمانوں کے تعلقات" از نواب محسن الملک مندرجہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مئی ۱۹۰۳ء ص ۲

مسٹر نیبری کی اس تقریر کا یہ اثر مسٹر بیک موصوف پر ہوا اس کا مزید اندازہ نواب صاحب
میر ولایت حسین صاحب کے حسب ذیل الفاظ سے ہوگا جو اس وقت علی گڑھ تحریک کی
زندہ تاریخ ہیں:

"بابو صاحب نے امتحان مقابلہ سروس کی عمر بڑھانے، امتحان مذکور کو ہندوستان
میں ہونے، ہندوستانیوں کے والنٹیر بننے، لیجسلیٹو کونسل کے ممبر انتخاب
ہونے اور ہندوستان کے قانون میں ترمیم اور اسی قسم کی بہت سی اصلاحات
کی ضرورت کو بیان کیا۔ تقریر مغرب سے قبل شروع ہو کر نصف شب تک رہی
مگر ایسی دلچسپ تھی کہ سامعین یہی چاہتے تھے کہ وہ جاری رہے۔ جلسہ کے
اختتام پر مسٹر بیک طلبہ کے ساتھ پا پیادہ اپنی کوٹھی تک آئے۔ وہ لکچر کی بہت
تعریف کرتے تھے اور کہتے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پارلیمنٹ کا ممبر انگلستان
میں اپنی انتخاب کنندہ جماعت کو خطاب کر رہا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ
کوئی ہندوستانی شخص ہندوستانی سامعین کے سامنے تقریر کر رہا ہے
مگر فرماتے تھے کہ یہ تقریر ان سامعین کے مناسب حال نہ تھی۔ بنگالی اُس
زمانہ میں بزدل سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے بیک صاحب کے نزدیک یہ
خیالات اگر بنگال تک رہیں تو چنداں مضائقہ نہیں لیکن اگر یہ طوفان جو بنگالہ
سے چلا ہے شمالی ہندوستان میں پھیلا جہاں جنگجو قومیں آباد ہیں تو کیا
انجام ہوگا۔"

مسٹر بیک تا آخر عمر اس عقیدہ پر قائم رہے، مدت العمر ان کو یہی دھن
رہی کہ اس طوفان سے کس طرح شمالی حصہ ملک کو محفوظ رکھیں۔ اگر وہ
راجپوتانہ سے جو بات سنتے یا کسی راجپوت رئیس یا شہزادے یا پٹھان سے
ملتے تو یہی معلوم کرتے تھے کہ آپ جو بنگالیوں سے ملتے کیا یہ

گوارا کریں گے کہ ایک بزدل بنگالی آپ کے اُوپر حاکم ہو جائے جواب ہمیشہ نفی میں ملتا تھا۔ بعد ازاں فرماتے کہ اگر سول سروس کا امتحان ہندوستان میں ہونے لگا تو آپ لوگوں کی اولاد تو اس قابل ہی نہیں کہ مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہو فقط بنگالی امتحان سول سروس میں کامیاب ہو کر آپ صاحبوں پر حکومت کیا کریں گے۱؎۔

مگر اُس وقت تک سر سیّد پر بنگالیوں کے خلوص کا بڑا اثر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اُنہیں کی بدولت اس ملک میں علم و آزادی اور حب الوطنی کی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ سر سیّد بنگالیوں کو ہندوستان کی تمام قوموں کا سرتاج کہا کرتے تھے۔ وہ اُن پر فخر کرتے تھے۔ اس لئے ابتدا میں اُن پر مسٹر بیک کا جادو نہ چل سکا۔ گو مسٹر بیک نہایت خاموشی سے سر سیّد کا دل بنگالیوں کی طرف سے پھیرنے کا کام کرتے رہے۔ اُن کے سامنے اُس وقت دو کام تھے۔ ایک مولوی سمیع اللہ خاں کو کالج کے معاملات سے علیحدہ کرانا دوسرے ملک کی سیاسی تحریک کی طرف سے سر سیّد کو ہٹانا۔ مولوی سمیع اللہ خاں چونکہ سر سیّد کے عزیز اُن کے گوشت پوست اور قومی کاموں میں پورے مددگار تھے۔ اس لئے دونوں میں جدائی کرانا مشکل ترین کام تھا۔ اس کام میں مسٹر بیک کی کامیابی کا حال باب پنجم کی فصل سوم میں درج کیا جا چکا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ہندو مسلم افتراق کا کام سہل تر تھا۔ اس لئے مسٹر بیک کی ذہانت کے سامنے اِس کی کیا حقیقت ہو سکتی تھی۔

جب مسٹر بیک نے اس کام کا تہیّہ کیا تو جملہ اقوام ہند کی سیاست کی ایک یکجائی عظیم الشان نہر جو صدیوں سے جاری تھی۔ اُس سے ہندو مسلمان دونوں یکساں

۱؎ کانفرنس گزٹ علی گڑھ مورخہ ۸ نومبر [illegible]

سیراب ہوتے تھے۔ مسٹر بیک کا منصوبہ یہ تھا کہ مسلمان اُس سے متنفر ہو کر غیر ملکی انجینیروں کی امداد سے اپنے لئے ایک جداگانہ سیاسی نہر نکالیں اور آب رسانی کا کام اُنہیں کے سپرد کر دیں۔ اِس منصوبے کے ساتھ مسٹر بیک نے اپنا کام شروع کیا۔ اور سب سے اوّل انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کو حسبِ ذیل طریقے پر اپنے ہاتھوں میں لیا:

"آخر عمر تک سرسید علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر رہے مگر پچھلے دنوں بوجہ پیرانہ سالی اور کالج کے کاموں میں مصروفیت کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بہت کم مضامین لکھا کرتے تھے اس لئے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی حالت اچھی نہ تھی۔ مسٹر بیک کو تقریر کرنے اور مضامین لکھنے کا شوق تھا اور بار بار سریندر ناتھ بنرجی کی تقریر انسٹی ٹیوٹ ہال علی گڑھ میں سننے کے بعد وہ پولیٹیکل دنگل میں اُترنا چاہتے تھے اور بنگالیوں کے بڑے اثر کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ اور ابھی پائنیر وغیرہ بڑے اخبارات تک اُن کی رسائی نہ تھی اس لئے انہوں نے سرسید سے کہا کہ آپ کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ہے آپ اس کو میرے سپرد کر دیجئے میں اس کی حالت درست کر دوں گا۔ سرسید نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ اور مسٹر بیک نے بنگالیوں اور اُن کی تحریک کے خلاف انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹوریل کالم میں مضامین لکھنا شروع کئے جو سرسید سے منسوب ہوئے اور بنگالیوں نے سرسید کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ اور اس طرح بنگالیوں سے مخالفت شروع ہو گئی۔"[1]

---

[1] مضمون صاحب سید عترت حسین صاحب مندرجہ کانفرنس گزٹ علی گڑھ مورخہ ۱ نومبر ۱۹۱۵ء

کانگریس سے مسٹر بیک کی مخالفت

علی گڑھ میں مسٹر بیک جب کہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ پر قابض ہو کر بنگالیوں کے خلاف فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو زیر صدارت مسٹر ڈبلیو سی بونرجی وکیل کلکتہ منعقد ہوا جس میں بمبئی کے مشہور تاجر مسٹر رحمت اللہ سیانی اور دوسرے مسلمان شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں کانگریس کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے۔

۱۔ ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متضاد عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔

۲۔ اور اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو اُس کی دماغی اخلاقی اجتماعی اور سیاسی حالتوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔

۳۔ ایسے حالات کی اصلاح و ترمیم کرانا جو ہندوستان کے لئے مضرت رساں اور غیر منصفانہ ہوں اور اس طریقے سے ہندوستان و انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت کو استوار کرانا۔

ان مقاصد میں بظاہر کوئی بات قابلِ اعتراض معلوم نہ ہوتی تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ منظور شدہ قراردادوں کی نوعیت کیا تھی جو کانگریس کے پہلے جلسہ میں پاس ہوئیں وہ یہ ہیں:

۱۔ نظام ہند کے متعلق موجودہ تحقیقات کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے۔

۲۔ سکریٹری آف اسٹیٹ ہند کی کونسل توڑ دی جائے۔

۳۔ صوبوں کی قانونی کونسلوں میں منتخب شدہ ممبروں کی کافی تعداد بڑھا کر کونسلوں کو وسیع کی جائے اور پنجاب اور ممالک متحدہ میں کونسلیں قائم کی جائیں ممبروں کے سامنے بجٹ پیش ہوا کریں۔

۴۔ حسبِ سفارش انڈین آفس مورخہ ۱۸۶۰ء سول سروس کا امتحان انگلستان کی طرح اُسی وقت ہندوستان میں بھی ہوا کرے۔

۵۔ فوجی اخراجات میں جو اضافہ تجویز ہوا ہے وہ ملک کی آمدنی کافی نہ ہونے کی وجہ سے نہ کیا جائے۔

۶۔ شمالی برہما کا الحاق نہ کیا جائے اور اگر یہ کیا جائے تو اُسے مثل سیلون کے ایک کالونی (نوآبادی) قرار دیا جائے۔

مندرجہ بالا تجاویز میں دو تجویزیں سول سروس کے امتحانات اور کونسلوں کی توسیع کے متعلق خاص طور پر ایسی تھیں جن کا مضمون علی گڑھ کے جلسہ میں ۱۸۸۴ء میں (سر) سریندر ناتھ بنرجی نے اپنی تقریر میں بھی بیان کیا تھا۔ جس کی وجہ سے مسٹر بیک کو برہمی پیدا ہوئی تھی۔ اب جب کہ وہ کانگریس میں پاس ہو کر آ گئیں تو مسٹر بیک اور رجعت پسند انگریزوں کو کانگریس سے ایک مستقل رنجش اور بنائے مخاصمت پیدا ہو گئی اور اینگلو انڈین اخبارات جیسے پانیر الہ آباد وغیرہ میں مضامین کا ایک سلسلہ چھڑ گیا جن کے لکھنے میں مسٹر بیک کا بڑا حصہ تھا۔ اس منزل پر سرسید نے کوئی اظہار خیال نہیں کیا۔ البتہ اگلے سال دسمبر ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس علی گڑھ میں قائم کی گئی جس کا نام بعد میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کر دیا گیا۔ اس جماعت کے تذکرے کرتے وقت سیاسی امور کے بارہ میں سرسید نے مندرجہ ذیل اظہار خیال فرمایا:

"جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولیٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی اس سے میں متفق نہیں ہوں بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو بلکہ صرف تعلیم کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔"

کانگریس سے سرسید کی مخالفت

کانگریس کا دوسرا اجلاس آخر دسمبر ۱۸۸۶ء میں زیر صدارت مسٹر دادا بھائی نوروجی جو پارسی

تھے۔ بمقام کلکتہ منعقد ہوا اُس میں حسبِ ذیل تجاویز پاس ہوئیں:

١۔ جوری کے ذریعہ سے مقدمات طے کئے جایا کریں۔

٢۔ عدالتی اور عاملانہ اختیارات رکھنے والے افسران جُدا جُدا مقرر کئے جائیں۔

٣۔ ملک کی حفاظت کے لئے ہندوستانیوں کو والنٹیر بنانے کا سلسلہ جاری کیا جائے۔

مندرجہ بالا دونوں سالوں کی تجاویز میں کوئی تجویز ایسی نہ تھی جو کسی ہندوستانی کے خلاف ہو۔ سول سروس کے امتحان کے مسئلہ میں سر سید ضرور مخالف تھے۔ مگر جب کہ اُن کا مشن یہ تھا کہ تعداد میں گرچہ کتنے ہی کم مسلمان تعلیم پائیں مگر جتنے پائیں وہ اعلیٰ پایہ کے ہوں اور بمنزلہ آسمان کے ستاروں کے ہوں تو یہ تجویز اُن کے منشا کے خلاف نہ ہو سکتی تھی۔ جوری کی تجویز ہندوستانیوں کی عزت سے خالی نہ تھی جس کے سر سید ہمیشہ سے کوشاں تھے۔

عدالتی اور عاملانہ اختیارات مسلمانوں کی عملداری میں جدا جدا تھے۔ مگر کمپنی نے اُنہیں یکجا کر دیا تھا اور پھر ١٨٣٣ء میں علیحدہ علیحدہ کیا تھا۔ لیکن ہنگامہ غدر کے بعد ١٨٦١ء میں پھر یکجا کر دیا۔ جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کے ساتھ سخت بے جا ناانصافی ہو رہی تھی۔ اس کا جدا ہونا ہر ہندوستانی کے حق میں بہتر و مفید تھا۔ ملک کی حفاظت کے والنٹیروں کا بھرتی ہونا عین مسلمانوں کی طبیعت کے موافق تھا اور اس ذلت کو مٹاتا تھا جو دیسی عیسائیوں کے مقابلہ میں ہندو مسلمانوں کو ہو رہی تھی اور جس کے مٹانے میں سر سید ہمیشہ ساعی رہتے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر کانگریس کی تجویز کونسلوں میں ممبروں کی توسیع کے متعلق تھی اور جن صوبوں میں قانونی کونسلیں نہ تھیں ان کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جو سر سید کا عین مقصد رہا تھا۔ اب کانگریس سے سر سید کے تنفر کی بنا جو وجہ ہوئی اس کو ہم وقت میں سے بعض صاحب نے کانگریس کو

ایک انقلابی تحریک ٹھہرایا اخبار پائنیر الٰہ آباد نے جو نیم سرکاری اخبار تھا لکھا کہ اس تحریک
کو دبانے کے لیئے نصف درجن پولیس والے کافی ہوں گے۔ اسی قسم کی باتیں مسٹر بیک
کہتے رہتے تھے۔

سرسید کو یقین تھا اور صحیح طور پر یقین تھا کہ مسلمان آئینی جد و جہد سے ناآشنا
ہیں۔ ہندوؤں کی تعلیمی تحریک ۱۸۱۶ء میں شروع ہوئی تھی جب کہ انہوں نے ہندو کالج
قائم کیا تھا۔ اور جس کو اس وقت ستر سال ہو چکے تھے اس لئے ہندو انگلستان کے
حالات پڑھ کر آئینی جد و جہد کی نوعیت سے خوب واقف ہو چکے تھے۔ برخلاف اس
کے سرسید کی تعلیمی تحریک کی عمر ابھی بارہ سال کی نہ ہوئی تھی۔ اس لئے مسلمان زمانۂ جدید
کی جد و جہد سے بالکل نابلد تھے۔ اس بارہ میں پنڈت جواہر لال نہرو نے نہایت منصفانہ
طریقے سے لکھا ہے:

"سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ
کرنے پر صرف کر دینی چاہئیں یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے
میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں
لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے
غلام بن جائیں گے جو تعلیم میں بھی اُن سے بڑھ کر تھے اور معاشی اعتبار سے
بھی زیادہ مضبوط تھے"[1]

سب سے بڑھ کر سرسید کو مسلمانوں سے یہ اندیشہ تھا کہ وہ قدیم طریقہ کے مطابق
سلطنت سے اپنی ناراضگی کا اظہار بذریعۂ انقلاب کریں گے۔ سرسید نے چونکہ ۱۸۵۷ء
کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اس لئے وہ ہر قسم کی شورش کو ملک کی ترقی میں

---

[1] میری کہانی حصہ دوم صفحہ ۳۰۳ — از پنڈت جواہر لال نہرو

مانع اور ہارج سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے:

"اگر وہ ۱۸۵۷ء کا واقعہ ظہور میں نہ آتا تو آج ہمارے سینکڑوں جوان والنٹیر ہوتے ایکٹ اسلحہ وجود میں نہ آتا اور ہم میں بہت سے لوگ فوج کے کپتان اور کرنیل و جرنیل نظر آتے"

انہیں خیالات کی وجہ سے انہوں نے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت سے روکا۔ اُس وقت سر سید کی حالت بجنسہٖ مہاتما گاندھی کے مانند تھی جب کہ ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے چورا چوری کے بلوہ کی وجہ سے ملک کو سول نافرمانی کا اہل نہ پا کر فوراً اُس کے بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔

مختصر یہ کہ سر سید نے اُس وقت جو کچھ کیا نہایت صداقت و نیک نیتی کے ساتھ قوم کے حق میں مفید سمجھ کر کیا۔ البتہ اُس کا ایک مضر پہلو یہ ہو گیا کہ سر سید کے اس میلان سے مسٹر بیک نے فائدہ اُٹھا کر اُن سے لارڈ رپن اور دوسرے لبرل انگریزوں کی پارٹی چھوڑا دی اور انہیں کنسرویٹو پارٹی کا پرجوش حامی و مددگار بنا دیا جو ہندوستانیوں کو حکومت کا نااہل قرار دے کر اُن کی ترقی میں روڑے اٹکایا کرتی تھی۔ اس کا قلق سر سید کے پرانے معتقدوں اور قدردانوں کو بہت زیادہ تھا، جن میں سے ایک مسٹر ہیوم "پدرِ کانگریس" تھے۔ اُنہوں نے اس رنج میں سر سید کو ۱۸۸۷ء میں ایک کھلی چٹھی لکھی تھی جو سر سید کے جواب کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی تھی۔ پھر اس کے چند سال بعد جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مسٹر ہیوم سے انگلستان میں ملے تو اُن سے موصوف نے فرمایا:

"سب سے پہلی چیز جس نے نیشنل کانگریس کی قسم کی کسی تحریک کے جاری کرنے کا خیال میرے دماغ میں پیدا کیا وہ خود سر سید کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" تھی۔ لیکن اب وہی کانگریس کی مخالفت

کر رہے ہیں۔[1]

اسی ۱۸۸۷ء میں مسٹر بیک اور مسٹر ہنری کاٹن سابق ممبر سول سروس کے درمیان کانگریس کے بارہ میں مضامین کا ایک سلسلہ جاری رہا اور یہ سال انہیں اختلاف میں گزرا۔

مدراس کانگریس میں مسلمانوں کا حصہ

اب کانگریس کا وہ اجلاس ہوا جس کے صدر بمبئی کے نامور مسلمان بدرالدین طیب جی تھے

یہ اجلاس کرسمس ۱۸۸۷ء میں مدراس میں منعقد ہوا۔ اس میں آنریبل میر ہمایوں جاہ، حاجی محمد عبد الشکور بادشاہ، حامد علی خاں علیگ بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ اور علی گڑھ کے حافظ عبدالرحیم وکیل شریک تھے۔ اس اجلاس سے قبل مسلمان کافی تعداد میں غالباً اس لئے نہیں آتے تھے کہ ابتدا میں کانگریس کے دعوت نامہ میں لکھا گیا تھا کہ ڈیلیگیٹ انگریزی سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں جس کی مسلمانوں میں کمی تھی۔ نیز کانگریس کی تمام کارروائی انگریزی زبان میں ہوتی تھی جو مسلمانوں کی شرکت میں ایک رکاوٹ تھی۔ تاہم مدراس کے اجلاس میں خود مسلمان شریک ہوئے۔ مدراس کے گورنر نے بھی ممبران کانگریس کو ایک ایوننگ پارٹی دی تھی جس کے معنی یہ تھے کہ حکام بالا اس وقت اسے اچھی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس جلسہ میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں:

۱۔ اعلان شاہی کے مطابق جو پہلے ہو چکا ہے ہندوستانیوں کو فوج کے ملکی عہدوں پر مقرر کیا جائے اور ہندوستان میں ایک فوجی کالج قائم کیا جائے۔

۲۔ قانون اسلحہ میں ایسی ترمیم کی جائے کہ اس کی رو سے زیادہ لوگوں کو ہتھیار استعمال کرنے کا اختیار رہے۔

۳۔ جن لوگوں کی آمدنی ایک ہزار روپیہ سال سے کم ہے ان پر سے انکم ٹیکس معاف

---

[1] [illegible] دسمبر ۱۸۸۷ء

کیا جائے۔

۴۔ ہندوستانیوں کے افلاس کو مدِ نظر رکھ کر ان کے لئے صنعتی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

کانگریس کے اجلاس کے زمانہ میں انہیں تاریخوں میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس (کانفرنس) کا دوسرا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہو رہا تھا۔ اُس کے اختتام پر ایک پبلک سیاسی جلسہ میں (سر سید) احمد خاں نے اپنی پہلی مشہور اسپیچ کانگریس کے خلاف دی۔ اس کے پڑھنے سے تعجب ہوتا ہے کہ "اسباب بغاوت ہند" کے مصنف کی زبان سے ایسی باتیں کیونکر نکلی ہوں گی۔ مثلاً:

الف۔ سر سید ہمیشہ اس بات پر بے حد زور دیا کرتے تھے کہ ہندوستانی اور انگریز تجربہ میں بالکل برابر قرار دیئے جائیں۔ اُس کے مقابلہ میں اب جو سر سید نے انتخاب کے خراب نتائج کے متعلق کہا اُس میں خود ہندوستانیوں میں بھی امیر و غریب کا امتیاز کیا۔ اس بارہ میں آپ نے فرمایا:

"آپ خیال کریں کہ وائسرائے کے ساتھ کونسل میں بیٹھنے کے لئے واجبات سے ہے کہ ایک معزز شخص ملک کے معزز شخصوں میں سے چنا جائے۔ کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجہ کا آدمی گو اُس نے بی اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کی اور گو وہ لائق بھی ہو اور ان پر بیٹھ کر حکومت کرے ان کے مال جائیداد و عزت پر حاکم ہو۔ کبھی نہیں۔ کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا۔ گورنمنٹ کی کونسل کی کرسی نہایت معزز ہے۔ گورنمنٹ مجبور ہے کہ سوائے معزز کے کسی کو نہیں بٹھا سکتی اور نہ وائسرائے کسی کو مائی کولیگ یا مائی آنریبل کولیگ یعنی برادر معزز صاحب کہہ سکتا ہے نہ شاہانہ ڈنروں میں اور نہ شاہی جلسوں میں جہاں ڈیوک و ارل بڑے بڑے معززین شامل ہوتے

میں بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس لئے گورنمنٹ پر یہ الزام کسی طرح عائد نہیں ہو سکتا کہ رئیسوں کو کیوں منتخب کرتی ہے۔"

ب۔ ہندوستان میں سول سروس کے امتحان کی تجویز کی نسبت سیّد صاحب نے فرمایا:

"غور کیجئے کہ مقابلہ کے امتحان کا اصول جو ولایت میں ہے اُس کا کیا نتیجہ ہے یہ امر آپ کو نا ہے کہ ولایت میں ہر شخص اعلیٰ و ادنیٰ ڈیوک اور ارل یا کسی جنٹلمین کا بیٹا اور ایک درزی یا اور کسی خاندان کا بیٹا برابر امتحان دے سکتا ہے۔ جو لوگ وہاں ولایت سے مقابلہ کا امتحان دے کر آتے ہیں ادنیٰ خاندان کے بھی ہوتے ہیں اور اعلیٰ خاندان کے بھی ہوتے ہیں لیکن انگلستان سے جو آتے ہیں وہ ہماری آنکھ سے اتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ لارڈ کے بیٹے ہیں یا ڈیوک کے یا ایک درزی کے۔ اس سبب سے یہ امر کہ ہم پر ایک ادنیٰ حکومت کرتا ہے۔ ہماری آنکھ سے چھپا ہوا رہتا ہے لیکن ہندوستان میں یہ خیال نہیں رہے۔ ہندوستان کی شریف قومیں ہندوستان کے ادنیٰ درجہ کے شخص کا جس کی جڑ بنیاد سے وہ واقف ہیں اپنی جان و مال پر حکومت کرنا پسند نہیں کریں گے۔"

ج۔ سیّد صاحب نے ہندوستانیوں کے ایک قوم نہ ہونے کے بارہ میں فرمایا:

"دوسرے یہ کہ انگلستان میں امتحان مقابلے کے لئے مناسب ہے جہاں ایک قوم کے لوگ رہتے ہیں یا ملک میں مختلف قومیں بستی ہوں لیکن آپس میں مل کر بمنزلہ ایک قوم کے ہو گئی ہوں جیسے انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ مگر ہمارے ملک کی آبادی میں مختلف قومیں آباد ہیں یہ حالت نہیں ہے۔ ایک طرف ہندو دوسری طرف مسلمان اور تیسری طرف پارسی ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک یہ

صحیح ہے کہ یہ قومیں ایسی ہی آپس میں مل گئی ہیں کہ سب کو ایک قوم سمجھ لیا جائے تو بلا شبہ میں ضرور کہوں گا کہ ہندوستان میں مقابلہ کا امتحان ہونا چاہیئے اور اگر یہ نہیں ہے تو ہمارا ملک مقابلہ کے امتحان کے قابل نہیں ہے۔ تیسری صورت مقابلہ کے امتحان کی یہ ہے کہ گویا ایک ملک میں مختلف قومیں رہتی ہوں لیکن بہ اعتبار لیاقت تعلیم اور دولت کے برابر ہوں۔ مگر یہ نہیں ہیں۔ مُسلمان پیچھے ہیں اور اس صوبہ کے ہندو بنگالیوں سے کم ہیں۔

سر سید کی مندرجہ بالا تقریر سے بالکل ظاہر ہے کہ مسٹر بیک کو اپنے مشن میں کس درجہ کامیابی ہو گئی تھی جس سے وہ بہت خوش تھے بالخصوص ہندو مسلمانوں کی علیحدگی سے اینگلو انڈین اصحاب کو حد درجہ کی خوشی تھی۔ اس کا اندازہ (مسٹر) تھیوڈور ماریسن پرنسپل علی گڑھ کالج کی حسب ذیل تحریر سے بخوبی ہوگا:

”کانگریس کے خلاف سر سید کی تقریر سے مسلمانوں نے بالاتفاق کانگریس کی حمایت چھوڑ دی اور گورنمنٹ ہند میں اُصول نیابت کے آغاز کی خاص طور پر مخالفت کی۔ اس سے ایک بڑی سیاسی بحث چھڑ گئی اور آئندہ سالوں میں سر سید اور بیک کی کوشش بہت بڑی حد تک مُسلمانوں کی رائے مجتمع کرنے اور اُس کی نیابت کرنے میں مشغول ہوگئی۔

گاؤکشی کے خلاف شورش بھی ان سیاسی واقعات کے ساتھ ہی پیش آئی اور اس سے مُسلمانوں کے ہندوؤں سے علیحدہ ہونے میں اور بھی مدد ملی۔

اُس وقت کا سارا رجحان مُسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنا تھا یہی بات ہے جس کی طرف سر سید عرصہ دراز سے مُسلمانوں

"انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" کے چندہ میں زیادہ تر صوبہ متحدہ کے تمام بڑے
بڑے مسلمان نواب اور ہندو راجے اور رئیس اور انگریز شامل تھے۔ راجہ شیو پرشاد صاحب
سی۔ آئی۔ ای (بنارسی) نے تعلقہ داران اودھ کے جلسہ میں دو تجاویز پیش کی تھیں۔ ایک
یہ کہ ایک "انڈین نیشنل ایسوسی ایشن" قائم کی جائے جس کی شاخ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن
جو علی گڑھ میں قائم ہو چکی تھی، قرار دی جائے۔ دوسرے یہ کہ دیسی زبان میں فساد انگیز اور
بغاوت خیز تقریروں اور تحریروں کا انسداد کرنے کے لئے گورنمنٹ سے درخواست
کی جائے جس کا منشا یہ تھا کہ کانگریس خلاف قانون قرار دی جائے۔ راجہ صاحب نے
تو یہاں تک کیا کہ الہ آباد کے جلسہ کانگریس میں خود جا کر اُس کی مخالفت کی حتی کہ وہ جلسہ
سے نکالے گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں بھی اس قماش کے اصحاب
موجود تھے جو مسلمانوں سے زیادہ کانگریس کے صدر جہ مخالف تھے۔ بالآخر باوجود
انتہائی مخالفتوں کے کانگریس کا چوتھا اجلاس ۲۷ دسمبر ۱۸۸۸ء کو زیر صدارت "مسٹر
جارج یول" تاجر کلکتہ بمقام الہ آباد منعقد ہوا۔ گذشتہ تین جلسوں کے صدر
یکے بعد دیگرے بنگالی، ہندو پھر پارسی اُس کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ اس دفعہ
ایک یوروپین عیسائی کی نوبت آئی جس کے معنی یہ تھے کہ ابتداء سے کانگریس کو سب
قومی جماعت بنانا مقصود تھا۔ الہ آباد کے اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ باوجود سخت
مخالفت کے ڈیلیگیٹ حاضرین کی تعداد گذشتہ سال کے ۶۰۷ کے مقابلہ میں ۱۲۴۸
یعنی دو گنی سے زیادہ تھی۔ اُس جلسہ میں اودھ کے نمائندوں کے بارہ میں مولوی ہدایت رسول
نے فرمایا کہ اُن کی کثرت جناب علی گڑھ کی مخالفت کا نتیجہ ہے۔ شیخ رضا حسین
نے دوران تقریر میں لکھنؤ کے شمس العلماء کا یہ فتویٰ پیش کیا جس میں ظاہر کیا گیا کہ
مسلمان کانگریس کے مخالف نہیں ہیں بلکہ اُن کے سرگرم [illegible] ہیں۔

---

(۱) ہندوستان نے آزادی کے لئے کس طرح جدوجہد کی۔ مسز اینی بیسنٹ ص [illegible]

بدبختی یہ ہے کہ کانگریس کے جس اجلاس کی مخالفت اس شدومد کے ساتھ کی گئی اور اس کے خلاف "انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" یعنی انجمن محبان وطن قائم کی گئی اس اجلاس پر کانگریس نے جو چار تجاویز پاس کیں تھیں اُن میں سے کون سی تجاویز ملک کے نفع کے خلاف تھیں جن کی مخالفت اس شدومد کے ساتھ کی گئی یہ تجاویز ملاحظہ ہوں:

۱۔ شراب خوری کو کم کرنے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔

۲۔ تعلیم پر خرچ زیادہ کیا جائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو خرچ گھٹایا نہ جائے۔

۳۔ دوامی بندوبست قائم کر دیا جائے۔

۴۔ نمک کا محصول جو گورنمنٹ نے بڑھا دیا ہے اُس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جائے:

کیا یہ تجاویز ایسی خطرناک تھیں کہ ممبران پارلیمنٹ کو ان کی مضرت بتانے کے لئے دو جماعت قائم کر کے اُس کی پالیسی یک یوروپین ایڈیٹر کے ہاتھ میں دینی ضروری سمجھی گئی۔ کیا یہ ہمدردی ابلہ فریبی نہ تھی۔

طریق انتخاب کے خلاف احتجاج

مگر اس ابلہ فریبی میں ہندوؤں کا زیادہ عرصہ تک پھنسا رہنا مشکل تھا۔ اس لئے اگرچہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم رہی مگر خاص حقیقت کے کام خاص مجموعے بجائے مسلمانوں کے نام ہی سے کئے جاتے تھے۔ مثلاً یہ کہ ۱۸۹۰ء میں مسٹر بریڈلا نے پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون پیش کیا جس کا منشاء یہ تھا کہ ہندوستان میں جمہوری طریقہ کی سلطنت قائم کی جائے۔ اس کے بعد جواب میں مسٹر بیک نے مسلمانوں کی طرف سے ایک عرضداشت مرتب کی جس میں کہا گیا کہ اس ملک میں انتخاب یا طریق جمہوریت کا جاری ہونا اس وجہ سے خلاف مصلحت ہے کہ یہاں مختلف قوم کے لوگ بستے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ طریق انتخاب اس ملک کے موافق نہ تھا تو پھر کوئی اور طریقہ یہاں جاری کرنا چاہئے تھا۔ یہاں کے عوام الناس کا قدیم تمدن تو پنچایتی تھا اور ہندو مسلمانوں کی چند بستیں

کے بعد دی گئی۔

محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کا قیام

مگر اس تو ذن کے ہونے سے مسٹر بیک ہمت نہیں ہارے اور اب انہوں نے ایک اور جماعت قائم کرنا طے کیا۔ اب تک وہ کانگریس کی مخالفت کچھ تو "انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" کے نام سے اور کچھ مسلمانوں کے نام سے کرتے تھے۔ "انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" میں چونکہ ہندو بھی شریک تھے اس لئے اس کی نسبت کہا جا سکتا تھا کہ وہ کانگریس کی بدل جماعت ہے کہ مقابلہ میں ہندوستان کے کنسرویٹو خیال کے لوگوں کی جماعت ہے اور اس اعتبار سے اس میں زیادہ جستہ نہ تھا مگر بعد میں مسٹر بیک کو یہ بہترین موقعہ اس بات کا مل گیا کہ وہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے بالکل علیحدہ کریں۔ وہ موقعہ یہ تھا کہ ۱۸۹۳ء میں بمبئی میں ہندو مسلم فسادات کے بعد مسٹر بال گنگا دھر تلک نے ستمبر سنہ مذکور میں پونا میں گنپتی کا دس دن کا ایک میلہ جاری کیا جس کے جلوس میں مسلمانوں اور انگریز حکام کے خلاف گیت گائے جاتے تھے۔ اس میلہ میں ہندوؤں نے ایک مسجد میں مسلمانوں پر حملہ کیا اور ایک انجمن "انسداد ذبیحہ گاؤ" قائم کر کے اپنی سیاست کو مذہبی رنگ دیا۔ اس تحریک کے مقابلہ میں مسٹر بیک نے ۳۰ دسمبر ۱۸۹۳ء کو یک وہ جماعت "محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا" کے نام سے قائم کی جس کے مقاصد حسب ذیل تھے:

الف۔ مسلمانوں کی رائیں انگریزوں اور گورنمنٹ ہند کے سامنے پیش کرنا، مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا۔

ب۔ عام سیاسی شورش کو مسلمانوں میں پھیلنے سے روکنا۔

ج۔ اُن تدابیر میں امداد دینا جو سلطنت برطانیہ کے استحکام اور سلطنت کی حفاظت میں ممد ہوں۔ ہندوستان میں امن قائم رکھنے کی کوشش کرنا اور لوگوں میں وفاداری

کے طرزِ عمل سے رعایا میں بددلی بڑھتی گئی جس سے سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ یہ امر کہ ذاتی طور پر سرسید کو قربانی گاؤ کے مسئلہ میں کہاں تک شغف تھا اس سے ظاہر ہے کہ کالج کے لڑکوں نے ایک بار قربانی گاؤ کرنے کا ارادہ کیا تو سرسید نے روک دیا اور ایک موقع پر فرمایا:

"ہم بارہا اپنی قوم کو سمجھا چکے ہیں کہ گائے کی قربانی سے اپنے ہندو بھائیوں کو ناراض کرنا محض جہالت کی بات ہے۔ اگر ہم میں اور ان میں دوستی قائم رہے تو وہ دوستی بہت زیادہ گائے کی قربانی سے بہتر ہے۔"

مگر اپنی سیاست کو تقویت دینے کے لئے مسٹر بیک کو یک جماعت مسلمانوں کے ساتھ قائم کرنے کا موقع ملتا ہے کہ گاؤکشی قائم رکھنے کے بہانہ سے نہ ملک کو حکومت خوداختیاری دی جائے نہ ہندوستانیوں کو ہتھیار دیئے جائیں نہ ہند کے مسلمانوں پر گولہ باری بند کی جائے نہ فوج کا خرچہ گھٹایا جائے ورنہ ملک کا محصول کم کیا جائے۔ العظمۃ للہ!

ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

امتحان سول سروس کی مخالفت

مسٹر بیک نے ڈیفنس ایسوسی ایشن کی افتتاحی تقریر میں فرمایا تھا کہ ہم دو تحریکیں ہیں۔

"ہندو گاؤکشی، مسلمانوں اور انگریزوں کے خلاف اور کانگریس انگریزوں کے خلاف۔" امر اول یعنی گاؤکشی کی مخالفت کی نسبت اوپر لکھا گیا ہے اور دوم یعنی انگریزوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے تو مسٹر بیک نے مسٹر بریڈلا کے مسودہ قانون جمہوری حکومت کے خلاف مسلمانوں سے زبردستخط کر کے عرضداشت بھجوائی تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں ہی کے دستخطوں سے ایک عرضداشت اس مضمون کی بھیجی تھی کہ سول سروس کا امتحان ہندوستان میں جاری نہ کیا جائے۔ جب یہ عرضداشت کی

منظوری کی اطلاع انگلستان سے آئی تو اس کے شکریہ میں "ڈیفنس ایسوسی ایشن" کے جلسہ میں حسب ذیل تجاویز پاس کی گئیں:

"یہ جماعت شمالی ہند کے مسلمانوں کی طرف سے سکریٹری آف اسٹیٹ ہند کی مدبرانہ اور محسنانہ حکمت عملی کو قدر کی نظر سے دیکھتی ہے اور شکرگزار ہے کہ اس نے ہندوستان و انگلستان میں ایک وقت سول سروس کا امتحان منعقد ہونا نامنظور کر دیا۔ اس جماعت کی رائے میں سول سروس کا امتحان انگلستان و ہندوستان میں بہ یک وقت جاری ہونا سلطنت برطانیہ کے استحکام کے لئے مضر ہوگا اور اس سے نظم سلطنت کمزور ہو جائے گا اور جان و مال کی حفاظت میں خلل واقع ہوگا جس پر کہ ہندوستان کی خلائق و رعایا کی بہبودی کا انحصار ہے۔"

یہ وہی سول سروس کا امتحان ہے جس کے بہ یک وقت انگلستان و ہندوستان میں منعقد ہونے کی تحریک ۱۸۶۰ء میں وزیر ہند کی کونسل نے کی تھی پھر ۱۸۶۹ء میں مسٹر ہنری فاسٹ نے اس مسئلہ کو پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد بہی خواہان ملک کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح ہندوستانیوں کی تعداد سول سروس میں بڑھے۔ مگر اس وقت یعنی ۱۸۹۳ء تک ایک ہزار میں سے صرف ۲۰ ہندوستانی سویلین تھے۔ جس کے حساب سے ہندوستانیوں کی تعداد سول سروس میں کل دو فی صدی ہوتی تھی۔ اور جس کے بڑھنے کو سر سید ایک ملک و سلطنت کے لئے مضر سمجھتے تھے۔

مسٹر بیک کے مندرجہ بالا وجوہ و دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ کونسل وزیر ہند اور مسٹر ہنری فاسٹ کا منشا بھی ہندوستانیوں میں سول سروس کا امتحان جاری کرانے سے یہی ہوگا کہ اس سے سلطنت برطانیہ کمزور ہو جائے اور ملک میں جان و مال محفوظ نہ رہیں اور ہندوستان کی اخلاقی و مادی حالت بگڑ جائے۔ بہرحال مسٹر بیک نے خود

ملک کی بہبودی یا مسلمانوں کی حفاظت یا دراصل چند رجعت پسند انگریزوں کے ذاتی مفاد کے لئے مسلمانوں کے ذریعہ اُس وقت اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔

جملہ امتحانات مقابلہ کی مخالفت

مسٹر بیک نے مسلمانوں کی طرف سے مخالفت کو صرف سول سروس کے امتحانات پر محدود نہ رکھا بلکہ اُنہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر جملہ امتحانات مقابلہ کی مسلمانوں سے مخالفت کرائی اور یہ کوشش کی کہ مسلمان صرف حکومت سے مراعات طلب کرنے کی ذہنیت پیدا کریں جب میں دراں حالیکہ سر سید احمد خاں ہمیشہ اس کے مخالف تھے۔ حتی کہ وہ اپنے کالج کے پاس شدہ طلباء کی بھی سفارش ملازمتوں کے لئے نہ کرتے تھے اسی طرح جب کسی صوبہ کے مسلمان گورنمنٹ سے ملازمتوں میں مراعات کی استدعا کرتے تھے تو سر سید اُسے ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ موصوف نے ۲ اپریل ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں "مسلمانوں کی قومی ترقی" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جس میں لکھا تھا:

> افسوس ہے کہ بنگال کے مسلمانوں نے جو تدبیر اپنی مسلمانوں کی ترقی کی اختیار کی ہے اُس سے ہم کو اختلاف ہے ان کی تدبیریں جس پر وہ مختلف طریقوں سے زور دیتے ہیں یہ ہیں کہ گورنمنٹ کی طرف سے مسلمانوں کے لئے خاص رعایات حاصل ہوں سابق میں بھی اسی مطلب سے انہوں نے بہت زبردست درخواست پیش کی تھی اور حال میں بھی ڈھاکہ کے مسلمانوں نے اسی قسم کی درخواست پیش کی ہے۔ ہم اس تدبیر کو پسند نہیں کرتے ہیں اور نہ اس میں کامیاب ہونے کی اُمید ہے۔ ہمارا اصول سیلف ہیلپ پر مبنی ہے ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان خود اپنی ترقی کے لئے آپ کوشش کریں۔

پھر جب "نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کلکتہ" نے ۱۹۰۸ء میں سر اسٹوارٹ بیلی لفٹننٹ گورنر بنگال کے سامنے اس مضمون کی ایک عرضداشت پیش کی کہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمت میں مناسب حصہ دیا جائے تو اس پر سر سید نے لکھا:

"ہماری ہمیشہ نصیحت اپنے دوستوں کو یہی رہی ہے کہ رعایتوں کی درخواستوں کے پیچھے مت پڑو اور قوم کو ناشدنی امر کا متوقع مت کرو بلکہ عملی طور پر قوم کی ترقی تعلیم پر کوشش کرو۔"

سر سید کا منشا یہ تھا کہ مسلمان اعلیٰ عہدے بلا کسی رعایت کے حاصل کریں اور اس اصول پر تو عمل درآمد کی یہ شکل اختیار کی جا سکتی تھی کہ جس طرح انگریزوں کے لڑکوں کو لکھنؤ کے لامارٹینیر کالج میں سول سروس اور انجنیری کے امتحانات مقابلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ اسی طرح مسلمان لڑکوں کو علی گڑھ کالج میں تیار کیا جاتا۔ اقلیت کے لوگوں کو آگے بڑھانے کی صرف یہی صورت ہو سکتی تھی مگر افسوس کہ اس وقت مسلمان لڑکوں کی باگ مسٹر بیک کے ہاتھوں میں تھی جن کے مدِ نظر صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کی زندگی کا انحصار صرف حکام کے رحم و کرم پر رہے اور اسی کے وہ عادی ہو جائیں۔ چنانچہ "ڈیفنس ایسوسی ایشن" کے اجلاس منعقدہ ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۶ء کی رپورٹ میں مسٹر بیک نے لکھا:

"پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنروں اور منصفوں کے تقررات کے لئے امتحانات مقابلہ کی مخالفت کی بات۔"

رپورٹ کے بعد چند تجاویز بھی اس قسم کی پاس کی گئیں۔ اسی طرح ایک جلسہ میں رڑکی کالج کے پرنسپل سے بذریعۂ ایک قرار داد کے یہ درخواست کی گئی کہ وہ مسلمان طلبا کو بلا امتحانات مقابلہ انجنیرنگ کلاس میں اس طریقہ سے داخل کر لیا کریں کہ ان کا مخصوص پانچ کا

مسلم یونیورسٹی گزٹ ۱۹۰۸ء ص ۹۹

تو بڑی آب و تاب سے شائع کیا جاتا۔ چنانچہ جون ۱۹۰۲ء کے کالج میگزین میں ایک کھلی چٹھی بنام ایڈیٹر کرکٹ کلب علی گڑھ شائع کی گئی جس کا خلاصہ یہ ہے:

"تمہارے نامی گرامی کھلاڑیوں کے حروف سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر میرے نزدیک درس کے کمرے کے مقابلہ میں کرکٹ فیلڈ ایک بہترین تعلیم گاہ ہے اور اس اعتبار سے علی گڑھ کالج بھی انگلستان کے اسکولوں کے نمونہ پر بنایا گیا ہے۔"

اُس زمانہ میں کلکٹروں کے ہاتھوں میں کچھ ملازمتیں تھیں جو وہ اپنے متوسلین کو دے سکتے تھے۔ اس لئے کلکٹر صاحب کا یہ خط محض تحسینِ آسمانی کے علی گڑھ کالج کے کھیلنے والے طلباء کی حوصلہ افزائی کے لئے شائع کیا گیا تھا۔ امتحانات سے مقابلہ کی مخالفت کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوم جسے تعلیم و تعلّم سے تھوڑی سی مناسبت تھی اب اُس کے نوجوان لکھنے پڑھنے سے بھاگ نکلے اور کیوں نہ بھاگ نکلتے جبکہ اُن کے اُستاد خود انہیں یہ تلقین کرتے تھے۔

پڑھو گے لکھو گے تو ہو گے خراب
جو کھیلو گے کودو گے ہو گے نواب

ان نعروں سے متاثر ہو کر طلباء نے حصولِ معاش کے لئے مخلوط مدارس کو کافی سمجھ کر وہ انگریزوں کی خوشنودی کو شعار بنا کر اور اُن کے ساتھ میل جول رکھ کر اپنے کرتبوں سے انہیں خوش کیا کریں۔ افسوس کہ مسٹر بیک حکمران جماعت سے باوجود اپنے غیر معمولی اثرات کے مقابلہ کے امتحانات تو بند نہ کرا سکے لیکن مسلمان لڑکوں کو ان امتحانات سے ڈرا ڈرا کر انہیں بزدل اور اپنی نظروں میں آپ حقیر بنا کر حقیقی معنوں میں انہیں دفتری حکومت کا حلقہ بگوش اور غلام بنا دیا۔ اور پیش نظر یہ تھا کہ ان کے علاوہ سرکاری ملازمت کی تمام راہیں جو بند کر کے ان کے ذہنی نشو و نما کو بند کر دیا۔ یہ دو دھاری بات

ہے کہ بعض لڑکوں نے انہیں اُتار پھینکا اور بعد میں وہ علمی و سیاسی میدانوں میں نمودار ہوئے۔

ڈیفنس ایسوسی ایشن کی تبلیغ انگلستان میں

ڈیفنس ایسوسی ایشن کے ذکر کے بعد مسٹر بیک انگلستان تشریف لے گئے اور وہاں انجمن اسلامیہ لندن کے سامنے آپ نے ایک لیکچر دیا جو نیشنل ریویو میں شائع ہوا اور علی گڑھ کالج میگزین نے اس کا ترجمہ مارچ، اپریل اور جون ۱۸۹۵ء کے پرچوں میں شائع کیا۔ اس لیکچر کے پڑھنے سے محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کی پالیسی کا جس کے مسٹر بیک سکریٹری تھے پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

(الف) اینگلو مسلم اتحاد ممکن مگر ہندو مسلم اتحاد ناممکن

اس لیکچر میں آپ نے اس بات پر بہت زور دیا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں دوستی ہو مگر اس امر کو ناممکن قرار دیا کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب کے لوگ ایک متحد قوم بن جائیں گے۔ آپ نے فرمایا:

> ہندوستان کے لوگ مذہب کی بنا پر آپس میں لڑتے ہیں۔ یہاں ہندو مسلمانوں کے مذہبی انہماک میں کوئی علامت زوال کی نہیں پائی جاتی بلکہ جو لوگ ان مذہبوں کے ماننے والے ہیں ان میں عداوت روز افزوں ہے۔ مسلمان اورنگ زیب پر ناز کرتے ہیں لیکن گرو گوبند سنگھ اور شیواجی کے ماننے والوں کو اس کے نام تک سے نفرت ہے۔ دونوں قوموں میں دوستی باہمی ناممکن ہے اور اس وقت ہندوؤں کی [illegible] ذہنیت میں جوش [illegible] بات کو [illegible] جاتی ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں کے لئے یہ امر ناممکن ہے کہ وہ

ریاست شہنشاہ کے نام پر یہ مملکت کی آمدنیاں اپنے ہاتھوں میں
لے لیتے تھے۔

ایسے اصحاب تو نہ ہندوستان میں شخصی حکومت چاہتے تھے اور نہ جمہوری بلکہ
ہی جماعتی حکومت کے طلبگار تھے اور وہ بھی خاص اشخاص کے ذریعہ سے۔

(ج) مسلمانوں کو دھمکی

ایک لکچر میں مسٹر بیک نے کہیں تو مسلمانوں کو تھپکی دی ہے اور کہیں خوب دھمکی دی ہے۔ اُنہوں نے فرمایا:

"مسلمانوں میں جو خیالات چلے آتے ہیں وہ ان بنگالی جوشیلوں کے دلوں کے مقاصد اور طریقوں کے خلاف ہیں۔ مسلمانوں کو سرکشی کی سزا کا یعنی غدر میں بغاوت کی سزا کا تجربہ ہے۔ ان کو بار بار ایک بڑے سردار یعنی (سر سید) سے یہ تعلیم ہوئی ہے کہ انگریزوں کو اپنا دوست سمجھیں اور تعلیم یافتہ ہندوؤں کی پالیسی نے مسلمانوں کو خود اپنی حفاظت کے لئے گورنمنٹ کا طرفدار بنا دیا ہے۔"

مُسلمانوں کو خربوزہ قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"مسلمانوں کی حالت کو صاف صاف سمجھنے کے لئے ہم کو ۱۸۵۷ء سے اُن کے حالات کو دیکھنا چاہیئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے اُن کے بہت سے شریف خاندانوں کو تباہ کر دیا اور اُن خاندانوں کی تباہی کے ساتھ بہت سا سامان تہذیب جو قدامت سے اُن کے یہاں چلا آتا تھا وہ غارت ہو گیا۔ انگلستان کی عظمت میں اس حادثہ سے کسی قسم کا فرق نہ آیا لیکن مُسلمانوں کی قومی سلامتی کو سخت صدمہ پہنچ گیا اور یہی حال ۱۸۶۳ء میں وہابیوں کی بغاوت

برخلاف اس کے کانگریس کی طرف سے حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی تھی:

"سرحد کی پیش قدمی کی پالیسی سلطنت برطانیہ کے لئے اور بالخصوص ہندوستان کے مفاد کے لئے مضرت رساں ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ہندوستان کے حدود کے باہر فوجی مہمات بھیجنی پڑتی ہیں جس سے قیمتی جانیں تلف ہو جاتی ہیں اور رعایا کا روپیہ ضائع ہوتا ہے، اس لئے کانگریس مستدعی ہے کہ اس جارحانہ کارروائی کو بند کیا جائے اور یہ امر قرار دیا جائے کہ اگر کبھی یہ مہمات شاہی اغراض کے لئے ضروری سمجھی جائیں تو ان کے صرف کا بڑا حصہ سلطنت برطانیہ کے خزانہ سے ادا کیا جائے۔"

اس کے بعد کانگریس نے دوسری قرارداد میں گورنمنٹ کی پیش قدمی کی پالیسی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ سرحدیوں کے ساتھ پرانی دوستانہ پالیسی کی طرف رجوع کیا جائے اور وادی سوات میں جو کثیر اخراجات کئے جاتے ہیں انہیں بند کیا جائے۔ کانگریس کی یہ روش کہ وہ سرحد پر پیش قدمی کے خلاف تھی آج بھی وہی ہے جو نصف صدی پہلے تھی جس کی مثالیں مرکزی اسمبلی میں فوجی مصارف کے بجٹ پر مباحثہ کے وقت ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل توجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک انجمن کے جلسہ میں اس مضمون کا رزولیوشن کا پیش ہونا کہ سرحد پر فوج بڑھائی جائے تعجب خیز ہے کیونکہ سرحد پر جو قیمتی جانیں تلف ہوتی تھیں وہ کن لوگوں کی تھیں؟ وہ مسلمانوں اور صرف مسلمانوں کی تھیں جنہیں توسیع سلطنت کے لئے ہلاک کرنے پر کروڑوں روپیہ صرف کیا جاتا تھا۔ اسی سرحد میں "ستھانہ" اور وادی سوات تھے جن کا نام کانگریس کی تجویز میں لیا گیا تھا۔ اور یہاں کہ حضرت سید احمد شہید کے خلفا اور مریدین نے ایک بستی بنائی تھی اور اس خانقاہ میں ہندوستان کے مہاجرین حکومت زمانہ سے تنگ آ کر پناہ لیا کرتے تھے۔ اسی دیندار جماعت کی بابت کے [illegible]

نے یہ قرارداد منظور کی، برخلاف اس کے ڈاکٹر رہا نے سرحدیوں کے ساتھ دوستانہ پالیسی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ کیا کوئی صاحب یہ بتا سکتے ہیں کہ کانگریس نے جسے مسلم کش قرار دیا جاتا ہے اپنے ساٹھ سالہ دور میں ڈیفنس ایسوسی ایشن کی سی قرارداد کی مانند کوئی تجویز پاس کی ہے جو مسلمانوں کی ایک متعدبہ جماعت کی ہلاکت کی موجب ہوئی ہو؟

سرسید کی نام نہاد پالیسی کی اصلیت

ایک وقت وہ تھا جب کہ ۱۸۷۲ء میں ڈاکٹر ہنٹر نے نام نہاد وہابیوں پر حملہ کیا تو سرسید ان کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئے۔ اور اب وہی سرسید ہیں جو پچیس[۲۵] سال بعد جب کہ کانگریس انہیں مسلمانوں کی حمایت کرتی ہے تو وہ اپنی عمر کے آخری سال میں حکومت کو ان پر پیشقدمی کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہی جگر خراش حالات تھے جن سے متاثر ہو کر کچھ عرصہ بعد مولانا شبلی نعمانی نے مسلم گزٹ لکھنؤ میں سرسید کی تبدیلی رائے کے بارے میں اپنے جذبات کا ان الفاظ میں اظہار کیا تھا:

"وہ پرزور حریت وقلم جس نے رسالہ اسباب بغاوت ہند" لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے وہ بہادر جس نے یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تینوں آرٹیکلوں میں لکھا کانگریس کا لیکچرر حقوق ملکی کے متعلق اس سے زیادہ پرزور لیکچر نہیں پیدا کر سکتا۔ وہ جانباز جو آگرہ کے دربار سے اس لئے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں۔ وہ حق پرست جس نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف بنگالی ایسی قوم ہے جس پر ہم واجبی طور پر فخر کر سکتے ہیں

اور یہ صرف انہیں کی بدولت ہے کہ علم و آزادی اور حب وطنی کو ہمارے
ملک میں ترقی ہوئی۔ میں صحیح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالیقین ہندوستان
کی تمام قوموں کے سرتاج ہیں۔ حالات اور گردوپیش کے واقعات نے
اس کو اس پر مجبور کیا کہ اُس نے تمام اسلامی مذہب کو پالٹیکس سے جدا
دیا یہ کیوں ہوا کن اسباب سے ہوا کس چیز نے دفعتاً یہ انقلاب پیدا کیا
ان سوالات کا جواب آج ضروری نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ آج اجتہاد و تقلید سے
آزادی کا زمانہ ہے۔"

مولانا شبلی کے مندرجہ بالا اقتباس میں جو سوال قائم کیا گیا تھا اگر اس کا جواب صراحت
کے ساتھ دیا جاتا تو قوم غلط فہمی کے چکر میں عرصہ دراز تک نہ پڑی رہتی۔ جواب صاف
اور صحیح یہ تھا کہ سر سید کی درجہ حد اعتماد کی صفت کی وجہ سے جس طرح کالج کے
قائم کرنے میں شریک حال اور سر سید کے گوشت پوست مولوی سمیع اللہ خان اور
دیگر ہمدردان قوم انتظامات کالج سے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک
دیئے گئے، اُسی اعتماد کی بدولت مسلمانوں کی سیاست در و بست مسٹر بیک کے ہاتھ
بدست دی گئی اور ان سے کہہ دیا گیا ہے

سپردم بتو مایۂ خویش را!
تو دانی حساب کم و بیش را

کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر سید کے ذہن میں ضعف ہوتا گیا کالج کی بد انتظامات
اور سر سید خود کی خرابی صحت نے اُن کے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ بہت سے
پرانے دوست اور ساتھی تو مولوی سمیع اللہ خان کے ساتھ نہیں چھوڑ چکے تھے جو باقی
تھے وہ مسٹر بیک کی بدولت ناراض ہو جانے سے علیحدہ ہو گئے تھے اور
یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ ان کے باقی ماندہ حامی و مددگار سر سید کی زندگی میں کم

گورنمنٹ نے جاری کئے تو بعض شہروں میں بلوے ہوئے جن میں ہندو و مسلم یکساں شریک ہوتے تھے۔ اسی قسم کا ایک بلوہ کہ اپریل سنہ ۱۹۰۰ کو [illegible] میں ہوا تھا جس سے گورنمنٹ پریشان تھی۔ اس کے دو ہفتہ بعد ۱۸ اپریل سنہ ۱۹۰۰ کو گورنمنٹ کا ایک رزولیوشن جاری ہوا جس کا منشاء یہ تھا کہ عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ناگری حروف میں لکھی ہوئی درخواستیں دینے کی اجازت دی جاتی ہے اور تمام سمن اور اعلان اردو ناگری اور اردو حروف میں جاری ہوا کریں گے اور کوئی شخص کسی عہدے پر مقرر نہ ہوگا جسے ناگری اور اردو حروف میں سہولت کے ساتھ لکھنے کی مہارت نہ ہو۔ جب یہ رزولیوشن جاری ہوا تو تمام صوبہ کے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور مسلمانوں کے جلسے رزولیوشن کی مخالفت میں اور ہندوؤں کے جلسے گورنمنٹ کی شکر گزاری میں جگہ جگہ منعقد ہونے لگے۔ اور اس عنوان کے سلسلہ میں گورنمنٹ کے مقابلہ میں جو ہندو و مسلمانوں کا متحدہ محاذ قائم ہو گیا تھا اس کا یکسر خاتمہ ہو گیا۔ مولوی محمد بشیر الدین نے اپنے اخبار البشیر اٹاوہ میں اردو ہندی کے مسئلہ میں زبردست سلسلۂ مضامین لکھا جس کی تعداد سو سے اوپر تک پہنچ گئی تھی۔ اور دوسرے اخبارات نے بھی شور مچایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ہندی کی بحث سے صوبہ متحدہ میں دونوں قوموں کے درمیان تفریق کی ایک خلیج قائم ہو گئی جو روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی۔ چونکہ تمام قوم کا [illegible] مرکز رہا تھا۔ اس لئے اسی کی طرف تمام قوم کی نظریں اٹھ گئیں۔

اس وقت سر سید کے انتقال کو دو سال گزر چکے تھے۔ سر سید کے آخری وقت کی مالی حالت نہایت خراب تھی۔ مسٹر بیک کی وساطت سے حکام انگریزی نے ان کے ساتھ بہت ہمدردی کی تھی اور مالی امداد دی تھی۔ جب اردو ہندی کی بحث چھڑی تو مسلم یونیورسٹی کا منصوبہ قائم ہو کر سر سید میموریل فنڈ کے لئے چندہ کا سلسلہ جاری تھا۔ اس وقت کالج کے آنریری سکریٹری نواب محسن الملک تھے جن کی تمام تر توجہ کالج کے لئے روپیہ فراہم کرنے اور تمام ہندوستان میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس [illegible]

میموریل فنڈ کی تحریک کی اشاعت کرنے میں صرف ہوتی تھی۔ گورنر کے جاری ہونے
سے صوبہ کے تمام مسلمانوں میں ہیجان ہوا اور ہر طرف سے مختلف شہروں میں جلسے ہونے
کی خبریں آئیں اور علی گڑھ میں جلسے کے لئے تقاضے ہونے تو ۱۳ر مئی سنہ ۱۹۰۰ء کو
کراسٹویٹ ہال علی گڑھ میں ایک جلسہ بصدارت نواب لطف علی خاں بہادر رئیس چھتاری
ضلع بلند شہر منعقد ہوا۔ اس میں نواب محسن الملک نے ایک پُر زور تقریر ہندی
ناگری کے اجراء کے خلاف کی اور ایک رزولیوشن بہ تائید صاحبزادہ آفتاب احمد خاں
اس مضمون کا پیش کیا کہ حضور لفٹننٹ گورنر کی خدمت میں تبدیلی حکم کے لئے ایک
درخواست پیش کی جائے۔

تمام رزولیوشنوں اور تمام تقریروں میں حد درجہ کا ادب اور انکسار بلکہ منت اور
خوشامد کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ تاہم یہ جلسہ لفٹننٹ گورنر کی ناراضی کا باعث ہوا اور صاحب صدر
جلسہ پر عتاب ہوا جس کی وجہ سے انہیں صدارت سے دست بردار ہونا پڑا۔ تب
نواب محسن الملک اردو کی تحریک کے صدر مقرر کئے گئے اور اس حیثیت میں انہوں
نے ۱۸ر و ۱۹ر اگست سنہ ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ کے جلسہ میں ایک زبردست تقریر کی جو گورنمنٹ کی
ناراضی کی موجب ہوئی۔ صاحب لفٹننٹ گورنر بذاتِ خود علی گڑھ تشریف لائے اور ٹرسٹیان
کالج سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ نواب محسن الملک یا تو علی گڑھ کالج کے سکریٹری
رہیں یا انجمن اردو کے پریسیڈنٹ۔ دونوں میں سے وہ ایک کو چھوڑ دیں۔ کیونکہ وہ کالج
کے سکریٹری رہ کر سیاسی کام نہیں کر سکتے۔ کالج کی بے حد ضرورتوں کی وجہ سے انہیں
ٹرسٹیوں نے مجبور کیا کہ وہ اردو کی تحریک میں کام نہ کریں اور علی گڑھ کالج کی خدمت
کریں۔ چنانچہ انہوں نے پھر یہ کام نہیں کیا۔ اس واقعہ سے کم از کم یہ تو صاف ظاہر ہو
گیا کہ اس سے قبل علی گڑھ کے سکریٹری نے "انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" اور
"محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن" قائم کر کے ان کے نمایاں کاموں میں جو حصہ لیا تھا،

سب سے آخر میں مسٹر ہاریسن نے مسلمانوں کو سیاسیات سے ہٹانے کے لئے فرمایا:

"سب سے زیادہ مسلمانوں کو اقتصادیات کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ سیاسی قوت کا انحصار سیاسی حقوق کے حصول پر نہیں ہے اس لئے کونسل کے لئے ووٹوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو حصولِ دولت سے زیادہ نفع ہوگا۔ اگر مسلمان محض تعلیم یافتہ اور دولت مند ہو جائیں تو بمقابلہ ان حقوق کے جو وہ بیس پچیس سال میں حاصل کریں تعلیم یافتہ اور دولت مند بننے میں انہیں زیادہ قوت حاصل ہوگی۔"

مسٹر ہاریسن کی یہ اسکیم بروئے کار نہ آئی اور آتی بھی تو ان کا یہ مشورہ کہ مسلمان دولت مند بننے کے لئے اقتصادیات کی طرف توجہ کریں سود کے موجودہ قوانین اور بیرونی تجارت و صنعت کے چکر کی موجودگی میں کیا کارگر ہو سکتا تھا۔ ان کی مذکورہ بالا سکیم کے باعمل رہنے کے اسباب یہ ہوئے کہ نواب محسن الملک اردو کی حمایت کے باعث پریشان اور افسردہ دل ہو چکے تھے اور انہوں نے ہندی کے خلاف مسلمانوں میں ہیجان پیدا کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے علی گڑھ کالج کی گزشتہ سترہ سال کی روایت کو دیکھا تھا جہاں کہ علی گڑھ کالج کا پرنسپل بمنزلہ سرکاری ریذیڈنٹ کے تھا اور ریذیڈنٹوں کی قوت کا نواب صاحب کو حیدرآباد میں کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لئے علی گڑھ کالج کو بچانے کے لئے آپ نے وہی کیا جو مسٹر ہاریسن چاہتے تھے یعنی آپ نے ان کے مضمون کی نہایت زور سے تائید کی اور اس کو بہترین نامہ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"مسلمانوں کو اس پر کاربند ہونا چاہیئے اور ان مسلمانوں پر افسوس ہے کہ جنہوں نے مسٹر ہاریسن کے قابلِ قدر خیرخواہانہ اور دور اندیشانہ

مضمون پڑھ کر پیش کیا تھا۔ غرضکہ نواب صاحب نے مسٹر ماریسن کی
تائید کرتے ہوئے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ سنہ ۱۸۹۳ء کی فرسٹ
محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کو زندہ کریں جس کا تمام کام ایک کونسل کے
ہاتھ میں ہو اور حسب تحریک مسٹر ماریسن ایک بڑا فنڈ قائم کیا جائے
جس میں پانسو روپیہ ماہوار کا عملہ ہو۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ نہ نو من
تیل ہوگا نہ رادھا ناچیں گی۔ چنانچہ نہ مسلمانوں کو پانسو روپیہ میسر
آئے اور نہ محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن زندہ کی گئی اور اس طرح علی گڑھ
میں مسلمانوں کی تمام سیاسی تحریک اس وقت زیر زمین دبا
دی گئی۔

وفد ایران

ایک طرف تو مسٹر (سر) ماریسن نے علی گڑھ میں کسی فرقہ وارانہ سیاسی تحریک
بھی قائم نہ ہونے دی دوسری طرف علی گڑھ کالج کو سرکاری ملازمت
کے لئے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک کے سیاسی کاموں میں استعمال کیا جس
کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۰۰ء میں روس شمال کی طرف سے اور انگلستان جنوب
کی طرف سے اپنا اپنا اقتدار ایران میں بڑھا رہے تھے۔ اسی زمانہ میں مولوی [illegible]
علی گڑھ کالج میں شیعہ پیش امام اور مدرس فارسی تھے اور تعطیلوں کے بعد وہ ایران
انگریزوں کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو کر چلے گئے تھے۔ شروع ۱۹۰۳ء میں
انہوں نے شیراز سے مسٹر ماریسن پرنسپل علی گڑھ کالج کو لکھا اور نیز اطلاع دی کہ وہ بعض
ایرانیوں کو آمادہ کر رہے ہیں کہ وہ اپنے لڑکوں کو علی گڑھ کالج میں بھیجیں۔ اس پر
مسٹر ماریسن نے کالج سے ایک وفد ایران کو بھیجنے کا ارادہ کیا۔ جب علی گڑھ
کے مقامی ٹرسٹیوں کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے اس پر اعتراضات کئے جن کی
اطلاع نواب محسن الملک سکریٹری کالج نے مسٹر ماریسن کو جو اس وقت یورپ میں

تھے کی۔ بے چینی کے ساتھ صحیفۂ کوہستانی کے منتظر رہے۔ اس کے جواب میں مسٹر ہاریسن نے تار دیا کہ:

"وہ ڈیپوٹیشن سے عمدہ نتائج پیدا ہوں گے اور گورنمنٹ جانتے نا خوش ہونے۔ کہ ٹرسٹیوں سے خوش ہوگی۔ چنانچہ پانچ اصحاب کا ایک وفد ایران گیا جو وہاں سے ایرانی امراء کے لڑکوں کو لایا۔ اور اس طرح لارڈ کرزن کا سیاسی منصوبہ پورا کیا گیا۔ اس وفد کے ممبران (لندن صاحب) میر ولایت حسین (بہادر خان) سید ابو محمد سید جلال الدین حیدر اور جمیل صاحبان تھے۔"[1]

پولیٹیکل آرگنائزیشن کا قیام

نواب وقار الملک نے غالباً یہ دیکھ کر کہ علی گڑھ کی سرزمین میں، جہاں کی حکومت کی باگ علی گڑھ کالج کے پرنسپل کے ہاتھوں میں تھی، کسی قسم کی سیاسی تحریک کامیاب نہ ہو سکے گی۔ ۲۰، ۲۱، ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو ایک جلسہ مسٹر حامد علی خاں علیگ بیرسٹر کی کوٹھی پر لکھنؤ میں منعقد کیا۔ اس جلسہ کے صدر سید محمد شریف الدین بیرسٹر ایٹ لا پٹنہ تھے۔ اس موقع پر نواب وقار الملک نے اغراض جلسہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ تمام ملک ہندوستان میں کچھ عرصہ سے مسلمانوں کا درجہ کس طرح ہفتہ بہفتہ تنزل کرتا جاتا ہے۔ نہ صرف خاص صوبوں میں بھی ان کے سیاسی حقوق پر حملہ ہو رہا ہے اور وہ ناگپور کے مسلمانوں اور سرکاری عہدوں پر مسلمانوں کی قسمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا کہ وہ مسٹر ... کی قانونی کونسل اور ... کی کونسلوں میں مسلمان

---

[1] ماخوذ از مضمون جناب حاجی میر ولایت حسین صاحب سابق سکنڈ ماسٹر مدرسۃ العلوم علی گڑھ مندرجہ اخبار گذشتہ علی گڑھ ...

مگر افسوس کہ باوجود ان سہاروں، تدبیروں اور نواب صاحب کی پانچ سالہ محنت اور جانفشانی کے مسلمانوں کی سیاسی گاڑی اس وقت تک نہ چل سکی جب تک کہ دفعتہً حکومت کو خود اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس کی کیفیت آئندہ فصل میں درج ہے۔

ملازمت میں توسیع کی جائے یہ وہی لارڈ کچنر تھے جو مصر میں مہدی سوڈانی کی قبر سے ہڈیاں کھدوا کر پھنکوا دینے کی بدولت دنیا میں نام پیدا کر چکے تھے۔

یہ وہ امپیریل سروس ٹروپس کی تجویز تھی جو عملی شکل میں لائی گئی تھی۔ مختصر یہ ہے کہ مندرجۂ بالا اسکیم کی اشاعت نے ہز ہائی نس (سر) آغا خاں کا مرتبہ اور اعتبار حکام میں اور زیادہ بڑھا دیا تھا۔ اب وہ یورپ سے روانہ ہو کر سیدھے شملے پہنچے اور وفد کے ساتھ وائسرائے کی خدمت میں ایڈریس مذکور پیش کیا۔ اس کے جواب میں لارڈ منٹو نے مسلمانوں کے اعتدال اور ضبطِ نفس کا شکریہ ادا کیا۔ اور ان کی وفاداری تسلیم کرکے ان کے حقوق کی حفاظت کی طرف سے اطمینان دلایا۔ مسلمانوں کی سیاسی خدمات اور اہمیت کو تسلیم کیا اور میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ اور قانون ساز کونسلوں میں ان کا حق انتخاب مذہب کی بنا پر مان لیا اور مانا کیسے نہ جاتا جب کہ وہ خود حضور وائسرائے کے ایما سے ہی آیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مذہب کی بنا پر مختلف قوموں کے جداگانہ انتخاب کے قیام کے حق کو تسلیم کیا گیا۔ جس سے ہندوستان کی قومیت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ایک طرف کم تعداد مسلمان۔ ان کے مقابلہ میں دوسری طرف ہندوستان کی تمام دوسری قومیں۔ اکثریت کر دی گئیں۔ عام مسلمان اس وفد کی کامیابی سے بہت خوش تھے۔ مگر چونکہ وہ سیاست کا سبق بھول چکے تھے اس لئے وہ نتائج جو مرتب ہوتے ان کا کچھ اندازہ نہ کر سکے۔ لیکن یہ خاص بات تھی کہ ہندوستان اور انگلستان کے انگریز مدبروں اور سیاست دانوں نے بھی اس پر خوشی منائی اور اپنے اخباروں میں اس کے شادیانے بجائے جس سے ان کے مقصد کا پتہ چلتا ہے جو اس تحریک کی تہ میں تھے۔

له ماخوذ از [illegible] مترجمہ محمد [illegible] صاحب

کئے گئے۔ یہ وہی محسن الملک ہیں جو انجمن حمایت اردو کی صدارت چھوڑنے پر اس بنا پر مجبور کئے گئے تھے کہ وہ ایک سیاسی جماعت تھی اور انہیں نوابی کے خطاب کے استعمال سے منع کیا گیا تھا۔ وہ اب وہی ایک سیاسی جماعت کے جوائنٹ سیکرٹری مقرر کئے جاتے ہیں اور حکومت کی طرف سے نہ صرف یہ کہ اعتراض نہیں بلکہ ان کے لئے ایک بڑا خطاب تجویز کیا جاتا ہے جس کے گزٹ میں شائع ہونے سے قبل سوء اتفاق سے نواب صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے۔

اس جلسہ میں چار رزولیوشن پاس ہوئے تھے جن میں سے پہلا قیام آل انڈیا مسلم لیگ کے بارہ میں تھا۔ دوسرا اور چوتھا قواعد بنانے کے متعلق تھا۔ اور تیسرے رزولیوشن کا منشا یہ تھا کہ تقسیم بنگالہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے۔ اور اس کے خلاف شورش اور دوسرے ذرائع کی تحریکات مذموم ہیں۔ اس جلاس کے ختم ہوتے ہی مسلم لیگ قائم ہونے کی اطلاع [illegible] گورنمنٹ کو دی گئی۔ اور پاس شدہ رزولیوشنوں میں سے صرف تیسرے رزولیوشن کی نقل بھیجی گئی جو تقسیم بنگالہ کے مسلمانوں کے لئے مفید ہونے کے بارہ میں تھا۔ نیز درخواست کی گئی کہ اس کی ایک نقل وزیر ہند کو بھیجی جائے

مسلم لیگ کے قائم ہونے کی خبر جب انگلستان پہنچی تو وہاں کے مشہور اخبار [illegible] نے بقول مسٹر سید امیر علی پریسیڈنٹ مسلم لیگ جنرل کمیٹی۔

"اس بات پر یقین ہو جائیں کہ مسلمانوں کی ایک منظم سیاسی جماعت قائم ہو جانے سے اب ہندوستان میں شانتی نہ رہے گی"[1]

نواب وقار الملک کی نصیحت

ملاپار کر دسمبر ۱۹۰۶ء کے اجلاس کے بعد مسلم لیگ کے سیکرٹری نواب

---

[1] ماخوذ از خطبہ صدارت مسلم لیگ منعقدہ دسمبر ۱۹۳۶ء بمقام بمبئی

"خدا شرے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد"

اس تبدیلی سے مسلم لیگ کو بجائے نقصان کے فائدہ ہوا۔ علی گڑھ سے مسلم لیگ کا دفتر اُٹھ جانے سے مسلمانوں کی سیاسی پالیسی انگریز پرنسپل کے ہاتھوں سے نکل گئی اور اس طرح عہد تثلیث کے بتیس سال کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ اور مسلم لیگ نے علی گڑھ سے خارج البلد ہو کر لکھنؤ کی تازہ اور کھلی ہوا میں نئی آزادی کا مالک ہو گیا۔ جس کی تفصیل آئندہ باب میں کی گئی ہے۔

آئینی اصلاحات کی تیسری قسط

اسی دوران میں ہندوستانی کونسلوں کا قانون اصلاحات ۱۹۰۹ء میں پاس ہوا۔ اصلاحات کی یہ تیسری قسط اٹھارہ سال بعد دی گئی۔ اس کی رو سے جدید کونسلوں میں پہلی بار ہندوستانیوں کا تقرر بذریعہ انتخاب منظور کیا گیا۔ یہ وہی حق انتخاب ہے جس کی مخالفت بیس سال قبل مسٹر بیک نے مسلمانوں کے نام سے شروع کی تھی اور جس کا سلسلہ ۱۹۰۶ء تک جاری رہا جب کہ مسٹر آرچبولڈ کے مشورہ کے مطابق مسلمانوں کی عرضداشت شملہ ڈیپوٹیشن کے نمونہ کی نیابتی ہاتھوں کی مخالفت کی گئی۔ اسی قانون کی رو سے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کا مسئلہ طے ہوا۔ جس کی مخالفت لارڈ مارلے وزیر ہند نے کی تھی اور یہ تجویز کیا تھا کہ مسلمانوں کو معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب دیا جائے مگر گورنمنٹ ہند نے جداگانہ انتخاب کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس کو پاس کرا دیا۔ اور اس طرح ہندو مسلمانوں میں مستقل جدائی پیدا کرنے کی غرض سے دونوں کے لئے مختلف مفادات پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

اس قانون کی رو سے مرکزی اور صوبجاتی کونسلوں کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ انہیں بجٹ پر بحث کرنے اور رزولیوشن پیش کرنے کے اختیارات

دیئے گئے۔ صوبوں کی کونسلوں میں غیر سرکاری ممبروں کی کثرت کر دی گئی۔ چند سال بعد
سکریٹری آف سٹیٹ کی کونسل میں یک ہندوستانی ممبر مقرر کیا گیا۔ نیز وائسرائے کی
گزنو کونسل میں ایک ہندوستانی ممبر مقرر کیا گیا۔

جس عقیدے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جو جذبہ ابھر جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہندو ہم کو دبائے لیتے ہیں اس لئے ہم کو تحفظ کرنا چاہئے۔

مسلم لیگ کا اصلی عنصر صرف یہ ہے باقی جو کچھ ہے، موقعہ و محل کی خصوصیات کے لحاظ سے تصویر میں کوئی خاص رنگ بھر دیا جاتا ہے۔ ہم شملہ ڈیپوٹیشن کی عظمت و اہمیت کے منکر نہیں یہ سب سے بڑا تماشا تھا جو قومی اسٹیج پر کیا گیا۔ لیکن گفتگو یہ ہے کہ کیا رعایا میں سے دو قوموں کی باہمی نزاع اور بٹوارہ جوئی کا نام پالٹکس ہے اگر یہ پالٹکس ہے تو معاملہ بہت سہل ہے روزانہ جو کچھ ہوتا ہے وہ سب پالٹکس ہے اور باقی کو [illegible] ضرور نہیں بلکہ سیاست کا عنصر کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ جیسا کہ ہم اس مضمون سے پہلے حصہ میں کہہ آئے ہیں پالٹکس کا مفہوم [illegible] شروع ہوتا ہے جہاں سے یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ نظام حکومت میں رعایا کی شرکت کس حد تک ہونی چاہئے۔ یعنی پالٹکس گورنمنٹ اور رعایا کے باہمی معاملات کا نام ہے نہ کہ رعایا کے باہمی تنازعات اور حقوق طلبی کا۔

آگے چل کر مولانا موصوف نے لیگ اور کانگریس کے نزدیک مشترک مقصد بیان کیا ہے اور ان میں فرق دکھانے کے بعد حسب ذیل تحریر فرمایا ہے:

"پالٹکس دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے، وہ مذہب کے برابر طاقت رکھتا ہے وہ انسان کے تمام جذبات کو زندہ کر دیتا ہے اس سے تمام قومیں مشتعل ہو جاتی ہیں وہ انسان میں ہر قسم کا ایثار اور خود فروشی پیدا کر دیتا ہے لیکن موجودہ پالٹکس نے یہ اوصاف ایک شخص میں بھی پیدا کئے ہیں۔ کیا ہماری پالٹکس میں آنے والا شخص ایک ذرہ بھی اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی قسم کے نقصان کے لئے تیار ہے کیا وہ اپنے آپ میں کوئی عزم

اور دیری پاتا ہے؟ کیا ہمارے پولیٹکل تماشا گردوں میں ایک شخص بھی تیار ہوا
جو سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کی طرح (جس میں اس وقت ۲۰ شخص موجود ہیں)
اپنی تمام زندگی باوجود گریجویٹ ہونے کے تیس روپیہ ماہوار پر قوم کے لئے
نذر کر دے جناب وائسرائے کے حضور میں ڈیپوٹیشن کے ممبر بننے کے لئے
تمام ملک نے اپنی خدمتیں پیش کی تھیں لیکن ذرا سوال کو بدل دو یعنی ڈیپوٹیشن کو
وائسرائے کی خدمت میں نہیں بلکہ کسی ادنیٰ معمولی درجہ کے حاکم پاس جانا ہوتا
تو گو مقصد کتنا ہی اہم ہوتا تاہم ممبروں کی تعداد کس حد تک رہ جاتی؟ اس سوال
کو ذرا اور ترقی دو یعنی فرض کرو کہ ڈیپوٹیشن لے جانے سے یہ احتمال ہوتا کہ
کسی رئیس و شکستہ پیشانی پر شکن پڑ جاتے تو تعداد کا پارہ دفعتاً کس درجہ
نیچے اتر آتا؟ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کا نفس خود نہیں دھوکا دے
رہا ہے۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر ہماری پالٹکس اصل
پالٹکس ہوتی تو جد و جہد، ایثار و خود فروشی کے جذبات خود بخود ساتھ
ساتھ پیدا ہوتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی جاتی
ہے تو پھر

تا ثریا می رود دیوار کج !!!

کا مصداق ہوتا ہے۔

پھر مولانا شبلی نے مفصل طور پر بتایا کہ مسلم لیگ کے مقاصد میں ایسی تبدیلی کی جائے
جس سے ملک کے عام فوائد پیش نظر رہیں۔

مقاصد مسلم لیگ میں تبدیلی

۲۲، ۲۳ مارچ ۱۹۱۳ء کو میاں سر محمد شفیع کی صدارت میں لکھنؤ مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ اس میں
پچھلی روایات کے خلاف اس جلسہ کے خطبہ استقبالیہ میں جناب منشی احتشام علی رئیس کاکوری

نے فرمایا کہ ہندوستان میں بھی سول سروس کا امتحان جاری نہ کیا جائے۔ اس برس میں مقاصد مسلم لیگ میں حسب ذیل تبدیلیاں کی گئیں:

۱۔ مسلمانوں میں سلطنت برطانیہ کی وفاداری کے خیالات پیدا کرنے کی بجائے ملک کے لوگوں میں تاج برطانیہ کی وفاداری کے خیالات پیدا کرنا کیا گیا۔

۲۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جگہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی اور دیگر حقوق کی حفاظت و ترقی درج کیا گیا۔

۳۔ مقاصد میں حسب ذیل الفاظ بڑھا دیئے گئے "تاج برطانیہ کے تحت میں ہندوستان کے سوٹ ایبل (حسب حال) سیلف گورنمنٹ حاصل کرنا"

ریزولیوشنوں میں ایک خاص ریزولیوشن مسٹر مظہر الحق کی تحریک سے یہ پاس ہوا کہ ہندوستان کے دونوں فرقے یعنی ہندو و مسلمان مل کر ترقی کریں۔ مسلم لیگ کے اس جلسہ میں مسز سروجنی نائیڈو اور بہت سے کانگریسی لیڈر شریک ہوئے۔ مسلم لیگ کے مقاصد میں سیلف گورنمنٹ کے اضافہ سے بظاہر اُس نے ملکی سیاسیات کی طرف بڑا قدم اُٹھا لیا۔ مگر اس زمانہ میں مسلمانوں کے سیاسی جذبوں کا پارہ اس قدر اونچا چڑھا ہوا تھا کہ بہت سے اصحاب لیگ کی اس حالت کو بھی بہت پست سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم کی متعدد نظمیں مسلم لیگ کی ہجو میں شائع ہوئیں جن میں سیلف گورنمنٹ کے ساتھ "سوٹ ایبل" یعنی ہندوستان کے حسب حال کے الفاظ کے اضافہ پر سخت سخت اعتراضات کیے گئے۔ یہ نظمیں کلیات شبلی میں شائع ہوئی ہیں جن میں سے چند شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

چہرہ پہ ہے جو سیلف گورنمنٹ کا نقاب — پردہ دریدہ دراصل یہ تسلیم و ناز ہے
سمجھے نہ یہ کہ سوٹ ایبل کی جو شرط ہے — تمہید سجدہ ہائے جبینِ نیاز ہے
سمجھے نہ لوگ یہ کہ یہ لفظ پُر فریب — اس ملک میں تسلیمِ غلامی کا راز ہے

پہنچی کہ فساد کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ اس پر گورنر صاحب کے سامنے دونوں فریق کے درمیان کچھ سمجھوتہ ہوا۔ صبح کے اجلاس میں حسب معمول صرف خطبۂ صدارت پڑھا گیا۔ جب سہ پہر کا اجلاس شروع ہوا تو پولیس کمشنر نے، سپرنٹنڈنٹ پولیس اور نصف درجن انگریز افسران پولیس پچاس کانسٹبلوں کے ساتھ اجلاس سے باہر جمع ہو گئے اور خفیہ پولیس کے لوگ وزیٹروں کے ٹکٹ لے کر اجلاس میں داخل ہوئے۔ ضابطہ کے رزولیوشن کرسئ صدارت سے پیش ہوئے۔ اس کے بعد جب مسٹر جناح کو اپنا رزولیوشن پیش کرنے کی ہدایت کی گئی تو مولانا حسرت موہانی نے فرمایا کہ اول میرا رزولیوشن بابت التوا اجلاس لیا جائے۔ صاحب صدر نے فرمایا کہ آپ سے پہلے کہہ دیا گیا تھا کہ آپ کا رزولیوشن بے قاعدہ ہے۔ اس پر مولوی عبدالرؤف خاں سکریٹری انجمن ضیاء الاسلام بمبئی نے شور مچایا اور کہا کہ مولانا حسرت کو بولنے دیا جائے۔ اجلاس میں شور و شغب ہوا اور اردو تقریر کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ بالآخر صاحب صدر نے مولانا حسرت کو تقریر کرنے کی اجازت دی۔ موصوف نے اپنی تقریر میں یہ اعتراضات فرمائے کہ انگریزی میں تقریریں کی گئی ہیں، کانگریس والوں کی تعظیم کی گئی ہے یہ لوگ مسلم لیگ کو کانگریس سے ملا رہے ہیں۔ اس وقت چونکہ مخالفین ہال کے اندر گھس آئے تھے اور فساد کرنا چاہتے تھے اس لئے جلسہ کی کارروائی بند کر دی گئی۔ اور دوسرے روز تاج محل ہوٹل میں اجلاس ہوا جس میں مسٹر مظہر الحق صدر نے کچھ حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> "مسٹر جناح نے حکام سے مدد مانگی تھی مگر اس سے انکار کر دیا گیا اور اجلاس کے وقت پولیس کمشنر اجلاس سے باہر کھڑے تھے اس وقت انہوں نے فرمایا کہ پنڈال میں جلسہ نہ ہونا چاہیئے بہرحال جلسہ کی جگہ اس پرائیویٹ جلسہ میں مسٹر جناح کی تحریک سے کمیٹی جو دیگر اقوام سے سمجھوتہ کر کے اصلاحات کی ایک اسکیم تیار کرے بنائی گئی۔"

اب چونکہ مسلم لیگ کانگریس سے اس قدر قریب آگئی تھی کہ اس کے اجلاس کانگریس کے ساتھ ہونے شروع ہو گئے۔ تھے، ورنہ ہز ہائی نس سر آغا خاں، مسلم لیگ کی حرارت کا پارہ اس قدر اونچا ہونے کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے، جلاس بمبئی میں اُن کا استعفیٰ مستقل صدارت سے آگیا اور مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں راجہ محمود آباد اُن کی جگہ صدر منتخب ہوئے اور اس طرح ہز ہائی نس موصوف کا دس سالہ عہد جو مسلم لیگ کی پیدائش سے شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔ مسٹر سید وزیر حسین دوبارہ سکریٹری مقرر ہوئے۔

شیخ الہند اور دیگر سیاسی لیڈروں کی نظر بندی

اگست ۱۹۱۴ء میں یورپ میں جنگ عظیم چھڑ جانے سے گورنمنٹ نے ضروری سمجھا کہ سیاسی لیڈروں کو نظر بند کر دیا جائے جس کے لئے "ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ" نافذ کیا گیا۔ مئی ۱۹۱۵ء میں مولانا شوکت علی اور محمد علی نظر بند کئے گئے اور اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی نظر بند ہوئے اور نصف صدی بعد اب گوشہ نشین قدیم تعلیم یافتہ علماء کی بھی باری آگئی جن میں سب سے نمایاں شیخ الہند مولوی محمود حسن صاحب تھے۔

آپ مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے مدرس اول تھے اور بجز درس و تدریس کے کسی چیز سے سروکار نہ رکھتے تھے۔ آپ کی تحریک کا تذکرہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس طرح کیا گیا ہے کہ:

"اگست ۱۹۱۵ء میں آپ کے ایک شاگرد مولوی عبیداللہ کابل چلے گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے جرمن اور ترکی مشن سے جو افغانستان آیا ہوا تھا مل کر امیر کابل پر برطانیہ کے خلاف زور ڈالا۔ اسی سال ستمبر میں مولوی محمود حسن مکہ معظمہ چلے گئے اور وہاں سے انہوں نے غالب پاشا

کا دستخطی سند مولوی محمد میاں کے ہاتھ مولوی عبید اللہ کے پاس کابل بھیجا
جس میں برطانیہ کے خلاف جہاد کی ترغیب دی گئی تھی۔ رولٹ رپورٹ میں
یہ بھی تحریر تھا کہ ان اصحاب نے یہ تجویز کیا تھا کہ برطانیہ کو شکست
دینے کے بعد ہندوستان میں ایک عارضی حکومت قائم کی جائے جس
کے پریسیڈنٹ راجہ مہندر پرتاپ سنگھ ہوں جو ضلع متھرا کے ایک
رئیس تھے اور ۱۹۱۴ء میں یورپ چلے گئے تھے اور برطانیہ کی مخالف
سلطنتوں سے تعلقات رکھتے تھے۔[1]

بالآخر مولوی محمود حسن معہ مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولوی عزیز گل وغیرہ
کے شریف حسین والی حجاز کے ذریعہ برطانیہ کے ہاتھ لگ گئے اور مالٹا میں
قید کر لئے گئے۔

رولٹ کمیٹی کی تحقیقات مولانا مولوی محمود حسن (شیخ الہند) کے بارے میں خواہ
غلط ہوں مگر اس سے یہ امر واضح ہو گیا کہ برطانیہ کے خلاف مولوی محمود حسن کی تحریک مذہبی نہ
تھی بلکہ سیاسی تھی اس لئے انہوں نے اپنی مجوزہ حکومت کا صدر ایک ہندو قرار دیا تھا
پس مسلمانوں کی بابت یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ مذہبی مجنون ہیں اور انگریزوں یا
ہندوؤں سے مذہبی تعصب رکھتے ہیں اور اسلامی حکومتوں سے تعلقات رکھ کر ان
کے ذریعہ ہندوستان میں کوئی مذہبی اور اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مولوی
صاحب موصوف کی تحریک کی نسبت زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک
غیر آئینی اور خلاف قانون تحریک تھی مگر اس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس
کا منشا ہندوستان میں بلا امتیاز مذہب و ملت تمام ہندوستانیوں کی حکومت قائم

---

[1] رپورٹ رولٹ کمیٹی اردو ترجمہ ص ۲۰۲، ۲۰۳

میں جو ۱۹۰۷ء کی سورت کانگریس کے اجلاس میں کانگریس سے علیحدہ ہو کر بند تھی شریک ہو گئے سی سال مسز اینی بیسنٹ نے ہوم رول کی تجویز پیش کر کے ہر دو فریق کو ملانے میں نمایاں حصہ لیا۔ مسز بیسنٹ اسی سلسلہ میں جیل بھیجدی گئی تھیں۔ اس سال کے ریزولیوشن جو مسلم لیگ میں پاس ہوئے اُن میں خاص یہ ہیں:

۱۔ اسکیم اصلاحات۔ جس سے کانگریس متفق ہے پاس کی جائے۔

۲۔ قانون اسلحہ

۳۔ قانون مطابع اور

۴۔ قانون حفاظت ہند نامناسب ہیں اُن کی ترمیم و تنسیخ کی جائے۔

۵۔ مولانا ظفر علی خاں و محمد علی و شوکت علی کی نظر بندی پر اظہار ناراضی کیا جائے۔

۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر جو نظر بند ہیں مقدمہ چلایا جائے۔

۷۔ انتظامی و فوجداری کی عدالتیں جدا جدا کر دی جائیں۔

۸۔ لفٹنٹ گورنروں کی جگہ گورنر مقرر ہوں۔

۹۔ اضافہ لگان اور بندوبست نامناسب ہیں۔

مندرجہ بالا تجاویز سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم لیگ فرقہ پرستی کے دائرے سے نکل کر ملکی سیاست کی کس قدر بلند سطح پر پہنچ گئی تھی اور مولانا شبلی کے معیار کے مطابق اب وہ ایک سیاسی جماعت بن گئی تھی اور اس میں صحیح سیاسی جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ اس جلسہ میں جو ہندو مسلم سمجھوتہ کیا گیا اس کی تفصیل حسب ذیل ہے

میثاق ملی!

۱۔ مرکزی اسمبلی میں ⅓ منتخب شدہ ممبر ہوں جن میں سے ⅓ مسلمان

۲۔ اگر کسی تجویز کی کسی جماعت کے ممبروں میں سے ۳/۴ تعداد مخالفت کرے تو وہ تجویز

اس سے بہتر جانیں۔ اس کے لئے ایک جماعت تیار کی گئی مگر زمانہ نازک تھا۔ اُس وقت ایسا ہو رہا تھا کہ خاص علی گڑھ کالج کے سکرٹری نواب حاجی محمد اسحاق خاں پنشنر تک اس میثاق ملی کے بڑے حامی ہو گئے۔ وہاں کے مقابلہ میں دوسرا فریق جو علی گڑھ سے مخالفت کرنے آیا تھا کامیاب نہ ہو سکا۔ اور کانگریس و مسلم لیگ کی متحدہ یادداشت وزیر ہند کی خدمت میں پیش کی گئی۔

کلکتہ کا اجلاس

دسمبر ۱۹۱۷ء میں کانگریس و مسلم لیگ کے جلسے کلکتہ میں ہوئے مسلم لیگ کے جلسہ کے صدر مولانا محمد علی قرار پائے جو نظر بند تھے۔ ان کے رہا نہ ہونے کی وجہ سے مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں والی محمود آباد نے صدارت کی۔ اس سال بھی باوجود ہندو مسلم بلووں کے واقع ہو جانے کے مسلم لیگ اپنے جدید مسلک پر قائم رہی اور اس نے مسلمانوں کے خاص مفاد کے ساتھ عام ملکی بہبودی کی تجاویز پاس کیں۔

بلوے مانع اتحاد نہ ہوئے

ستمبر ۱۹۱۷ء میں پھر ایک زبردست ہندو مسلم بلوہ بہار کے قریب موضع کٹار پور میں ہوا جس میں ۹ مسلمان زندہ جلا دیئے گئے۔ اس سے مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہوا۔ ملزمان پر مقدمات دائر ہوئے جو ابتدائی عدالت سے لے کر ہائی کورٹ تک مدتوں چلتے رہے مگر چونکہ اس زمانہ میں ایک سیاسی مسئلہ کے بعد دوسرا اہم مسئلہ پیش آ رہا تھا اس لئے ہندو مسلم اتفاق میں نہ صرف یہ کہ کوئی فرق نہیں بلکہ اس میں اور پختگی آتی گئی۔ اس سے قبل ۱۹۱۵ء میں بمبئی کے مقام پر مسلم لیگ اور کانگریس کے ایک ساتھ اجلاس ہوئے تھے اور صرف ۱۹۱۶ء میں دونوں جلسے جدا جدا مقامات میں منعقد ہوئے۔ ۱۹۱۶ء سے پھر یکجا ہونے لگے۔ اس طرح ۱۹۲۰ء تک ایک ہی مقام پر جلسے ہوتے رہے۔

جداگانہ انتخاب کی نسبت کرٹس کی رائے

اس کی تصدیق انگلستان کے ایک قابل شخص مسٹر لائنل کرٹس کی حسب ذیل تحریر سے ہوتی ہے۔ صاحب موصوف انگلستان کے مشہور سیاست داں تھے وہ ہندوستان میں آئے ہوئے تھے انہوں نے فرمایا:

"چند سال ہوئے جب کہ طریقۂ انتخاب جاری کیا گیا اس وقت جداگانہ انتخاب کا دیا جانا انگریزی گورنمنٹ کی سب سے بڑی غلطی تھی جو اس سے ہندوستان میں سرزد ہوئی۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر جداگانہ انتخاب کا اصول مستقل طور پر قائم ہو گیا تو ہندوستان میں ذات پات کا ایک نیا طریقہ جاری کرنے کے موجب ہوں گے اور یہ وہ طریقہ ہوگا جو ہندوستان کی زندگی کو سال بہ سال گھن کی طرح کھاتا رہے گا۔ جب تک یہ طریقہ جاری رہے گا ہندوستان کبھی قومیت کے اعتبار سے متحد نہ ہو سکے گا۔ وہ جتنے عرصہ تک وہ قائم رہے گا۔ اتنی ہی مشکل اس کے منسوخ کرنے میں پیش آئے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آخرکار اندرونی خانہ جنگی اس کا خاتمہ کرے گی۔"[1]

چنانچہ مسٹر کرٹس کی پیشین گوئی کے مطابق یہ شخص کے دل میں ایک قسم کا گھن لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے تمام علیحدہ علیحدہ ہیں۔ گھن یہ ہے کہ نہ معلوم کس بات پر شہر میں کس وقت بلوہ ہو جائے اور فساد کی آگ بھڑک اٹھے اور اس وقت نہ امیر محفوظ رہ سکتے ہیں اور نہ غریب۔ پہلے زمانے کی لڑائیاں صرف جوان اور تندرست لوگوں کی ہوا کرتی تھیں مگر اب دنیا کی ہر قسم کی ترقیوں کے باوجود ہندوستان کی قسمت ایسی پھوٹی ہے کہ بلوؤں کے وقت نہتّے لوگوں، بڈھوں اور بچوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ کتنے وقت

---

[1] خطوط بنام باشندگانِ ہند (انگریزی)، از مسٹر لائنل کرٹس صفحات ۲ و ۳

ایسے ہوتے ہیں کہ جوان آدمیوں کا ایک جتھا ہتھیار بند چلا آرہا ہے اور سامنے دوسری قوم کا ایک بڈھا آدمی نظر پڑا۔ اس غریب پر ہر طرف سے لاٹھیاں برسنے لگیں حتیٰ کہ وہ شخص ختم ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مقتول شخص قاتلوں کا ہم مذہب تھا مگر لباس وصورت کے دھوکے میں مارا گیا۔ دیسی پردیسی حتیٰ کہ ریل کے مسافر بھی مقامی بلوائیوں کی لٹھیوں کی زد میں آجاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ دودھ پیتے بچوں اور عورتوں کو قتل کر کے ان نعشوں پر کپڑے ڈال کر اور تیل چھڑک کر ان کو جلا دیا جاتا ہے۔ یہ سب کرشمے موجودہ زمانے کی فرقہ پرستی کے ہیں۔ جن کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ ان حالات سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے ۱۷ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اکیس روز کا فاقہ شروع کیا۔ اس سے شدھی سنگٹھن اور مسلمانوں کی تبلیغی تحریک رک گئی۔ مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور سوامی شردھانند نے تمام ملک میں اپیل شائع کی اور ۲۰۰ لیڈروں کو مدعو کیا۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۲۴ء کو جلسہ قرار پایا۔ تین سو آدمی جمع ہوئے۔ انگریز بھی شریک تھے۔ بجز کلکتہ یوروپین ایسوسی ایشن کے سب نے ہمدردی کی۔ گرجاؤں تک میں گاندھی جی اور اتحاد کانفرنس کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو شہر دہلی کے سنگم تھیٹر میں جلسہ شروع ہوا۔ مولانا محمد علی نے افتتاحی تقریر کی اور تبادلہ خیالات کے بعد پنڈت موتی لال نہرو صدر جلسہ کی تجویز اس مضمون کی پاس کی کہ بلووں سے سخت تباہی ہو رہی ہے اس لئے ہر مذہب کے لوگوں سے درخواست کی جائے کہ قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی جگہ پنچایتوں کے ذریعہ معاملات طے کیا کریں ورنہ بدرجہ مجبوری عدالتوں سے رجوع کیا کریں۔ اس تجویز کے پاس ہونے پر گاندھی جی نے اپنا فاقہ توڑ دیا۔ اور اتحاد کمیٹی کو کہا کہ کوئی عملی شکل اختیار کی جائے۔ ایک پرمیننٹ پنچایت بورڈ مقرر کیا گیا۔ جس نے ۲ قراردادیں منظور کیں۔ ان میں سے ایک قرارداد جو اہم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"ہر مذہب کو آزادی ہے اپنی عبادات اور رسم ادا کرنے کا جس سے دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔ اختیار ہے مسلمان گاؤکشی اپنی خوشی سے کم کریں

اُنہوں نے مخلوط انتخاب کے بارہ میں رائے پوچھی میں نے کہا کہ میں وزیر ہند و وائسرائے صاحب
لفٹنٹ گورنر کی اس رائے سے متفق ہوں کہ مخلوط انتخاب جاری کیا جائے۔ اس پر انہوں نے کہا
کہ وزیر ہند اس ملک سے بہت دور ہیں اور یہاں کے حالات سے واقف نہیں ہیں۔ اور
میرس صاحب نے اپنی رائے بدل دی ہے۔ تم ان سے مل کر ضرور بات چیت کرلو۔ میں نے کہا کہ میں
اُن سے نہ ملوں گا مگر صاحب موصوف نے مجھ سے بے حد اصرار کیا کہ تم ان سے ضرور ملو۔ اس کے
بعد کلکٹر صاحب کی نسبت معلوم ہوا کہ مسلمان رؤسا سے اُن کے مشورے جداگانہ انتخاب
کی تائید میں جلسے کرانے کے بارہ میں ہوئے اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے ضلع میں اور دیگر
اضلاع میں اسی غرض سے جلسے ہوئے۔ اس وقت سے راقم حروف کے دل میں یہ کھٹکا پیدا
ہوا کہ یہاں کے حکام کو اس بارہ میں کیوں دلچسپی ہے کہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق
حاصل رہے۔ اُس وقت غور کرنے سے سمجھ میں آیا کہ انگلستان کے مدبرین ہندوستان
کے مسائل کو عام سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے یہاں کی دفتری حکومت
اس تحریک کی عینک سے دیکھتی ہے جو سر آکلینڈ کالون و مسٹر بیک نے مسلمانوں کو دیگر
اقوام سے جدا کرنے کے لئے جاری کی تھی اور جس کا نتیجہ جداگانہ انتخاب ہوا۔ اس طریقہ
انتخاب سے اُوپر کے طبقہ کے لوگوں کو یہ ضرور سہولت ہے کہ وہ صرف اپنی قوم کے
لوگوں سے ووٹ لے کر ممبر بن جاتے ہیں اور ممبر بننے کے بعد ہندوؤں سے خوب
شیر و شکر رہتے ہیں۔ شہر کے اندر محلوں میں غریب ہندو و مسلمانوں کے خوب قریب
قریب رہتے ہیں اور سول لائنس میں ہندوستانی دوش بدوش مل کر رہتے ہیں۔ ایک دوسرے
کے ساتھ خوب گھل مل کر رہتے ہیں دونوں کی عورتوں میں خوب محبت اور اتحاد ہوتا ہے
یہ سب اس لئے کہ وہ کونسلوں اور بورڈوں میں پہنچ کر ایک دوسرے کو ووٹ دے
سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے غریب مسلمان کے پاس
کوئی صورت ہندو ممبر کے آنے کی نہیں ہے اس لئے وہ ہر بات میں مظلوم و مقہور بنتے ہیں

ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ عرضداشت سائمن صاحب کو دے دی گئی۔

نہرو کمیٹی کی رپورٹ

مگر غنیمت ہے کہ سائمن کمیشن کے سامنے مسلمانوں کے مطالبات پیش ہونے کے علاوہ ہندو مسلمانوں میں سمجھوتہ کی کوششیں بھی جاری رہیں اس کی ابتداء کانگریس کے اجلاس گوہاٹی سے ہوئی جو دسمبر ۱۹۲۶ء میں منعقد ہوا تھا۔ اجلاس کے بعد کانگریس کی مجلس عاملہ نے ہندو مسلمان لیڈروں سے اس بارہ میں گفتگو شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو اسمبلی کے اجلاس کے زمانہ میں دہلی میں چند مسلمان لیڈروں کا ایک جلسہ زیرِ صدارت مسٹر محمد علی جناح منعقد ہوا اس میں قرار پایا کہ مسلمان تمام صوبوں میں مخلوط انتخاب ماننے کے لئے حسب ذیل شرائط پر تیار ہیں:

۱۔ سندھ کو ایک جداگانہ صوبہ بنا دیا جائے۔

۲۔ صوبۂ سرحدی اور بلوچستان میں مثل دیگر صوبوں کے اصلاحات جاری کی جائیں یعنی کونسلیں مقرر کر دی جائیں۔

۳۔ پنجاب اور بنگال میں مختلف قوموں کے ممبرانِ کونسل کی تعداد اُن کی آبادی کے مطابق ہو۔

۴۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمان ممبروں کی تعداد ایک ثلث سے کم نہ ہو۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے ان تجاویز پر مسرت کا اظہار کیا۔ اور ہندوستان کے لئے سوراج کا آئین بنانا تجویز کیا اور سالانہ اجلاس بمبئی میں قرار پایا کہ ان امور کے طے کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ مسلم لیگ نے سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۲۷ء منعقدہ کلکتہ میں مندرجہ بالا تجاویز میں مذہبی آزادی اور تین چوتھائی ممبروں کی رائے سے کسی تجویز کے خارج از بحث ہونے کی شرط کا اضافہ کر کے انہیں منظور کر لیا۔

پھر ہندوستان کی مختلف قوموں کی سیاسی جماعتوں کو مدعو کیا گیا اور فروری ۱۹۲۸ء کو دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس منزل پر پہنچ کر یہ دقت پیش آئی

ایک طرف تو مسلمان فرقہ پرستوں نے اپنے مطالبات میں اضافہ کرنا شروع کیا اور دوسری
طرف ہندو مہاسبھا نے مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت کی جن میں مخصوص طور پر سندھ
کی علیحدگی تھی اور دونوں جماعتوں میں رسہ کشی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان معاملات کو طے کرنے
کے لئے آل پارٹیز کانفرنس نے ایک چھوٹی کمیٹی مقرر کی جس میں دو نمایندے مسلمانوں کے
دو ہندو مہاسبھا کے اور ایک ایک نمایندہ ممبر برہمنوں اور سکھوں لبرلوں اور مزدوروں
کا تھا ان سب نے مل کر فرقہ وارانہ امور طے کئے جو نہرو رپورٹ مرتبہ پنڈت موتی لال
نہرو میں شامل ہو کر آل پارٹیز کانفرنس کے مشہور جلسہ منعقدہ ۲۹ اگست ۱۹۲۹ء میں جو
لکھنؤ میں زیر صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری منعقد ہوا پیش ہوئے۔ اُس وقت سب سے
بڑا اختلاف پنجاب کے مسئلہ میں تھا مگر بالآخر مولانا ظفر علی خاں مولوی حبیب الرحمان
لدھیانوی اور چودھری افضل حق کی پارٹی نے اور نیز سکھوں نے اس سمجھوتہ کو پنجاب میں
مخلوط انتخاب بلا تعیین نشست کے ساتھ مان لیا البتہ مسلم جماعتوں میں مولانا شوکت علی
صدر خلافت کمیٹی نے اور مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ العلماء نے اپنے اپنے بیانات
دیئے جن میں بعض امور سے اختلاف کیا۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر سوبھاش
چندر بوس نے مشروط طریقہ پر نہرو رپورٹ کو منظور کیا۔ شرط یہ تھی کہ وہ اپنے آزادئ کامل
کے مطالبہ کو نہیں چھوڑتے ہیں مگر فی الجملہ لکھنؤ کے جلسہ میں نہرو رپورٹ منظور ہو گئی اور اس
کی خوشیاں جلسہ میں اور اُس کے بعد تمام ملک میں منائی گئیں اور سمجھا گیا کہ اس کے ذریعہ
ہندوستان کے لئے ایک متفقہ آئین پیش کر کے لارڈ برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب
دے دیا گیا۔ افسوس کہ پنجاب کے سکھوں کے ایک طبقہ نے مخلوط انتخاب بلا تعیین
نشست کو اپنے لئے مضر سمجھ کر اُس فیصلہ سے انحراف کیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت
نے بھی اختلاف کیا۔ آخر دسمبر ۱۹۲۸ء میں کانگریس اور کنونشن کا جلسہ کلکتہ میں ہونا
قرار پایا جس میں نہرو رپورٹ پیش ہونے کو تھی مسلم لیگ کا جلسہ بھی کلکتہ ہی میں زیر صدارت

درآں حالیکہ اس کی موجودگی میں ہندو ممبر غریب مسلمان ووٹروں سے مستغنی ہو کر مسلمانوں کے حقوق پامال کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے اس اجلاس میں صرف ایک طویل قرارداد پاس ہوئی جس پر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی مدات کی تعداد ۱۹۲۶ء کے تبدیلی مطابق تین گونہ ہوگئی۔ اس قرارداد کا خلاصہ یہ ہے:

"ہندوستان کی مرکزی حکومت وفاقی ہو اور باقی اختیارات مختلف ریاستوں اور صوبوں کو حاصل ہوں اگر کسی جماعت کے تین چہارم ممبر کسی تجویز یا بل سے اختلاف کریں تو وہ قانون ساز جماعت کے سامنے پیش نہ ہو۔ مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ وہ اسے ضروری سمجھیں۔ مرکزی اور صوبائی کابینوں میں ان کی مناسب نیابت ہو۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی کثرت ہے وہاں ان کے ممبروں کی موجودہ تعداد میں کمی نہ کی جائے۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمان ممبروں کی تعداد ایک ثلث ہو۔ صوبہ سندھ علیحدہ کر دیا جائے۔ صوبہ سرحدی اور بلوچستان میں اصلاحات جاری کر دی جائیں۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا مناسب حصہ ہو۔ مسلمانوں کی تہذیب، زبان، تعلیم، مذہب، پرسنل لا، اوقاف کی حفاظت ہو اور سرکاری تعلیمی مدد میں مناسب حصہ ملے اور آئین ہند میں کوئی تبدیلی بہ رضامندی جملہ ریاستوں اور صوبوں کی حکومتوں کے نہ کی جائے۔"

نہرو رپورٹ کے بارے میں مسلم لیگ میں اختلاف

اس جلسے کے تین [illegible] بعد تحریر [illegible] میں مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس، کلکتہ کے اجلاس کی ناتمام کارروائی ختم کرنے کے لئے بمقام دہلی زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح منعقد ہوا۔ اس موقعہ پر پنجاب کی

جماعت بھی آئی تھی جو شفیع لیگ کے نام سے مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئی۔ باقاعدہ جلسہ شروع ہونے سے قبل اوّل مختلف فریقوں میں باہمی مصالحت کے لئے متعدد جلسے ہوئے۔ مسٹر جناح کا طویل رزولیوشن مشتمل بر چودہ نکات زیر بحث رہا۔ اس رزولیوشن میں تمام وہ امور داخل تھے جو مسلم آل پارٹیز کانفرنس دہلی نے جنوری ۱۹۲۹ء کے جلسے میں پاس کئے تھے۔ اور نہرو رپورٹ کو اس بنا پر نامنظور کرنا تجویز کیا گیا تھا کہ:

"سکھ، نان برہمن اور پست اقوام اُسے منظور نہیں کرتے۔ کانگریس اُسے ایک سال کے لئے ملتوی کر چکی اور مسلمانوں کے لئے وہ غیر مفید ہے۔"

مگر مسلمانوں کی آزاد خیال جماعت چاہتی تھی کہ کچھ ترمیمات کے ساتھ نہرو رپورٹ پاس کر دی جائے۔ چنانچہ بڑی رد و کد کے بعد ۳۰ مارچ ۱۹۲۹ء کو اوّل مجلس مضامین زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح شروع ہوئی کچھ دیر بعد مسٹر جناح ارکین مسلم کانفرنس کے نواب اسمٰعیل خاں کے مکان پر سمجھوتہ کے لئے چلے گئے اور مجلس مضامین کا کام جاری رہا۔ اس میں ایک تجویز کے ذریعہ نہرو رپورٹ کی تائید اس شرط پر کی گئی کہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک ثلث نشستیں دی جائیں پنجاب اور بنگال میں آبادی کی نسبت سے کونسلوں میں نمائندگی کی جائے۔ صرف جنگ یا بغاوت کے زمانہ میں مرکزی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ صوبہ کی حکومت کے فیصلہ کو منسوخ کر سکے۔ مذہبی قانون میں کوئی تبدیلی اس وقت تک نہ ہو سکے جب تک کہ مسلمان ممبروں کی اکثریت اسے منظور نہ کر لے وغیرہ وغیرہ۔ بدقسمتی سے علی برادران اس تجویز کے مخالف تھے۔

جس وقت اس تجویز پر بحث ہو رہی تھی تو باہر کے لوگ بکثرت پنڈال میں

۱۹۳۰-۳۱ء کی سول نافرمانی میں مسلمانوں کا حصہ

کانگریس میں آزادی کامل کی تجویز پاس ہونے کے بعد ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو تمام ہندوستان میں یوم آزادی منایا گیا۔ اور مہاتما گاندھی ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو نمک کے قانون کی خلاف ورزی کرنے کے لئے اپنے سفر پر پا پیادہ روانہ ہوئے۔ اب رعایا اور حکومت کے درمیان ۱۹۲۰-۲۲ء کے بعد سول نافرمانی کی جنگ شروع ہوئی جو رعایا کے نزدیک پرامن تھی اور حکومت کے نزدیک تشدد آمیز تھی اور جس میں گرفتاریاں، لاٹھیاں، بندوقوں کی باڑھ اور آرڈیننسوں کا دور دورہ تھا۔ اس پرامن جنگ میں مسلمانوں کی شرکت انفرادی اور جماعتی دونوں حیثیتوں سے ہوئی۔ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد مسٹر عباس طیب جی ڈکٹیٹر مقرر ہو کے جیل میں گئے اور ایک جماعت مثل مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر سید محمود، تصدق احمد خاں شروانی، مسٹر رفیع احمد قدوائی، خان عبدالغفار خاں کے پیش پیش رہی اور جمعیۃ العلماء، احرار، [illegible] اور خدائی خدمتگاروں نے بڑی بڑی قربانیاں کیں، اور خود مسلم لیگ کے اندر جو دو کیمپ ہو گئے تھے ان میں سے ایک نے لیگ سے باہر نیشنلسٹ مسلم پارٹی کی حیثیت سے اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔

یہی ۱۹۳۰ء وہ سال ہے جس کے ماہ نومبر میں لندن میں پہلی گول میز کانفرنس کا جلسہ منعقد ہوا اور اس میں کانگریس کے لوگ شریک نہیں ہوئے۔

رجعت پسند جماعتوں کے جلسے

ناظرین واقف ہیں کہ مسلم لیگ سے آزاد خیال یا قوم پرست لوگوں کے نکل جانے سے وہ پوری طرح رجعت پسند مسلمانوں کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ مسلم لیگ اور مسلم آل پارٹیز کانفرنس کا جو بعد میں مسلم کانفرنس کہلائی، ایک ہی مسلک تقریباً ہو گیا تھا اور دونوں کے پیش نظر مسٹر جناح کے چودہ [illegible]

ان بعض جماعتوں کے چند جلسوں کا مختصر حال لکھا جاتا ہے۔

(الف) مسلم لیگ کا اکیسواں اجلاس دسمبر ۱۹۳۰ء میں بمقام الہ آباد زیر صدارت ڈاکٹر سر محمد اقبال منعقد ہوا۔ جس میں مسلم کانفرنس کے ۱۹۲۹ء والے رزولیوشن کی تائید کی گئی اور جو مسلمان گول میز کانفرنس میں گئے تھے ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

(ب) مسلم لیگ کا بائیسواں اجلاس آخر دسمبر ۱۹۳۱ء میں بمقام دہلی زیر صدارت چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں قرار پایا۔ اُن کی مخالفت میں بڑا ہنگامہ ہوا حتیٰ کہ جلسہ میں تشدد کے اندیشہ سے مقام اجلاس کو تمام تر پوشیدہ رکھا گیا۔ اور نئی دہلی میں نواب صاحب سید نواب علی کے مکان پر مسلم لیگ کا یہ سالانہ جلسہ کیا گیا۔ لیگ کے اس جلسہ میں انتہا پسندوں کے ضعف اور بغاوت پیشہ کے خلاف تجاویز پاس کی گئیں۔

مسلم نیشنلسٹ پارٹی اور اس کا انجام

گذشتہ صفحات میں متعدد بار مسلم نیشنلسٹ پارٹی کا تذکرہ آیا ہے۔ ذیل میں اُس کے جلسوں کے مختصر حالات درج کئے جاتے ہیں:

(۱) اس پارٹی کا پہلا جلسہ ۲۷ جولائی ۱۹۲۹ء کو الہ آباد میں زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد منعقد ہوا جس کا مقصد یہ قرار پایا کہ مسلمانوں میں حب الوطنی پیدا کی جائے اور انہیں آمادہ کیا جائے کہ وہ فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر ملک کی سیاسی جدوجہد میں شریک ہوں۔ اور اکثریت و اقلیت کے درمیان ایسے تعلقات پیدا کئے جائیں جن سے اکثریت کمال وسعت قلب کے ساتھ مسلمان اقلیت کے حقوق تسلیم کر لیں۔ اس جماعت کے مستقل صدر مولانا ابوالکلام آزاد و نائب صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری و سکریٹری مسٹر تصدق احمد خاں شروانی مقرر ہوئے۔

پاس ہونے سے سب سے مقدم کاشت کاروں و مزدوروں کی بہبودی کانگریس کے
پیشِ نظر ہو گئی۔

کانگریس کے اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد گول میز ... میں شرکت کا
مسئلہ درپیش تھا۔ مگر لارڈ اِروِن کے چلے جانے سے اب تو کا رُخ بدل چکا تھا۔ لارڈ
ولنگڈن نے ۱۷ اپریل ۱۹۳۱ء کو چارج لے لیا تھا۔ صاحب موصوف برخلاف
دیگر وائسرایوں کے بحیثیت گورنر بارہ سال ہندوستان میں رہ چکے تھے
اور ذہنیت کے اعتبار سے سر آکلینڈ کالون کے زمرہ میں جنہوں نے کانگریس کے
ابتدائی زمانہ میں اُسے کچلنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا شمار کئے جا سکتے تھے۔ لارڈ
ولنگڈن کے چارج لیتے ہی اُن میں اور کانگریس میں باہمی شکایتیں پیدا ہو کر بڑھنے
لگیں۔ ہر آئینی حکومت میں جدید عہدہ دار اپنے پیش رو کی قراردادوں اور وعدوں کا پابند ہوتا
ہے مگر اس بارہ میں لارڈ ولنگڈن نے شخصی حکومت کے عہد و پیماں کو بھی مات دے
دی اور لارڈ اِروِن کے جاتے ہی:

"بساط کا نقشہ پلٹ گیا۔ لارڈ اِروِن نے اگر شولاپور کے قیدیوں کی رہائی
وعدہ کیا تھا تو اس سے اب کیا حاصل؟ اگر انہوں نے گجرات سے مستعفی ہو
جانے والے ڈپٹی کلکٹروں کی پنشنوں کا یقین دلایا تھا تو اب اس سے کیا
فائدہ اگر انہوں نے فروخت شدہ جائدادوں واپسی کے سلسلہ میں صوبجاتی
حکومتوں سے سفارش کرنے کے لئے کہا تھا تو وہ نقش بر آب تھا یہ تمام
وعدے لارڈ اِروِن کے ساتھ ہی چلے گئے"[1]

---

[1] تاریخ کانگریس حصہ دوم از ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا ص [illegible]

انگریز ہندوستان میں پنچ بنے بیٹھیں رہیں تاکہ وہ موجودہ سیاسی نظام کو
قائم رکھیں اور ان کے مستقل حقوق کی حفاظت کرتے رہیں۔[1]

مگر باوجود ان تمام مواقع کے ایسے سامان ہو گئے تھے کہ گول میز کانفرنس کے وقت سمجھوتہ ہو جاتا۔ اس کی صورت بقول مسٹر تصدق احمد خاں شروانی مرحوم یہ پیدا ہو گئی تھی:

"سر محمد شفیع نے مسلمانوں کی طرف سے ایک تجویز پیش کی تھی جس کی رو سے معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب جاری کر دیا جائے مگر پنڈت مدن موہن مالویہ نے اسے محض ایک نشست کی کمی بیشی کی بنا پر نامنظور کر دیا اور چونکہ ہندوؤں کو کتاب "بیداریٔ ہند" کے مصنف مسٹر میکڈانلڈ وزیراعظم سے توقعات تھیں اس لئے ان کے نام ایک چٹھی لکھی کہ وہ فرقہ وارانہ فیصلہ دیں۔ اس چٹھی پر کسی مسلمان نے دستخط نہیں کئے تھے اور ہندوؤں میں گاندھی جی، مسز نائیڈو، سر تیج بہادر سپرو نے بھی نہیں کئے تھے۔"[2]

چنانچہ اس چٹھی کی رو سے فرقہ وارانہ فیصلہ وزیراعظم کے سپرد کر دیا گیا۔

پر امن جنگ کی تجدید

افسوس کہ گاندھی جی اس مشن میں ناکام رہے جس سے تمام دنیا میں ہندوستانیوں کی ہوا خیزی ہوئی۔ گاندھی جی لندن سے رخصت ہو کر ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کو ہندوستان پہنچے یہاں پہنچتے ہی کانگریس اور حکومت کے درمیان شکایت کے دفتر کھلنے شروع ہو گئے۔ گاندھی جی

---

[1] میری کہانی جلد ۲، ص ۲۹۶ از پنڈت جواہر لال نہرو

[2] ماخوذ از اخبار لیڈر الہ آباد مورخہ ۳۰ اگست ۳۶ء

نے صدارت کرنے کے لئے وائسرائے سے ملنے کی درخواست کی مگر انہوں نے
ملاقات سے صاف انکار کر دیا۔ وہ انگلستان سے واپسی کو ایک ہفتہ ہی گزرا تھا
کہ ۴ جنوری ۱۹۳۲ء کو گاندھی جی گرفتار کر لئے گئے۔ دس ماہ کے التواء کے بعد کانگریس
والوں نے پھر دھاوا بول دیا۔ حکومت نے علاوہ متعدد آرڈی نینسوں کے جو پہلے سے
جاری تھے چار جدید آرڈی نینس یعنی میعادی قوانین جاری کر دئے جن کی رو سے تمام قوم
پرست جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے کر ان کے سرمایہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ حکام اور
پولیس کے اختیارات غیر محدود کر دئے گئے۔ اس جنگ کی خصوصیت یہ تھی کہ علاوہ
مارپیٹ اور پٹائی کے، جرمانوں اور ضبطی جائیدادوں کی بھرمار اس قدر ہوئی کہ وہ حکومت
کی ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ بن گئی۔ اس سلسلے میں اس زمانہ کی سختیوں کا دکھانا چونکہ ہمارا
مقصود نہیں اس لئے انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اس سختی کی آگ میں اپریل ۱۹۳۲ء میں باوجود ممانعت کے دہلی میں کانگریس
کا اجلاس چاندنی چوک کے گھنٹہ گھر کے نیچے منعقد ہوا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ صدر
نامزد ہوئے تھے دہلی گیٹ جو ریل میں آرہے تھے گرفتار کر لئے گئے تاہم ۵۰۰ ڈیلیگیٹوں
کی موجودگی میں جلسہ کی کارروائی عمل میں آئی۔

فرقہ وارانہ فیصلہ ۔ گاندھی جی کا فاقہ

اسی ۱۹۳۲ء کے ستمبر میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے بارہ میں مسٹر میکڈانلڈ
وزیر اعظم کا فیصلہ انگلستان سے آیا جس میں غالباً مسٹر چرچل کے مشورے پر
پیش نظر رکھ لیا تھا۔ یہ مشورہ انہوں نے پارلیمنٹ میں اپنی تقریر مورخہ ۲ جون ۱۹۳۲ء
کے دوران میں دیا تھا۔ اس تقریر کے الفاظ یہ تھے:

"وزیر اعظم نے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فیصلہ دیں گے میرے
نزدیک اس میں سخت خطرہ ہے اگر انہوں نے جملہ جماعتوں کو خوش کرنے

ثالثی کی طرف متوجہ ہوئے جس سے نہ ہندو ہی خوش تھے اور نہ مسلمان مگر ہندوؤں کی ناخوشی کی کوئی وجہ نہ ہو سکتی تھی اس لئے کہ پنجاب اور بنگال میں وہ آبادی کے اعتبار سے اور نیز پچھلے آئین کی رُو سے پہلے ہی سے اقلیت میں تھے۔ یہ جدید فرقہ وارانہ فیصلہ انہیں اقلیت سے نکال کر اکثریت میں کس طرح لا سکتا تھا۔ ان کے علاوہ ہندو جو تمام ہندوستان کے صوبوں میں اکثریت میں تھے اور سب سے بڑھ کر خود انہوں نے وزیر اعظم کو حکم یا پنچ بنایا تھا ان پر نہیں اعتبار تھا۔ تاہم انہوں نے فرقہ وارانہ فیصلہ کے خلاف اودھم مچا دی اور نیشنلسٹ پارٹی قائم کر کے کانگریس کے ووٹ توڑ دیئے مگر اس وقت کانگریس نے بڑی مضبوطی سے کام لیا اور جنگ میں فرقہ وارانہ فیصلہ کے بارہ میں غیر جانبدار رہی جس کی وجہ سے ہندو نیشنلسٹ پارٹی کانگریس کی مخالفت پر تل گئی۔ ہندو نیشنلسٹ پارٹی کی مخالفت سے مسلمان ڈرے کہ کہیں ان کی بہت سی نشستیں کم نہ کر دی جائیں اور ہندوؤں کو دے دی جائیں اس لئے انہوں نے اپنی مخالفت میں جلسے کرنے شروع کئے۔ اس وقت مسلم لیگ میں صدارت کے بارہ میں نہایت بڑے جھگڑے پیدا ہو گئے تھے اور عارضی طور پر میاں عبد العزیز بیرسٹر ایٹ لا پشاور کو صدر مقرر کر دیا گیا تھا مگر انہوں نے پھر اسے چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ ان کی کوشش سے کلکتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس قرار پایا تھا مگر وہاں کے لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے ۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو پولیس کی حفاظت میں ہوڑہ میں اجلاس ہوا۔ مسٹر عبد العزیز نے اپنے خطبہ میں کہا کہ فرقہ وارانہ فیصلہ ثالثی منظور کر لیا جائے ایک تجویز یہ پاس ہوئی کہ گو یہ فرقہ وارانہ فیصلہ کی رُو سے مسلمانوں کو مرکز میں ثلث نہیں ملا[1] اور بنگال میں نشستیں کم ہیں تاہم ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور نیز ہندو مہاسبھا کے اس فیصلہ کے خلاف کہ فرقہ وارانہ فیصلہ

---

[1] اس فیصلہ کی رُو سے مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ۲۵۰ نشستوں میں ۸۲ یعنی ۱/۳ سے کم ملی تھیں۔

اتفاق سے ایک قرارداد پاس کی گئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا جلسہ باضابطہ نہیں سمجھا گیا تھا۔ اس لئے اگلے مہینے میں ۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو نئی دہلی میں مسلم لیگ کا تیسواں جلسہ بصدارت خان بہادر حافظ ہدایت حسین منعقد ہوا۔ جس میں قرار پایا کہ فرقہ وارانہ فیصلہ قبول کیا جائے اور ترمیموں سے محفوظ رکھے جائیں۔ جدید آئین میں مسلمانوں کے حقوق کی تضمین کر دی جائے اور ملازمتوں میں ان کا حصہ معین کر دیا جائے مگر اس وقت تک میاں عبدالعزیز نے مسلم لیگ کی صدارت نہ چھوڑی تھی۔ اس کے بعد ۴ مارچ ۱۹۳۳ء کو پھر ایک جلسہ بصدارت خان بہادر حافظ ہدایت حسین نئی دہلی میں منعقد ہوا جس میں میاں عبدالعزیز نے صدارت چھوڑ دی اور مسٹر جناح مستقل صدر اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین سکریٹری منتخب ہوئے۔

تیسری گول میز کانفرنس فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق حالات کے بعد اب گول میز کانفرنس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جس کا تیسرا اجلاس ۱۹۳۲ء میں لندن میں منعقد ہوا تھا۔ اس سے اعتدال پسند لوگ مثلاً مسٹر سری نواس شاستری وغیرہ بھی محض اس لئے خارج کئے گئے کہ پچھلے اجلاسوں میں ان کا طرز عمل پسندیدہ نہ سمجھا گیا تھا۔ اس کے اگلے سال مارچ ۱۹۳۳ء میں حکومت کی طرف سے "قرطاس ابیض" شائع ہوا جو ہندوستان کی کسی جماعت کو بھی پسند نہ آیا۔ تب یہ کاغذات پارلیمنٹ کے ہر دو ایوانوں کی "جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی" کے سپرد کر دیا گیا مگر اس نے بجائے کسی قسم کی بہتر تبدیلی کرنے کے یہ غضب کیا کہ مرکزی اسمبلی کی ممبری کے لئے بالواسطہ انتخاب کے لئے سفارش کی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مرکزی اسمبلی کے لئے اس وقت تک براہ راست ووٹر ممبروں کا انتخاب کرتے آئے تھے مگر اس کمیٹی نے یہ تجویز کیا کہ ووٹروں کی بجائے مختلف صوبوں کے ممبران اسمبلی مرکزی اسمبلی کے لئے ممبر منتخب کیا کریں۔

اور جمعیۃ العلماء کے خاص خاص رکن شامل تھے اُن میں یہ بحث پیش آئی کہ جو لوگ
بنا مسلک "کامل آزادی" رکھتے ہیں وہ مسلم لیگ کے ممبر کس طرح بن جائیں۔ اس پر مسٹر
جناح نے کہا کہ جو لوگ آگے ہیں اُن کا پیچھے والوں کے ساتھ شامل ہونا کوئی قابلِ
اعتراض امر نہیں ہے بالآخر قرار پایا کہ جب سے مسلم لیگ نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ
الیکشن کی غرض سے قائم کیا ہے جس میں تمام مسلم جماعتیں شریک ہوں۔ اس کے بعد
اپریل ۱۹۳۶ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس بصدارت سر سید وزیر حسن منعقد ہوا جس
میں صدر اجلاس نے اپنے خطبہ میں اس امر کو واضح کر دیا کہ کانگریس کے ذریعہ اہلِ ہند کا قدم
حکومت کی طرف نہیں بڑھا بلکہ جدید آئین میں گورنر کے اختیارات پہلے سے زیادہ ہو
گئے اور مسلم لیگ کے ذریعہ مسلمانوں کو اُن کے واجبی حقوق ملے اس لئے ضرورت
کانگریس اور مسلم لیگ کو ملکر ملک کی غلامی سے ... حکومت خود اختیاری کی
کے حصول، جابرانہ قوانین کی منسوخی، تحریر و تقریر اور اخبارات کی آزادی ...... کاشتکاروں
اور مزدوروں کی ..... مالی حالت کی بہتری اور ابتدائی تعلیم کے اجراء کے لئے ایک متحدہ
پروگرام بنا کر اس پر یکجائی عمل کریں۔

اس اجلاس میں مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماء کی تحریک پر مسٹر جناح کو
کامل اختیار دیا گیا کہ وہ پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر نامزد کریں اس پارلیمنٹری بورڈ کا جو مینی فیسٹو
شائع کیا گیا اس میں صاف الفاظ میں لکھا گیا:

(۱) تمام جابرانہ قوانین منسوخ کرائے جائیں گے۔ ملک کی اقتصادی لوٹ
کھسوٹ کو روکا جائے گا۔ ملک کے بیکار اخراجات کو گھٹایا جائے گا۔ فوج
کے اخراجات گھٹا کر اسے قومی بنایا جائے گا۔ صنعت و حرفت کو ترقی
دی جائے گی۔ سکہ و شرح تبادلہ کا خیال رکھا جائے گا۔ زرعی قرضوں کے
بار کو ہلکا کیا جائے گا۔ ابتدائی تعلیم کو مفت کیا جائے گا۔ مسلمانوں کے

کہ ہم خیال مسلمانوں کو اپنی وزارتوں میں لے لیا۔ اور مسلم لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے
کسی کو نہیں لیا۔ اس طرح صوبہ سرحد میں کانگریس نے ایک غیر کانگریسی جماعت کے ساتھ
اتحاد عمل کر کے وزارت قائم کر لی۔ ان واقعات نے بالکل ذاتی تنازعہ کی شکل اختیار کر
لی اور مسلم لیگ کی توجہ تمام ملکی امور سے ہٹ کر وزارتوں کے حصول میں مبذول اور
مصروف ہو گئی۔

بہرحال اس قسم کی کشمکش میں مسلم لیگ کا پچیسواں سالانہ اجلاس مسٹر محمد علی جناح
مستقل صدر کے زیر صدارت ۱۵-۱۶-۱۷-۱۸ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو بمقام لکھنؤ منعقد ہوا۔ اس
اجلاس میں مسلم لیگ کی ۳۰ سالہ زندگی میں سب سے زیادہ پرزور تحریک عمل تیار کی گئی جس
کے ذریعہ عوام الناس کو ابھارا جائے۔ غنیمت یہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ الزام
دینا کہ مسلم لیگ عوام الناس کی ضروریات سے غافل ہے غریب مسلمانوں کے لئے غیر
ثابت ہوا۔ انہیں [illegible] مسلم لیگ نے [illegible] اور مسلم لیگ
نے آزادی [illegible] مسلمانوں میں کوئی سیاسی جماعت ایسی نہ رہی جس نے
اپنا مقصد "کامل آزادی" قرار دیا ہو۔ اس بارے میں صرف مسلم لیگ پیچھے تھی۔ اب اس
اجلاس میں لیگ نے مشہور آزادی کی تجویز پاس کر دی جس کے الفاظ یہ ہیں:

"وفاقی حکومت کی شکل میں پوری آزادی حاصل کی جائے جس کے
آئین میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق محفوظ ہوں۔"

کامل آزادی کی یہ مشہور قرارداد مسلم لیگ نے جمعیۃ العلماء اور خلافت کمیٹی کے
بارہ سال بعد اور کانگریس کے دس سال بعد پاس کی۔

مسلم لیگ اور کانگریس میں انتخابات کی کشمکش

مسلم لیگ کے اس اجلاس میں بڑے
جوش و خروش کے ساتھ یہ اعلان کیا گیا کہ آئندہ ضمنی انتخابات اسمبلی میں لیگ

ہے نہ مسلم لیگ کا کوئی مقصد بجز کانگریس کی مخالفت کے نہیں ہے۔ اس اجلاس میں
جو تجاویز پاس ہوئیں اُن کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ مسلمانوں پر جو مظالم بہار اور صوبہ متحدہ و یو پی میں ہوئے اُن کے متعلق
ڈسٹرکٹ کمیشن کے لئے مجلس عاملہ کو اختیار دیا جائے۔

۲۔ حکومت برطانیہ کو تنبیہ کیا جائے کہ وہ فلسطین میں مسلمانان عالم کے مطالبات
پورے نہ کرے گی تو مسلم لیگ ہر ممکن تدبیر کو جائز سمجھ کر کسی قربانی سے دریغ
نہ کرے گی۔

۳۔ عورتوں میں مسلم لیگ کا کام کرنے کے لئے مسلم لیگ خواتین کی ایک سب کمیٹی
مقرر کی جائے۔

۴۔ کانگریس اور دوسری ہندو انجمنیں ریاستوں میں فسادات کرنے سے باز نہ آئیں تو
مسلم لیگ مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے مناسب کارروائی
کرنے پر مجبور ہوگی۔

۵۔ وفاق ہند کی اسکیم قطعاً منظور نہیں ہے اس لئے جناب صدر کو اختیار دیا جائے
کہ وہ اس کی جگہ ایسی اسکیم بنائیں جس میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے مفاد کی
حفاظت ہو۔

۶۔ گورنمنٹ ہند سے مطالبہ کیا جائے کہ ہر قسم کے محکموں میں مسلمانوں کا جو تناسب
ہے اس کا مقررہ تعداد ہو جائے۔

۷۔ بلوچستان کو مکمل صوبائی حیثیت دی جائے کہ اسے دوسرے صوبوں کے مساوی
درجہ دیا جائے۔

۸۔ حکومت برطانیہ کو آگاہ کیا جائے کہ وہ اپنی سرحدی پالیسی میں حکومت خود اختیاری
کے اصول مسلمہ کو بنیاد قرار دے کر اس پر نظر ثانی کرے۔

۹۔ مسلمانوں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ تقریبات اور شادیوں میں سادگی اختیار کریں، دنیاوی رسوم چھوڑ دیں اور ہر قسم کا اسراف ترک کر دیں۔

اس اجلاس کے بعد مسلم لیگ نے حکومت سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے جو مسلمانوں پر کانگریس کے مظالم کی تحقیقات کرے۔ مگر اس پر کوئی توجہ نہ کی گئی بلکہ بعض گورنروں نے کہہ دیا کہ ان کے صوبوں میں کوئی مظالم نہیں ہوئے۔ تاہم کانگریس کے خلاف مسلم لیگ کا پروپیگنڈا جاری رہا۔ یہاں تک کہ یورپ میں جنگ چھڑ جانے پر حکومت سے اختلاف کی بنا پر کانگریس نے وزارتیں چھوڑ دیں۔ تب مسٹر جناح کے حکم سے مسلم لیگ نے مختلف شہروں میں یوم نجات منا کر اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ کانگریس کی حکومت ختم ہو گئی۔

۱۹۴۰ء کا اجلاس مسلم لیگ

مسلم لیگ کا ستائیسواں اجلاس ۲۲، ۲۳، ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسٹر محمد علی جناح کی زیر صدارت بمقام لاہور منعقد ہوا۔ مسٹر جناح تیسری بار سالانہ اجلاس کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ اس سال کے خطبۂ صدارت میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ہندو مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں، اس لئے اس ملک کو دو جداگانہ حصوں میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ ایک حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور دوسرے حصہ میں ہندوؤں کی اکثریت ہو۔ یہ دونوں ریاستیں بالکل خود مختار، ایک دوسرے سے غیر متعلق ہوں اور ہندوستان میں کوئی وفاقی اور مرکزی حکومت نہ ہو۔ اسی مضمون کا ایک رزولیوشن اجلاس میں پیش ہو کر پاس ہوا۔ دوسرا رزولیوشن انگریزوں کے فلسطین پر قبضہ کے خلاف تھا۔ تیسرا رزولیوشن اس مضمون کا تھا کہ ۱۹ مارچ کو جو مڈبھیڑ خاکساروں اور پولیس کے درمیان ہوئی جس میں کچھ خاکسار مارے گئے اس پر افسوس کا اظہار کر کے گورنمنٹ سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنے حکم کو جس کی رو سے خاکسار جماعت خلاف قانون قرار دی گئی ہے منسوخ کر دے۔

سپہ سالار چیانگ کائی شیک اور اُن کی بیگم صاحبہ ہندوستانیوں کی ہمدردی حاصل کرنے
ہندوستان آئی تھیں۔ اسی زمانہ میں راجہ گوپال اچاری نے ورکنگ کمیٹی کانگریس سے یہ مسئلہ
اٹھایا کہ جب کہ جاپان حملہ کر رہا ہے تو کانگریس کو چاہیئے کہ مسٹر جناح کا پاکستان کا مطالبہ
تسلیم کر کے اُن سے مل کر حکومتِ ہند کا مطالبہ کرے

راجہ جی نے نامنظور ہونے پر کانگریس کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا اور تمام ملک میں
اس مسئلہ کی تبلیغ کی۔

سر اسٹیفورڈ کرپس کی آمد

ونسٹن چرچل مسٹر چرچل نے وزیر اعظم انگلستان ہوا
کو سمجھوتہ کے لئے کچھ تجاویز رکھی تھیں جن کا
کوئی جواب نہ ملا تھا آخر جب رنگون چھن گیا تو اس کے چار دن بعد ۱۱ مارچ ۱۹۴۲ء
کو وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ سر اسٹیفورڈ کرپس ہندوستان سے گفتگو کرنے آئیں گے چنانچہ
۲۳ مارچ کو وہ ہندوستان دہلی آ پہنچے اور تجاویز اور لیڈروں سے گفتگو کی۔
۲۹ مارچ کو انہوں نے تجاویز شائع کر دیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ایک ہندوستانی یونین قائم کی جائے جو ڈومینین اسٹیٹس
کے پورے اختیارات حاصل ہو اُسے دولتِ متحدہ سے تعلقات منقطع
کر لینے کا حق ہوگا اگر کوئی صوبہ نئے آئین میں شامل ہونا نہ چاہے تو اُسے
اس کا اختیار ہوگا۔ جنگ ختم ہونے پر ہندوستانی خود اپنا آئین بنائیں
گے اور ریاستیں اس میں شامل ہوں گی مگر دورانِ جنگ میں پورے اختیارات
ہندوستانی ممبران کونسل کو دیئے جائیں گے۔

مہاتما گاندھی نے اس اعلان کی نسبت کہا کہ:

یہ ایک ایسا چیک ہے جو دیوالیہ ہونے والے بینک کے نام
بعد کی تاریخ ڈال کر دیا گیا ہو

اُن کے اکھنڈ ہندوستان کو منظور کر کے انہیں تمام ملک پر حکومت کرنے کا موقعہ دے دیں جس قسم کی آزادی وہ مانگتے ہیں اُس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان آزاد ہو اور مسلمان غلام ہیں۔"

اجلاس میں جو رزولیوشن پاس ہوئے اُن کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ ایک "جماعتِ عمل" ایسی بنائی جائے جس کے لئے صاحبِ صدر پانچ ممبر نامزد کریں جو مسلمانانِ ہند کی تنظیم کریں، آل انڈیا فیڈریشن کو بننے سے روکیں اور مسلمانوں کو حصول پاکستان کی کشاکش کے لئے تیار کریں۔ صاحبِ صدر نے حسب ذیل اصحاب کو نامزد کیا۔ نواب اسمٰعیل خاں، جی۔ ایم سیّد، حاجی ستار اسحاق سیٹھ، نواب افتخار حسین، قاضی محمد عیسٰے، نوابزادہ لیاقت علی خاں کنوینر۔

۲۔ دراں حالیکہ مسلم لیگ کی حکومت، پاکستان کے تمام صوبوں میں قائم ہو گئی ہے یہ اجلاس صاحبِ صدر کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ایک ایسی کمیٹی کا تقرر کریں جو پاکستانی علاقوں کی اقتصادی، صنعتی و تعلیمی، زرعی ترقی اور روپیہ کے کاروبار کو اپنے اختیار میں لانے کے لئے ایک پنج سالہ پروگرام بنائے، اور اپنی رپورٹ جون ۱۹۴۳ء تک پیش کر دے۔

۳۔ جو علاقے مثل لیبیا، طرابلس کے اٹلی کے قبضہ سے نکلے ہیں۔ انہیں اتحادی طاقتیں آزاد کر دیں اسی طرح فلسطین، شام وغیرہ کو آزادی دی جائے اور اتحادی طاقتیں، فرانس کو مجبور کریں کہ وہ مراکش، الجیریا اور تیونس کو آزاد کر دے۔

۴۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں ضروریاتِ زندگی کی فراہمی اور کنٹرول کا انتظام کریں۔

اضلاع صوبہ کے کناروں پر ہوں گے نہیں اختیار ہو گا کہ جس صوبہ میں چاہیں وہ شریک ہوں۔

۳۔ جملہ فریقوں کو اختیار ہو گا کہ رائے عامہ لئے جانے سے قبل پراپیگنڈا کر لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

۴۔ علیحدہ ہونے کی صورت میں باہمی معاہدہ سے طے کیا جائے گا کہ فوج، تجارت، رسل رسائل اور دیگر ضروری امور کی حفاظت کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں گے۔

۵۔ ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں منتقل ہونے کی کامل آزادی ہو گی۔

۶۔ اِن شرائط کی پابندی صرف اس وقت کی جائے گی جب کہ برطانیہ حکومتِ ہند کی پوری ذمہ داری ہندوستانیوں کو منتقل کر دے۔

بالآخر، بہرحال کی کوشش سے مندرجہ بالا فارمولا پر مسٹر جناح اور مسٹر گاندھی کی گفتگو بمبئی میں قائدِ اعظم کے مکان پر ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء سے شروع ہو کر ۲۷ ستمبر تک جاری رہی اور افسوس یہ کہ بے نتیجہ رہی۔ اس کے اختتام پر جو مشترک بیان شائع ہوا اس میں تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ البتہ جو بیانات دونوں صاحبان نے جدا جدا دیئے اُن کا خلاصہ یہ ہے:

مسٹر جناح کے سوال پر مسٹر گاندھی نے کہا کہ وہ اس وقت ذاتی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں، کسی جماعت کے نمائندے نہیں ہیں۔ مسٹر جناح نے ہندوستان میں دو قوموں کے مسئلہ کو جب پیش کیا تو مسٹر گاندھی نے اُسے منظور نہیں کیا۔ اور نہ اس امر کو منظور کیا کہ تنہا مسلم لیگ تمام مسلمانانِ ہند کی نمائندہ ہے۔ مسٹر گاندھی نے کہا کہ قرارداد لاہور میشن کے مطابق الفاظ یہ ہیں کہ صوبہ سرحدی اور شرقی ہند کے جن رقبوں میں مسلمانوں کی

کانگریس کی مدد پر ہے اور یہی بات تمام مسلمانوں پر ہے اس لئے یہ دعوےٰ نہیں
کیا جا سکتا کہ مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی نمائندہ ہے۔ مسلمانوں کا ایک بہت
بڑا طبقہ ایسا ہے جسے لیگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ویول کانفرنس کی ناکامی پر اخبار البشیر اٹاوہ کی رائے

اس کانفرنس کی ناکامی پر کوئی
اخبار ایسا نہیں جس نے

اظہار رائے نہ کیا ہو بلکہ بیرونی ممالک کے اخبارات اس بحث میں شریک تھے۔ اس
بارہ میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے خان بہادر مولوی محمد بشیر الدین صاحب
ایڈیٹر البشیر نے جو اظہار رائے کیا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے:

"ہمارے نزدیک لارڈ ویول نے جو بنیادی غلطی کی وہ یہ تھی کہ انہوں نے
دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو اور مسلمانوں کا
قائد اعظم مسٹر جناح کو تسلیم کر کے صرف مسٹر جناح کو یا دوسرے لیگی لیڈروں کو کانفرنس
کی شرکت کی دعوت دی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ دو کروڑ مسلمان مسلم لیگ اور
مسٹر جناح کے خلاف ہیں۔ چنانچہ کانفرنس کے مباحثہ کے دوران میں
وائسرائے نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت
نہیں ہے۔ اگر وائسرائے دوسری مسلم جماعتوں کو کانفرنس میں مدعو کرتے
تو ہمارا خیال ہے کہ باوجود مسٹر جناح کی ضد کے بھی کانفرنس اس قدر
ناکامیاب نہ ہوتی۔

دوسری غلطی لارڈ ویول نے یہ کی کہ انہوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ تمام
پارٹیاں ممبروں کے نام پیش کریں گی اور وائسرائے ان میں سے ان ممبروں
کا انتخاب کریں گے جس پارٹی کا تعلق ہوگا۔ یا وہ تمام پارٹیوں کی فہرست
میں سے اپنی پسند کے نام منتخب کریں گے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ

سے جنھیں سیاسیات میں حصہ لینے کی ممانعت کر دی گئی تھی مسلمانوں کی مشہور جماعت
مسلم لیگ قائم ہوئی۔ اُس وقت بقول سر سید رضا علی کے انگلستان میں کیا
خوب بغلیں بجائی گئیں کہ مسلمانوں کی ایک مشہور سیاسی جماعت قائم ہو جانے سے
اب ہندوستان میں سلامتی نہ رہے گی۔ مگر ہندو مسلمانوں میں مستقل جدائی پیدا کرنے
والی چیز اُس زمانہ میں دی گئی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق عطا کیا گیا۔
جس سے اقلیت کے صوبوں کے مسلم ووٹروں کا کوئی دباؤ ہندو ممبروں پر نہ رہا۔ اور
نتیجتاً مسلمان بے دست و پا ہو گئے۔

اسی زمانہ میں ہندوؤں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہندو مہاسبھا قائم ہوئی
یہ مرکزی کانگریس کے ایما اور مشورہ سے قائم کی گئی خود ہندو مہاسبھا جانتے ہوں گے
اُس کے تاریخی حالات کی تفتیش کرنا ہمارے حدود سے باہر ہے۔

۱۹۱۳ء میں نواب وقار الملک و سر آرچبولڈ میں بد مزگی ہوئی جس کی تفصیل باب
پنجم کی فصل دوم میں دی جا چکی ہے۔ اس اختلاف کے خمیازہ میں حکومت کے ایما
سے مسلم لیگ علی گڑھ سے خارج البلد ہو کر لکھنؤ پہنچ گئی تب وہ علی گڑھ کالج کے
انگریز پرنسپل کے چنگل سے نکلی اور اس طرح پچیس سال کے تشتت دور کا خاتمہ
ہوا۔ مسلم لیگ کے لکھنؤ کی کھلی ہوا میں پہنچنے کے بعد اسلامی ممالک میں لڑائیاں چھڑ
جانے اور کانپور کی مسجد مچھلی بازار کے سلسلے میں بلوہ ہونے اور مسلم یونیورسٹی کے
قیام کی تجویز نامنظور ہو جانے اور جنگ عظیم شروع ہو جانے سے مسلم لیگ کا قدم
مسلسل آگے بڑھتا گیا اور وہ سات سال تک کانگریس کے دوش بدوش چلتی رہی
یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء میں ملک میں تحریک ترک موالات اور سول نافرمانی جاری ہونے
سے مسلم لیگ کا قدم کسی قدر پیچھے ہٹنا شروع ہوا۔ اُس وقت سے مسلم لیگ کا مسلک
وہی ہے جو اس کے سنگِ اوّلین پر کندہ کیا گیا تھا اور جو بقول مولانا شبلی یہ

اس کے بعد علامہ نے دورانِ ملازمت ہی میں اپنے مشن کا عملی پروگرام تیار کیا جو "اشارات" کے نام سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ اس سے اگلے سال موصوف نے ملازمت سے دستکش ہو کر اپنا عملی کام شروع کر دیا اور بطور اصول کے یہ قرار دیا کہ ہمیں مذہبی اور سیاسی بحثیں نہ کرنی چاہئیں اور جو ہم کو برا کہے اسے کچھ نہ کہیں مگر عملاً یہ کیا کہ کانگریس، خلافت، احرار اور سرخ پوشوں کی مذمت اور انگریزوں کی توصیف کرتے رہے۔

علامہ مشرقی کے مسلک میں تبدیلی

اگر صوبوں میں ہندوستانیوں کی حکومتیں قائم ہونے پر جب علامہ مشرقی شیعہ سنیوں کے درمیان مدحِ صحابہ کے قضیہ کے سلسلہ میں الجھ گئے اور خاکساروں اور حکومت میں جھگڑا ہوا اور شہر میں بدامنی ہوئی تو کانگریس حکومت کے ساتھ علامہ مشرقی کی ٹکر ہوئی جس پر علامہ موصوف گرفتار ہوئے اور معافی مانگ لینے پر وہ قصہ ختم ہو گیا مگر وہاں سے علامہ موصوف نے حکومت کی سول نافرمانی کا سبق سیکھ لیا اور جس کا استعمال پنجاب میں سر سکندر حیات خان وزیر اعظم کی حکومت کے خلاف ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں کیا جب کہ تیس خاکساروں کے قریب پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہوئے اور علامہ مشرقی گورنمنٹ ہند کے حکم سے جیل بھیجے گئے اور پھر مدراس میں نظر بند رہے۔

انجام کار علامہ موصوف کئی سال بعد رہا ہوئے۔ اور رہا ہو کر ۹ جنوری ۱۹۴۳ء کو بادشاہی مسجد میں فرمایا:

> "ایسے نازک وقت پر جس میں ہندوستان گر رہا ہے ہندوستان کو فرقہ وارانہ اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔"

اس تقریر سے ظاہر ہے کہ مسلسل شکست اور مصائب نے علامہ موصوف

فصل دوم

خلافت کمیٹی

خلافت کمیٹی کا قیام سلطنت ترکی، جب جرمنوں کی طرف سے اتحادیوں کے خلاف جن میں برطانیہ بھی شامل تھا، جنگ عظیم میں شریک ہوگئی تو اُس وقت مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو اپنی تقریر میں کہا:

"ہم اس لئے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ترکی کو اُس کے دار الحکومت سے محروم کر دیں یا اُسے ایشیائے کوچک اور تھریس کی زرخیز زمینوں سے محروم کر دیں۔ ہم سلطنت ترکی کے قیام و بقا کو اُس کے وطن میں اور اُس کے دار السلطنت کو چیلنج نہیں کرتے۔"

ان وعدوں کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کی بھرتی فوج میں کی گئی۔ ۱۹۱۸ء میں ترکوں کو شکست ہوگئی اور ۳۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو ترکوں نے التوائے جنگ کے معاہدہ پر دستخط کر دیئے مگر انگریزوں نے خود موصل پر پیش قدمی شروع کر دی اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور مسٹر ولسن کے اصول تسلیم کرنے کے باوجود سلطنت ترکی کو اتحادیوں نے تقسیم کر کے اس کا نام مرد بیمار رکھا۔ اس سے دنیائے اسلام میں ہلچل ہوگئی اور اس کے اثرات ہندوستان میں بھی پہنچے اور جگہ جگہ مسلمانوں کے جلسے ہونے لگے جن میں خاص جلسے حسب ذیل تھے:

۱۔ ۱۷؍ جنوری ۱۹۱۹ء کو مدراس میں بصدارت سیٹھ یعقوب حسن۔

کا اثر یہ ہوا کہ ہجرت کی تحریک میں اور زیادہ ترقی ہوئی۔

یکم اگست ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی نے ایک عام ہڑتال کی ترک موالات کے لیڈر مہاتما گاندھی قرار پائے جنہوں نے اپنے تمغے حکومت کو واپس کر دیئے۔

ہندوستان میں تو ترکی سلطنت کو بچانے کے لئے ہندو مسلمان مل کر ہیجان برپا کر رہے تھے مگر سلطان وحیدالدین نے سیورے کانفرنس ۱۰ اگست کا فیصلہ منظور کر لیا جس کی رو سے تھریس کا بڑا حصہ اور سمرنا یونان کو دے دیئے گئے اور بندرگاہیں اور استنبول اتحادیوں کو دے کر آرمینیا کے علاقہ کو دے کر دیا گیا۔ عرب ولایات، ترکی، حجاز اور ہوائی طاقتیں اتحادیوں کو دے کر ترکی کے لئے صرف پندرہ ہزار فوج رکھنے کا حق باقی رکھا گیا۔ مگر انگورہ کی قومی حکومت اس فیصلہ کو کس طرح مان سکتی تھی۔ اس نے یونانیوں کے زبردست فوجی حملے کا زبردست مقابلہ کر کے دریائے سکریا پر انہیں پوری شکست دی۔ اس طرح یونانی فوج کی کمر توڑ دی۔

ادھر ہندوستان میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ۲۶ جنوری ۱۹۲۱ء کو بمقام ناگپور بصدارت مولانا عبدالماجد بدایونی منعقد ہوا۔ کانگریس و مسلم لیگ کے اجلاس بھی وہیں ہونے تھے۔ سب سے پہلی تحریک پنڈت ہر بھجرت چودھری نے پیش کی جس کا منشا یہ تھا کہ جب تک خلافت کا مسئلہ طے نہ ہو صلح کی شرائط کی مخالفت کی جائے اور اپنی تقریر میں بیان کیا کہ خلافت کے مسئلہ میں ہندو برابر ساتھ رہیں گے۔ ڈاکٹر رحیم قدرت اللہ نے اس تجویز کی تائید کی جو پاس ہوئی۔

پھر اسی سنہ کے آخر میں ۲۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کو خلافت کانفرنس کا اجلاس بمقام احمد آباد بصدارت مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں منعقد ہوا۔ وہیں پر مسلم لیگ و کانگریس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ حکومت نے اس وقت تک نہ ترکی کا مسئلہ طے کیا

تھی اور یہ پنجاب کے مظالم کی تلافی کی تھی ہیں۔ لئے مسئلہ کو ختم کرنے اور سوال ناقرار جاری کرنے کی تجاویز پاس کی گئیں تھیں۔ جیسے کہ "کامل آزادی" کی تجویز پاس کی گئی۔ مگر اس اعتراض پر کہ توحد کے خلاف ہے یہ تجویز مجلس مضامین میں دو تہائی رایوں سے کم پر پاس ہوئی تھی۔ صاحب صدر نے ناجائز قرار دے دی اور اس طرح یہ تجویز خارج کر دی گئی۔

ترکوں کی کامیابی

مگر اب وقت آیا کہ ترکی نے اپنا مسئلہ حل ہونے کا خود انتظام کیا۔ وہ یہ کہ اگست ۱۹۲۲ء میں مصطفےٰ کمال پاشا نے یونانیوں پر حملہ کر کے انہیں اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔ تب یورپ کی طاقتوں نے لوزان کانفرنس طلب کی مگر دقت یہ ہوئی کہ اس کانفرنس نے حکومت استنبول اور حکومت انگورہ دونوں کو شرکت کی دعوت دی۔ اس پر ترکوں کی قومی اسمبلی کا جلسہ کیا گیا اور ۲ نومبر ۱۹۲۲ء کو اس نے یہ طے کر دیا کہ خلافت اور سلطنت کو جدا جدا کر دیا جائے۔ اس فیصلہ پر سلطان وحید الدین نے بھاگ کر انگریزوں کے جہاز پر پناہ لی اور عبدالمجید آفندی خلیفہ منتخب ہوئے۔ لوزان کانفرنس کا افتتاح آخر نومبر ۱۹۲۲ء میں ہوگیا اس میں ترکوں کی شرکت بجائے نیازمندانہ کے فاتحانہ تھی۔

خلافت کانفرنس ۱۹۲۲ء کا اجلاس ۲۷ دسمبر کو منعقد ہوا زیر صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری منعقد ہوا اس کے صدر استقبالیہ دیپ نرائن سنگھ تھے کانگریس و مسلم لیگ کے اجلاس بھی گیا ہی میں ہوئے تھے۔ مگر اس سال سے مسلم لیگ کا ساتھ چھوٹ گیا۔

جب کہ خلافت کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا "لوزان کانفرنس" جو معاملات ترکی کو طے کر رہی تھی اس کے ٹوٹ جانے کی خبر آئی۔ اس پر لوگوں میں بہت جوش ہوا اور اس کے بعد یہ تجاویز پاس ہوئیں کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے کی ترغیب

شریف حسین کے اخراج پر اطمینان ظاہر کیا گیا۔

ہندوؤں سے علیحدگی کا اظہار

۱۹۲۶ء کا اجلاس ۸ و ۹ مئی کو بمقام دہلی بصدارت مولانا سید سلیمان ندوی منعقد ہوا۔ حکیم اجمل خاں صدر استقبالیہ نے فرمایا کہ ہندو مہاسبھا کی طرح خلافت کانفرنس نے کبھی فرقہ وارانہ کاموں میں حصہ نہیں لیا۔ افسوس کہ مالابار اور کوہاٹ کے واقعات سے متاثر ہو کر ہندوؤں نے سنگٹھن اور شدھی کی تحریکات جاری کیں لیکن آرہ اور کٹارپور میں بھی تو ایسے واقعات مسلمانوں کے ساتھ ہوئے تھے مگر انہوں نے انتقامی باتیں نہ کی تھیں۔ مولانا سید سلیمان نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ سنگٹھن کی ہمیں پرواہ نہیں مگر شدھی تو مختلف چیز ہے وہ کشمیر اور بڑودہ کے روپیہ سے جاری ہوئی ہے۔ خلافت والوں نے اپنا رویہ کبھی نہیں بدلا حالانکہ مسلمانوں نے انہیں الزام دیا کہ وہ ہندوؤں سے بیزاری کیوں نہیں ظاہر کرتے۔ عبدالرحمان صاحب دوجانوی نے کہا کہ افسوس ہندو مسلم اتحاد کا جنازہ نکل رہا ہے۔

۱۹۲۶ء میں خلافت کانفرنس کے تین اجلاس ہوئے جن میں سے پہلا جلسہ ۲۶ فروری ۱۹۲۶ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی صدر استقبالیہ تھے۔ اور صدر اجلاس حاجی عبداللہ ہارون ممبر اسمبلی (کراچی) قرار پائے تھے مگر وہ تشریف نہ لا سکے اس لئے ان کا خطبہ صدارت پڑھا گیا اور کوئی رزولیوشن پاس نہ کیا گیا۔

دوسرے روز یہ جلسہ موتمر میں منتقل کر دیا گیا اور اُس کے صدر مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں قرار پائے تھے مگر ان کی غیر حاضری کی وجہ سے ڈاکٹر انصاری نے صدارت کی۔ اُنہوں نے موتمر یعنی تمام دنیا کے مسلمانوں کی کانفرنس کے جو حال میں بنائی گئی تھی اغراض و مقاصد بیان فرمائے جس کا مقصد تمام دنیا کے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا اور انہیں ایک سلسلہ میں منسلک کرنا تھا۔ اُس کی شاخ ہندوستان میں اس غرض

سے قدر کی جاتی تجویز ہوئی کہ جو لوگ خلافت کمیٹی کو سیاسی سمجھتے ہیں وہ بھی اس
ملائی کانفرنس میں شریک ہو سکیں۔ صاحب صدر نے بیان فرمایا کہ:

"بلاشبہ ہم لوگ سب مسلمان ہیں مگر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اوّل و آخر اور ہمیشہ کے لئے ہم ہندوستانی ہیں اور خیال رکھنا چاہیئے کہ فرقہ پرست لیڈر خواہ وہ لالہ جپت رائے و مالوی جی ہوں یا سر عبدالرحیم اور مسٹر جناح ہوں ہندوستان کے دوست نہیں ہیں ہم سب کو فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

خطبہ کے بعد مسٹر شعیب قریشی نے "موتمر" کا مجوزہ آئین پڑھ کر سنایا۔

اس سال کا دوسرا اجلاس ۱۲ راگست کو بصدارت مولانا محمد علی منعقد ہوا۔ جس میں کتاب "رنگیلا رسول" کے فیصلہ کے خلاف ایک تجویز پاس کی گئی اور ہندوؤں کی شرارت کی گئی کہ وہ پانچ سال سے بلوے کر رہے ہیں۔

اسی سال ۱۹۲۷ء کا تیسرا اجلاس ۲۵ دسمبر کو بمقام مدراس بصدارت مولانا محمد شفیع داؤدی منعقد ہوا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد سے خلافت کا اجلاس کانگریس کے ساتھ اب ۱۹۲۷ء میں ہوا۔ صاحب صدر نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ سائمن کمیشن کا مقاطعہ کیا جائے مگر اس بارہ میں جلاس میں کوئی تجویز پاس نہ کی گئی البتہ شاہ افغانستان جو ایشیاٹک لیگ قائم کرنے کے لئے ولایت جا رہے تھے اُن کے لئے کامیابی کی دعا کی گئی اور اس پر اطمینان ظاہر کیا گیا کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان سمجھوتہ کی کوشش کی جا رہی ہے۔

خلافت کانفرنس کا ۱۹۲۸ء کا اجلاس ۲۵ دسمبر کو بصدارت مولانا محمد علی بمقام کلکتہ منعقد ہوا۔ اُسی زمانہ میں کلکتہ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ہو رہے

تھے۔ خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے اجلاس یہاں منعقد ہونے کی وجہ یہ تھی کہ
کانگریس کے اجلاس میں نہرو رپورٹ پیش ہونے والی تھی جس کے بارے میں مختلف
مسلمانوں کی سیاسی جماعتیں مختلف خیال تھیں بلکہ خود خلافت کمیٹی میں اختلاف تھا
مثلاً پنجاب خلافت کمیٹی و [illegible] خلافت کمیٹی نہرو رپورٹ کی تائید میں تھیں۔ برخلاف اس کے
شہر کلکتہ کی خلافت کمیٹی جس کی بابت کہا جاتا تھا کہ نو ساختہ تھی وہ نہرو رپورٹ کے
خلاف تھی۔ ان کمیٹیوں کے اجلاس جدا جدا ہوئے اور مثلاً خلافت کمیٹیوں کا [illegible]
نمایندے منتخب کرنے کے بارے میں ان جلسوں میں بڑا فتنہ ہوا۔ آخرکار سنٹرل
خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں مولانا محمد علی نے اپنے خطبہ صدارت میں شکایت کی
کہ کنونشن یعنی کانگریس کے اس جلسہ میں جس میں نہرو رپورٹ پیش ہوئی ان کو تقریر کرتے
وقت بہت پریشان کیا گیا تھا۔ خطبہ صدارت کے بعد حسب ذیل تجاویز پاس
ہوئیں۔

۱۔ آزادیٔ کامل کی تجدید

۲۔ فیڈرل گورنمنٹ سے اتفاق

اس کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی جماعت نے جو خلافت سے کل وقت
علیحدہ ہو گئی تھی شاہ محمد زبیر کی صدارت میں ایک جلسہ کر کے چند ممبروں کے دستخطوں
سے اپنے جلسہ کی روئیداد شائع کی۔ اس میں نہرو رپورٹ کو [illegible] منظور کیا
گیا۔ مختصر یہ کہ اس سال خلافت کمیٹی میں پورا انتشار ہو گیا۔ اس کے بڑے بڑے کارکن
سے بہت سے لوگ اس سے دست کش ہو کر بدستور کانگریس کے ہی ممبر ہو
گئے۔ اور باقی ماندہ لوگ کوئی صحیح مقصد باقی نہ رہنے سے دونوں طرف ہو کر جس طرف
کی ہوا چلی اسی طرف کو بہتے چلے گئے۔

خلافت کمیٹی اور مسلم کانفرنس کی ہم خیالی

اسی ۱۹۲۹ء کے آخر میں دہلی میں مسلم آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس بصدارت ہز ہائی نس سر آغا خاں منعقد ہوا جس کی بیشتر تنظیم کارکنانِ خلافت کمیٹی یعنی مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کا نمایاں حصہ رہا۔ اس وقت سے اندرونِ ملک کے مسائل میں خلافت کمیٹی، مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کا مسلک ایک ہوگیا۔ اب رہی بیرونِ ملک یعنی اسلامی ممالک کی سیاست اس میں خلافت کمیٹی ترکوں سے اس وقت سے بیزار ہوچکی تھی جب سے کہ اس نے ترکی کی خلافت توڑ دی تھی پھر ۱۹۲۵ء میں ترکوں نے اپنے ملکی قانون میں اہم تبدیلیاں کیں اور ۱۹۲۸ء میں بجائے ترکی حروف کے لیٹن حروف جاری کر دیئے اور انگریزی اخبارات میں ان کے خلاف چرچا کیا گیا کہ انہوں نے مذہب سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے اس لئے خلافت کمیٹی کو ترکی سے روز بروز علیحدگی ہوتی گئی البتہ منصبِ خلافت قائم کرنے کے لئے ۱۹۲۹ء میں خود مولانا محمد علی نے اسلامی ممالک میں دورہ کیا اور مولانا شوکت نے ارادہ کیا کہ ان ممالک کی اصلاح کے لئے چھ ماہ وہاں دورہ کیا کریں گے اور چھ ماہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تنظیم کا کام کیا کریں گے۔

مگر اب خلافت کانفرنس کے سالانہ جلسے قائم ہونے لگے بالآخر ۲۰ مئی ۱۹۳۱ء کو بمبئی میں ایک جلسہ بصدارت مولانا عبدالماجد بدایونی منعقد ہوا۔ خطبۂ صدارت میں کانفرنس دہلی کی پرزور تائید کرتے ہوئے ہندوؤں اور کانگریس، کانگریسی مسلمانوں اور قوم پرست ترکوں کی یکساں مذمت کی گئی اور اسلامی ممالک کی پریشانیوں کا ذمہ دار مصطفیٰ کمال کو قرار دیا جنہوں نے خلافت توڑ کر مسلمانوں کی عزت برباد کردی تھی۔ اس اجلاس میں یہ اہم تجویز پاس ہوئی:

"یہ کانفرنس [illegible] کو [illegible] کرتی ہے کہ اگر [illegible] نے آل انڈیا

مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی بتاریخ ۵ و ۶ اپریل زیرِ صدارت مولانا شوکت علی
کے مطالبات کو منظور نہ کیا تو مسلمانانِ ہند کسی آئین کو منظور نہ کریں گے بالخصوص
گول میز کانفرنس کے مسلمان ممبروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ انہیں
مطالبات کی منظوری کی امید نہ ہو تو گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہوں ۔

پھر ۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء کو ایک جلسہ اجمیر شریف میں بصدارت شیخ عبدالمجید سندھی
اور ۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کو بمبئی میں بصدارت مولانا سید مرتضےٰ بہادر ممبر اسمبلی منعقد ہوا۔ یہ
دونوں اجلاس اُس زمانے میں ہوئے جب کہ مولانا شوکت علی کی تجویز کے مطابق الہ آباد
میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی جس کا تذکرہ دوسرے موقعہ پر مفصل کیا گیا ہے
اور اس کی کارروائی کی تائید کی گئی اور آخرالذکر جلسہ میں بالخصوص فلسطین میں عربوں پر
زیادتیوں کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ اس کے بعد خلافت کمیٹی کا کوئی اجلاس نہیں ہوا۔

فصل سوم

جمعیۃ العلماء

جمعیۃ العلماء کا قیام اور مقاصد

اس جماعت کی بنیاد اس وقت قائم ہوئی جب کہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کانفرنس کا پہلا جلسہ دہلی میں منعقد ہوا تھا جس میں جشن صلح میں شرکت کے خلاف ایک فتوے مرتب کیا گیا جس پر علماء کرام کے دستخط ہوئے۔ اسی وقت ایک جلسہ مشورہ منعقد کیا گیا جس میں طے ہوا کہ صرف مشترکہ مذہبی و سیاسی امور میں علمائے کرام عامۂ اہل اسلام کی رہنمائی کا فرض ادا کیا کریں اور حاضرین کی باتفاق رائے سے قرار پایا کہ "جمعیۃ العلماء ہند" قائم کی جائے اور اس کا آئندہ اجلاس مسلم لیگ کے ساتھ امرتسر میں منعقد ہو۔ جمعیۃ کے مستقل صدر مفتی کفایت اللہ اور ناظم مولانا احمد سعید قرار پائے۔ امرتسر کے جلسہ کی دعوت مولوی ابو الوفا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا داؤد غزنوی نے دی تھی۔ قیام جمعیۃ کے وجوہ اور مقاصد حسب ذیل اقتباس سے معلوم ہوں گے جو جمعیۃ کی روئیداد سے لئے گئے ہیں:

"۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو جب دہلی میں خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس اس غرض سے منعقد کیا گیا کہ اتحادیوں سے عموماً اور حکومت برطانیہ سے خصوصاً ان وعدوں کے ایفا کا مطالبہ کیا جائے جو مسلمانوں سے جنگ عظیم کے وقت کئے گئے تھے، تو خلافت کے اس جلسہ میں علماء نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ انہیں ایک رابطہ میں منسلک کیا

جائے جن کی اجتماعی قوت کو ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے بالکل منتشر کر
دیا تھا۔ ہندوستان کی سیاست محض چاپلوسی اور خوشامد اور خود غرضی کی
پر محدود ہو چکی تھی گویا کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا سیاست داں وہ شخص
سمجھا جاتا تھا جو حکومت تسلط کا سب سے بڑا وفادار ہوتا تھا یہ وہ وقت
کہ علماء مذہب جو ہمیشہ خوشامد اور چاپلوسی سے متنفر رہے ہیں اور جو ہر زمانہ
جابر بادشاہوں کے مقابلہ میں کلمۂ حق کے عادی رہے ہیں سیاست
سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے نیز ۱۸۵۷ء میں علماء حق کے ساتھ
جو بیجا ظالمانہ سلوک کیا گیا تھا اور جس بے دردی کے ساتھ علماء ہند کو پھانسی اور
جلاوطنی کی وحشیانہ سزائیں دی گئی تھیں اُن کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ
علماء کو مجبوراً گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرنی پڑی لیکن جب مسلمانوں کی سیاست
نے ۱۹۱۹ء میں پلٹا کھایا اور خوشامد و تملق کی پالیسی تبدیل ہوئی تو علماء
امت نے دوبارہ سیاسی میدان عمل میں قدم رکھا اور جمعیۃ علماء ہند
کا قیام کیا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو بمقام امرتسر منعقد ہوا۔ اُس
زمانہ میں امرتسر میں کانگریس، مسلم لیگ، اور خلافت کمیٹی کے اجلاس ہو رہے تھے۔
جمعیۃ العلماء کے اجلاس کے پہلے جلسہ کے صدر مولانا قیام الدین عبد الباری فرنگی محلی
جلسے کے منتظم کفایت اللہ تھے۔ ان جلسوں میں قرار پایا کہ مساجد میں سلطان ترکی کا
خطبہ پڑھا جائے۔ مسائل خلافت کے طے کرنے کے لئے صلح کانفرنس میں لائیڈ
جارج وزیر اعظم کے ساتھ وزیر ہند مسٹر اصفہانی و مسٹر محمد جعفر گزنی اور مسٹر قدوائی کو
جانے کی اجازت دی جائے۔ جمعیۃ کے مقاصد حسب ذیل امور شامل کئے
گئے۔

چونکہ حکومت سے موالات رہتے تھے۔ جمعیۃ العلماء کے کارکن ایک طرف تو مختلف مسلم بلوؤں میں مسلمانوں کی ہر قسم کی امداد کرتے تھے اور دوسری طرف وہ کانگریس کے ساتھ ملک کی ترقی کے کاموں میں اتحاد عمل کر کے اپنی استقامت کا پورا ثبوت دیتے رہتے تھے۔ جب کہ کانگریس کا پریزیڈنٹ مسلمان تھا اور جمعیۃ العلماء میں جو تجویز پاس ہوئی تھیں ان میں ایک طرف بلوؤں میں ہندوؤں کی زیادتی کی شکایت تھی تو دوسری طرف ان کے ساتھ سمجھوتہ کے لئے تجویز پاس کی گئی تھیں۔

چھٹا جلسہ ۱۱ تا ۱۳ جنوری ۱۹۲۶ء بصدارت مولانا سید محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار بمقام مراد آباد منعقد ہوا۔

آزادی کی قرارداد

ساتواں اجلاس ۱۴ تا ۱۶ مارچ ۱۹۲۷ء بصدارت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی بمقام کلکتہ منعقد ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے جمعیۃ العلماء اور کانگریس کا تعلق ڈھیلا ہو چکا تھا مگر باوجود اس کے جمعیۃ العلماء نے آزادی کے لئے حسب ذیل اہم تجویز پاس کی:

"چونکہ برادران وطن کے مخالفانہ طرز عمل سے منافرت کی خلیج وسیع تر ہوتی جاتی ہے اس لئے مسلمان اپنی تنظیم کر کے جب تک کہ ملک کو آزاد کرائیں جتنی جو غیر مسلم جماعتیں اس بارے میں اتحاد کرنا چاہتی ہیں ان کے ساتھ اتحاد عمل کیا جائے اس کے لئے عمل کا طریقہ یہ ہے"

(الف) مسلمان قوم خصوصاً علماء بالخصوص سیاسی امور میں خود شوق پیدا کریں اور تبلیغ کیا کریں۔

(ب) آزادیٔ ہند کے نہ ہونے سے مذہبی، مالی، ملکی جو جو اسباب کو نقصانات خود خوش سے دریافت کریں اور لوگوں کو سمجھائیں دیگر مذہبی امور کی تبلیغ کی طرح اس کو بھی ضروری سمجھیں۔ آزادی اور دیگر حقوق کے مطالبہ پڑے

کی معزز قوموں اور مشاہیر کی شناخت نہایت پرامن طریقہ سے کر کے ہر مسلمان کو زندہ کریں۔

(ج) قومی اخبارات و رسائل کا جو آزادی پر روشنی ڈالتے ہیں مطالعہ کیا کریں اور

(د) مسلمانوں سے افلاس دور کرنے کی کوشش کریں۔

آٹھواں اجلاس ۲ تا ۵ دسمبر ۱۹۲۷ء زیر صدارت مولانا سید انور شاہ بمقام پشاور منعقد ہوا جس میں حسب ذیل تجاویز پاس ہوئیں:

۱۔ حصول آزادی ہند۔

۲۔ شیعوں، سنیوں کے باہمی جھگڑوں پر اظہارِ افسوس۔

۳۔ سائمن کمیشن سے مقاطعہ۔

۴۔ مسٹر جناح کے چودہ نکات کی تائید۔

کانگریس کے ساتھ پھر اشتراک عمل

نواں اجلاس ۳ تا ۶ مئی ۱۹۳۰ء زیر صدارت شاہ معین الدین اجمیری بمقام امروہہ منعقد ہوا۔ اس کی خاص تجاویز یہ ہیں:

۱۔ چونکہ کانگریس نے لاہور میں مکمل آزادی کا اعلان کر دیا اور نہرو رپورٹ کو منسوخ کر دیا اس لئے جمعیۃ العلماء کانگریس سے علیحدہ رہتے ہوئے اس کے ساتھ اشتراک عمل کرے۔

۲۔ سول نافرمانی کا پروگرام بنایا گیا۔

۳۔ ضبط شدہ فتووں کی اشاعت قرار پائی۔

۴۔ ترک مسکرات کیا جائے۔

۵۔ ولایتی مال کا مقاطعہ طے ہوا۔

اور آج علی گڑھ کا ایک تعلیم یافتہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث
کی خدمت میں عقیدت کے پھول پیش کر رہا ہے۔

اجلاس میں جو تجاویز پاس ہوئیں ان میں سے خاص یہ ہیں:

۱۔ مجلس عاملہ منعقدہ ستمبر ۱۹۳۹ء کے اس بیان کی توثیق کی گئی کہ جنگ میں مدد
کرنے کے جواز کی کوئی صورت نہیں جب تک کہ حکومت اپنے وعدوں کو پورا کرکے
ملک کو آزاد نہ کردے۔

۲۔ آزاد مسلم کانفرنس دہلی کی تجاویز کی توثیق کی گئی۔

۳۔ ان لوگوں کی مذمت کی گئی جو مسلم پیشہ ور برادریوں کو ذلیل قرار دے کر مسلمانوں کی وحدت
کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۴۔ تحریک مدح صحابہ کی مدافعت و جواز کی تصدیق کی گئی۔

لاہور کا اجلاس

جمعیۃ العلماء کا تیرھواں اجلاس ۲۰، ۲۱، ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو

بصدارت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی زیر اہتمام مولانا
محمد داؤد صاحب غزنوی اور مولانا احمد علی صاحب ناظم انجمن خدام الدین لاہور
بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا۔ مولانا عبدالقادر قصوری صدر استقبالیہ تھے۔
حاضرین کی تعداد بیس پچیس ہزار کے قریب ہوتی تھی۔ خطبۂ صدارت بڑا معرکۃ الآرا
اور مقبول تھا۔ جلسہ کے آخری دن مولانا ابوالکلام صاحب آزاد صدر کانگریس کی
پُرجوش اور ولولہ انگیز تقریر ہوئی۔ اجلاس میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں:

۱۔ عصری ضروریات اور دنیا کے معاشی تحول انقلابات کے پیش نظر جمعیۃ علماء جدید
پیش آنے والے مسائل کے متعلق ایسے فیصلے مرتب کرائے جن پر عام مسلمانوں
کی زیادہ سے زیادہ جماعت متفق ہو۔

۲۔ مسلمانوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ مختلف فیہ مسائل میں ایک دوسرے کو

۵۔ مسلم مجلس کی اس تمنا کو جو اس نے جمعیۃ العلماء کے ساتھ اشتراکِ عمل کے متعلق ظاہر کیا ہے اس کی منظوری اور اس کی تفصیلات طے کرنے کے لئے ایک ایسے بورڈ کا قیام جس میں کسی وقت بھی ارکان جمعیۃ کی تعداد نصف سے کم نہ ہوگی۔

۶۔ زائرین بیت اللہ اور ادائے حج کے سلسلہ میں حکومت نے جو رکاوٹیں پیدا کی تھیں انہیں دور کرنے کا مطالبہ (۲۲۱) عہدہ داران اور کارکنان مجلس [illegible] کی خدمات کا اعتراف اور شکریہ۔

علماء کرام کا پچیس سال کا کام

علاوہ اس طرزِ عمل کے جو غالباً حکومت نے علماء کرام کے ساتھ اختیار کیا تھا اور جس کی کیفیت مندرجہ بالا صفحات میں جمعیۃ العلماء کی روئیداد سے کر درج کی گئی ہے خود مسلمانوں کی اس جماعت نے بھی علماء کی قوت کو زائل کرنے اور ان کی حیثیت گرانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ اس دوگونہ حملہ سے علماء کی جماعت [illegible] گوشہ نشین ہوگئی تھی۔ نئے ہندوستان کے متعلق یہ سوچنے لگے تھے کہ شاید اس ملک کے علماء کے وجود ہی مسلمانوں کی ترقی میں مزاحم اور سنگ راہ ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی وحیدالدین سلیم نے مسلم لیگ کو فرقہ وارانہ سیاست کے دائرے سے نکال کر ملکی سیاست کے میدان میں لانے کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ پھر مسجد کانپور کے ہنگامہ کے وقت اور جنگ بلقان کے دوران میں علماء کی کثیر تعداد سیاسی میدان میں آگئی اس کے بعد [illegible] کمیٹی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تحریک شروع ہوئی جو خالص سیاسی تھی اور جس کی بناء پر مولانا محمود حسن اپنے رفقاء کار کے ساتھ مالٹا میں نظر بند کئے گئے۔

۲۔ سیاسی قیدیوں و نظر بندیوں کو رہا کرانے کا مطالبہ کیا جائے۔

۳۔ مسکرات کو قطعاً بند کرایا جائے۔

۴۔ کسانوں کے مصائب کو کم کر دیا جائے اور بڑے عہدہ داروں کی تنخواہیں گھٹوائی جائیں۔

۵۔ گورنمنٹ پنجاب کی تشدد آمیز پالیسی پر مذمت کی جائے نیز سیاسی کارکنوں کی رہائی کا مطالبہ کیا جائے جو حال میں گرفتار کئے گئے ہیں۔

۶۔ ممبران مجلس احرار کو ہدایت کی گئی کہ وہ مسلم لیگ میں شامل نہ ہوں اور جو ہیں وہ اُسے چھوڑ دیں۔

۷۔ فلسطین کی تقسیم پر احتجاج کیا گیا اور قرار پایا کہ ۲۷ رمضان کو یوم فلسطین قرار دیا جائے۔

۱۹۳۹ء میں جب جرمنی و اتحادیوں کے درمیان جنگ چھڑی تو تمام ملک میں چرچا ہوا کہ جب تک کہ برطانیہ ہندوستان کو آزادی دینے کا وعدہ نہ کرے اس کے ساتھ اتحاد عمل نہ کیا جائے مگر تمام سیاسی جماعتوں میں سب سے اوّل مجلس احرار نے وسط ستمبر میں مدراس کے جلسہ میں صاف طور پر یہ تجویز پاس کرنے کی جرأت کی کہ موجودہ حالات میں فوجی بھرتی کی مخالفت کی جائے۔ چنانچہ اس وقت سے جماعت احرار کے لیڈر صوبہ پنجاب میں سینکڑوں کی تعداد میں جیلوں میں ہیں نیز اُن کے والنٹیروں کا ایک عظیم الشان اجلاس مولوی علی بہادر خاں کی صدارت میں شروع مارچ ۱۹۴۰ء میں دہلی میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل ریزولیوشن پاس ہوا:

"احرار کی یہ کانفرنس دہلی میں اس قرارداد کا اعادہ کرتی ہے کہ اس کا نصب العین ہندوستان کی کامل آزادی ہے اور اس کا پختہ عقیدہ

سبب کہ آزادی ہی ہندوستانیوں کے مصائب کا علاج ہے اور
اُس کے حصول سے مسلمانانِ ہند کے حقوق کی حفاظت اور ان کی ترقی
ہوگی۔ یہ کانفرنس ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز کو ناقابل
عمل دو قوموں کی باہمی منافرت بڑھانے کا باعث قرار دیتی ہے اور
سمجھتی ہے کہ اُس سے دونوں علاقوں میں جنمیں قدرتی حد بندی نہیں ہے
مستقل جنگ رہا کرے گی جس سے ملک کے امن میں خلل پڑے گا بر خلاف
اس کے صوبوں کی موجودہ تقسیم میں ہندو اکثریت میں مسلمانوں کی حفاظت
اور مسلمانوں کی اکثریت میں ہندو اقلیت کی حفاظت سے تمام ملک کے
لئے ایک متوازن اور مستحکم آئین بن سکے گا جو سب فرقوں کے لئے یکساں
مفید ہوگا۔ مزید برآں اس کانفرنس کی رائے میں وہ دستور قابلِ تسلیم ہوگا
جس کو ہندوستان کے آزاد بالغ نمائندے جمع ہو کر مرتب کریں وہ
خود باہمی رضامندی سے فرقہ وارانہ معاملہ کو طے کر کے اقلیت اور اکثریت
کے مذہبی مسئلہ کو حل کریں۔

پالیسی کی نسبت تجاویز

مجلسِ احرار کے اجلاس سہارنپور منعقدہ ۲۶ اپریل ۱۹۴۲ء میں ملکی و سیاسی موجودہ حالات کے
پیشِ نظر حسب ذیل قرار داد منظور ہوئی:

۱۔ مجلس احرار اسلام کو کسی ایسی تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی جس کی کامیابی
کے لئے لندن کے طواف کی ضرورت یا انگریزی سنگینوں کی احتیاج ہو۔

۲۔ مجلس احرار اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ہندوستان
میں ایک مرکز قائم کیا جائے یا زیادہ اور اس کے صوبوں کی موجودہ تقسیم کو رہنا
رہنے دیا جائے یا اس میں تبدیلی کرنے کی خواہش ہو۔ بہ حالت میں تعلیم یافتہ

عہد و پیمان اور امن آشتی کا ماحول ہی بہترین فیصلہ میں مدد دے سکتا ہے۔

۳۔ مجلس احرار اس منافرت انگیز پراپیگنڈا کو جو کسی طرف سے بھی کیا گیا ہے یا کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے مستقبل یا اکھنڈ بھارت یا پاکستان یا آزاد پنجاب وغیرہ کے قیام کے لئے مہلک سمجھتی ہے۔ اور اس لئے اپنے ہم وطنوں سے درخواست کرتی ہے۔ کہ وہ ملک کی فضا کو مسموم کرنے والی تقریروں، تحریروں اور دیگر پراپیگنڈا سے باز رہیں۔ اور اپنے راستے میں خود کانٹے نہ بوئیں۔

۴۔ مجلس احرار اسلام زمانہ کے موجودہ حالات میں فیصلہ کر چکی ہے کہ اب ملک کو اندرونی فساد کے فرقہ وارانہ یا اقتصادی خطروں سے بچانے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اسی کام پر اپنی پوری توجہ مرکوز کرنی چاہیئے۔ پس جہاں مجلس اس وقت حکومت سے متصادم نہیں ہے۔ وہاں وہ مذہبی یا سیاسی اختلاف کی بنا پر بھی کسی فریق یا جماعت سے تصادم مناسب نہیں سمجھتی۔ اور جہاں وہ ہندو، سکھ یا عیسائی وغیرہ سے تصادم یا فتنہ انگیز اختلاف مناسب نہیں سمجھتی وہاں وہ مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی پیدا کرنا ہرگز ہرگز پسندیدہ تصور نہیں کرتی۔

۵۔ گو مجلس موجودہ وقت میں حکومت برطانیہ سے کوئی معاہدہ کرنا پسند نہیں کرتی نہ اپنی قسمت کو اللہ کے سپرد کرنا زیادہ مناسب سمجھتی ہے۔ پھر بھی وہ ہندوؤں یا مسلمانوں یا مسلم لیگ اور کانگریس کے سمجھوتہ کی راہ میں سنگ گراں بننے کی خواہشمند نہیں ہے۔ اسے ایسے سمجھوتوں سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔ تاہم جو لوگ اس وقت سمجھوتہ کی کوشش کرنا چاہیں۔ وہ اُن کو روکنا بھی پسند نہیں کرتی۔ اس بات میں وہ سمجھوتہ کی جنگ کی کوشش کر کے مسلمانوں میں باہمی انتشار کو ہوا دینا مناسب سمجھتی ہے۔ وہ یہ ختم کر دینا چاہتی ہے کہ جو کوئی سمجھوتہ ہونا ہے وہ بے شک مسلم لیگ سے اور جس کسی جماعت سے

چاہے باتیں کرے، لیکن وہ مجلسِ احرار سے اُمید نہ رکھے کہ وہ ایسے مفسدوں کا
پھنس کر مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی کا دروازہ کھولے گی۔

۶۔ مجلس احرار اسلام واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا نظریہ یہ نہیں ہے کہ کسی جغرافیائی یا نسلی یا لسانی وغیرہ حدود کو قائم کرنا یا برقرار رکھنا مسلمان کا مذہبی یا حقیقی مقصد یا فریضہ ہے، بلکہ ہر حالت میں خدا و رسولؐ کی رہنمائی ہونی چاہئیے۔ دنیا میں نیکی سے رہنا، نیکی سے تعاون کرنا، نیکی کی صورت قائم کرنا اور نیکی کو رواج دینا ہی حقیقتِ انسان کی تمام دینی حکمت و مصلحت ہے۔ مجلس احرار اسلام دنیا کے جس حصے میں بھی ممکن ہو، حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی خواہاں ہے تاکہ دنیا کو دکھایا جا سکے کہ اسلام کے زریں اصولوں پر کاربند ہو کر کس طرح دنیا کے مصائب کا حل کیا جا سکتا ہے، اور دنیا و آخرت میں فلاح کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔

اس ضمن میں مجلس احرار یہ واضح کر دینا بھی مناسب سمجھتی ہے کہ کسی علاقہ میں محض مسلمانوں کی اکثریت یا افراد کے ہاتھوں میں حکومت کا آ جانا حکومتِ الٰہیہ کا مترادف نہیں، بلکہ ایسی شخصی یا جماعتی حکومتوں نے جو اسلام کے نام پر اپنی غرض کی تکمیل کے در پے رہیں، اسلام کے خوشنما نقشہ کو مکدر کیا، اور دنیا کو اسلام سے متنفر ہونے کی گنجائش دی۔ مجلس کسی ایسے تجربہ کو دہرانے کے لئے مسلمانوں کی دین سے بے بہرہ کسی جماعت یا گروہ کے ہاتھ میں حکومت دے کر مطمئن نہیں ہو سکتی، اور وہ مسلمانوں سے پُرزور درخواست کرتی ہے کہ وہ اس بارے میں اپنی ذمہ داریوں کا فوری احساس کریں اور اپنی جماعت سے حکومتِ الٰہیہ کو ذلیل کر کے اسلام کے نام پر لادینیت کے فروغ کا موقعہ نہ دیں، جب تک سب مسلمانوں کو اطاعتِ خدا و رسولؐ پر کاربند ہونے کی تلقین و تاکید کریں۔

دوسری قرارداد جو مجلس مرکزیہ احرار اسلام ہند نے سہارنپور میں ۲۲ اپریل ۱۹۴۲ء کو منظور کی:

"مجلس مرکزیہ احرار اسلام ہند کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ مجلس احرار اسلام کا کوئی ابتدائی ممبر کسی دیگر سیاسی جماعت کا ابتدائی ممبر نہ بنے تاکہ مختلف سیاسی جماعتوں کے اشتراک سے باہمی کشمکش کا سبب پیدا نہ ہو سکے۔"

مجلس احرار کی پالیسی کی توضیح

۱۷ جولائی ۱۹۴۳ء کی رات کو دہلی دروازہ کے عظیم الشان جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے حضرت مولانا اظہر علی صاحب اظہر جنرل سکریٹری مجلس احرار اسلام ہند نے فرمایا کہ:

"سب سے پہلے مجھے اس مشورہ کا ذکر کرنا ہے جو مسلم لیگ سے عقیدت رکھنے والے بعض حضرات نے مجھے دیا ہے کہ اپنی تقریر میں مجھے مسلم لیگ اور اس کے راہنماؤں کے خلاف کچھ نہ کہنا چاہئے۔ میں ان حضرات کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ایسا مشورہ دینے کی زحمت گوارا فرمائی مگر میں ان سے اور ان کے دوستوں سے عرض کروں گا کہ نصیحت اپنے گھر سے شروع کرنی چاہیئے۔ جب مسلم لیگ کے کارکنوں نے اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کے بارے میں سخت الفاظ اور سنگین سے سنگین الزام لگائے تو سب لوگ خوش ہوئے اور انہوں نے سمجھا کہ مسلم لیگ کی فتح ہو رہی ہے لیکن اب جو ہماری طرف سے جواب ہونے لگا ہے تو اسی قسم کے الفاظ و الزام ناپسندیدہ نظر آ رہے ہیں۔ ہمارے مسلم لیگی دوستوں کو چاہیئے تھا کہ خود اپنے مقرروں سے بہتر [illegible] کرتے۔ ہم نے مدت سے کوشش کی ہے کہ اس قسم کے ناپسندیدہ طریقے

زور نہیں دے رہے تھے کہ کانگریسی لیڈران کو رہا کرو۔ کیا ۲ اپریل سنہ [illegible]
میں ملک خضر حیات سے جھگڑا ہو جانے کے بعد مسلم لیگ نے
کانگریس سے مل کر خضر حیات کی وزارت توڑنے کا اعلان و پیشکش
نہیں کیا۔ کیا سال سوا سال مسلم لیگ اور کانگریس میں یارانہ گانٹھنے کی
تجویزیں نہیں ہوتی رہیں۔ کیا بھولا بھائی ڈیسائی سے نوابزادہ لیاقت علی
نے سمجھوتہ نہیں کیا تھا اور کیا اس سمجھوتہ کے بعد ہمارے مسلم لیگی دوست
یہ نہیں کہتے پھرتے تھے کہ اب مسلم لیگ اور کانگریس میں سمجھوتہ ہو گیا
ہے اس لئے خضر حیات کو بستر بوریا لپیٹ لینا چاہیئے۔

آج یہ سب کچھ بھول کر کانگریس کے خلاف، مولانا آزاد کے خلاف
اور کسی دوسرے کے خلاف زبان طعن و تشنیع دراز ہو رہی ہے۔ اگر مسلم لیگ
کانگریس کے ساتھ مل کر خضر حیات کو گرانے کے منصوبے باندھے تو
عین اسلام ہے۔ کیا اس وقت بھی اسلام کانگریس کا شریک کار نہ تھا کیونکہ ان
منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کانگریسی رہنمائی کی رہائی کا مطالبہ
اسلام دشمن کمیونسٹوں سے مل کر نہ کیا جا رہا تھا۔ سال بھر اہل اسلام کی رہائی کا
مطالبہ کرتے رہے اور جون تک یہ پروپیگنڈا جاری رہا۔ جب حکومت
نے مسلم لیگ کا مطالبہ تسلیم کر کے اس مطالبہ کو پورا کر دیا تو اب اس کو گالیاں
دینا شروع کر دیں۔

اس دورنگی طرز عمل سے مسلمانوں کو کب تک بے وقوف بنایا جائے
گا اور غیر ذمہ دار تحریروں اور غیر ذمہ دار اخباروں کے کالموں سے مسلمانوں
کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا یہ سلسلہ کب تک جاری رکھا جائے گا۔

جب [illegible] مسلم لیگ [illegible] کے رہنماؤں کو

آپ کو ان جمعیتوں سے آزاد کر لیا تھا اور مسلم لیگ یا کسی اور کی راہ میں حائل
ہونے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اس لئے ہمیں شملہ کانفرنس کے بارے میں
پوچھے جانے کی توقع ہی نہ ہو سکتی۔

جب جاپان کی جنگ میں روس کی مکمل شکست تک مدعو دین شملہ کانفرنس
کا مقصد اولین تھا، تو لارڈ ویول مجلس احرار کو دعوت کیسے دے سکتے تھے۔
جب ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو
۱۱ ستمبر کو مجلس احرار نے میرٹھ میں قرارداد منظور کر کے کہہ دیا کہ مجلس احرار
جنگ میں کسی قسم کی امداد دینے کو تیار نہیں۔ اسی جرم کی پاداش میں احراریوں
نے قیدیں کاٹیں۔ طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں۔ مولانا گل شیرؒ جیسے مجاہد
اور عالم دین سے ۱۰ سیر روزانہ گندم پسوائی جاتی رہی۔ شورش کاشمیری کو
بے حد تکالیف کا سامنا ہوا۔ مارنے کے علاوہ اس کے منہ میں پیشاب
ڈالا جاتا تھا۔ پاخانہ اس کی ناک پر باندھ کر اس کی مشکیں کس دی جاتی تھیں
تاکہ وہ گندگی کو ہاتھ سے ہٹا نہ سکے۔ دوسرے کارکنوں کو بھی طرح طرح کی
اذیت دی گئی۔ جب یہ مصائب توڑے جا رہے تھے۔ جناب سکندر حیات
غضنفر علی، کرامت علی وغیرہ خالص مسلم لیگی حضرات برسر اقتدار تھے اور ملک
خضر حیات بھی ان کے ہمراہ تھا۔ کوئی قائد اعظم بن کر تماشہ دیکھ رہا تھا
کوئی وزیر اعظم اور پارلیمنٹری سکرٹری بن کر یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔
لیکن جب ملک خضر حیات سے ذاتی جھگڑوں پر ٹکر ہوئی تو سب نہائے دھوئے
ہوئے نیکوکار بن کر ملک کے سامنے آ رہے ہیں۔ اور ہمیں یہ بتا رہے
ہیں کہ جو کچھ خضر حیات نے کیا ہم نے نہیں کیا۔ مگر برسر اقتدار تم تھے جیل کا
محکمہ وزارت عامہ کا محکمہ تمہارے ماتحت تھا۔ تمہیں نے کرتے تھے۔

گیا۔ پندرہ روز تک گفتگو ہوئی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پھر کہا گیا کہ ورکنگ کمیٹی
کو رہا کر دو پھر فیصلہ ہو سکے گا۔ حکومت نے ورکنگ کمیٹی کے سب
ارکان کو رہا کر دیا۔ مگر پھر بھی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ جن لوگوں نے خضر وزارت
کو مجلس احرار کو اور دیگر مسلمان جماعتوں کو ختم کرنے کے لئے ایک سال
سے زائد کانگریس سے اتحاد کیا اور سارے ہندوستان میں کانگریس
کا ساتھ دینے کی کوشش کی تاکہ ہر جگہ وزارتیں ہاتھ آ جائیں ان کے
لئے سوچنے کا مقام ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ایک طرف تو کانگریس کو
ہندو جماعت کہہ کر اس کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں اور دوسری طرف
مسلمانوں کی جماعتوں کو تباہ کرنے کے لئے اس سے اتحاد بھی کرتے
ہیں۔ آخر اس دو رخی پالیسی کی قلعی کھل گئی ہے۔ اب ملک کو مزید دھوکا
نہیں دیا جا سکتا۔ میں نے چار برس کوشش کی کہ مسلم لیگ سے بات
ہو مگر مسلم لیگیوں نے اپنی قوت کے زعم میں ہمیشہ ہم پر برسنا بہتر
سمجھا۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب مسلم لیگ، خاکسار اور یونینسٹ سب
یار تھے تین تین چار چار گھنٹے اسمبلی کی عمارت میں وزیر اعظم کے کمرے
میں گفتگوئیں ہوتی تھیں اور اسکیمیں بنائی جاتی تھیں خاکساروں کو پیغام
بھجوایا جاتا تھا لیکن خاکساروں پر جب گولی چلائی گئی تو سب کو
سانپ سونگھ گیا کسی نے محسوس بھی نہ کیا کہ کیا ہوا ہے۔

جو دوست پاکستان لینا چاہتے ہیں میں ان سے پوچھتا ہوں کہ
تم نے لینا تو پاکستان ہے کس سے؟ ہندوؤں سے یا سکھوں سے یا انگریز
سے دو سال ہوئے لارڈ لنلتھگو اور لارڈ ویول نے کہہ دیا کہ ہندوستان
کا آئندہ آئین وفاقی ہوگا یعنی پاکستان نہیں بنے گا۔ جب انگریزوں

مہربانی سے لکھنؤ میں شیعوں کا ایک جداگانہ کالج قائم ہوگیا۔ اور شیعہ سنیوں میں یہ [illegible]
جدائی بڑھتی گئی اور ایک پرلطف بات یہ ہوئی کہ بعض شیعہ صاحب کا خیال یہ ہوگیا۔
اگر انگریزی عملداری نہ آئی ہوتی تو سنی انہیں ہضم کر گئے ہوتے حالانکہ انگریزی عہد کے
سے قبل شیعہ ہی تمام ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے اور ملک کے سیاہ و سپید
کے مالک تھے باوجود ان ناخوشگوار حالات کے ابتدا میں جب کونسلیں قائم ہوئیں تو
بوجہ اس کے کہ رائے دہندگی کا حق اوپر کے طبقہ کو تھا جو بالعموم تعلیم یافتہ تھا۔ شیعہ
امیدوار کامیاب ہو جاتے تھے۔ مگر جب رائے دہندگان کے حلقے وسیع ہوئے
تو مذہبی جذبات کو بھڑکا کر شیعہ امیدواروں کے خلاف پروپیگنڈہ ہونے لگا اور شیعہ
محض شیعہ ہونے کی وجہ سے ناکامیاب ہوئے اس پر شیعوں میں جداگانہ طریقہ انتخاب
کی خرابیوں کا احساس ہوا اور انہوں نے مخلوط انتخاب کی تائید کرنا شروع کی تاکہ غیر
قوموں کی مدد سے انہیں کامیابی ہو سکے۔ اسی قسم کی ضرورتوں سے شیعوں کو بھی ایک
جداگانہ سیاسی جماعت بندی پڑی اور ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس
قائم کی گئی جس کا پہلا جلسہ ۱۹۳۰ء میں بمقام لکھنؤ بصدارت راجہ نواب علی خاں منعقد
ہوا اس میں کانفرنس کا نصب العین جائز اور آئینی طریقہ سے حکومت خود اختیاری حاصل
کرنا قرار پایا اور دو مطالبے کئے گئے۔

۱۔ معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب اور
۲۔ شیعوں کے لئے معین نشستیں۔

شیعہ کانفرنس کا دوسرا اجلاس ۵ اپریل ۱۹۳۱ء کو منٹگمری میں بصدارت راجہ
صاحب منعقد ہوا۔ پاس شدہ تجاویز حسب ذیل خاص تھیں:

۱۔ گاندھی ارون مصالحت پر اظہار طمانیت۔
۲۔ مسٹر جناح کے چودہ نکات جن کی رو سے مخلوط انتخاب ملنے کی امید تھی

ہے اس کی تائید کی جائے۔ اور کمیٹی تجویز کی گئی جو اس جلسہ کے لئے ڈیلیگیٹ منتخب کرے۔

مومن کانفرنس کا قیام

۱۹۱۳ء سے کلکتہ میں "جمعیۃ مومنین" کے نام سے ایک جماعت قائم تھی جس کا مقصد مومن برادری یعنی پارچہ بافوں کی تعلیمی اور سوشل اصلاح کرنا تھا۔ اس کا پہلا جلسہ "مومن کانفرنس" کے نام سے حاجی حافظ شمس الدین صاحب شمس جہان آبادی صدر کی صدارت میں مارچ ۱۹۲۵ء میں بمقام کلکتہ منعقد ہوا اسی سال کے دسمبر کے جلسہ میں مولوی عبد العزیز عبد اللطیف صاحب بی اے ممبر کونسل بنگال کو مستقل صدر منتخب کیا گیا۔ تیسرے جلسہ کی صدارت مولوی حامد بخش صاحب بنارسی نے فرمائی اور چوتھے جلسہ میں مولوی ظہیر الدین صاحب صدر منتخب ہوئے۔ ۵، ۶، ۷ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو کانپور کے جلسہ میں مولوی عبد العزیز عبد اللطیف صاحب دوبارہ صدر ہوئے۔

آل انڈیا مومن کانفرنس کا اجلاس دہلی

مومن کانفرنس کا آٹھواں سالانہ اجلاس ۲۷، ۲۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو دہلی میں بصدارت مسٹر ظہیر الدین وکیل جو اس کے مستقل صدر ہیں کانفرنس مذکورہ منعقد ہوا۔ رپورٹ کیا جاتا ہے کہ ڈیلیگیٹوں کی تعداد دو ہزار اور وزیٹروں کی تعداد پندرہ ہزار تھی۔ خطبۂ صدارت کے بعد حسب ذیل تجاویز پاس ہوئیں۔

۱۔ اس کانفرنس کو کوئی آئینی یا سیاسی تصفیہ کسی دوسرے فرقہ کا اس وقت تک منظور نہ ہوگا جب تک کہ آل انڈیا مومن کانفرنس کی تائید

۱۔ ہندوستان مختلف مذہبوں اور قوموں کا ایک مشترکہ وطن ہے اس لئے مسلمانوں کا نصب العین اپنے ملی اور مذہبی حقوق کی حفاظت کے ساتھ ہندوستان کی مکمل آزادی ہے اور وہ تحصیل آزادی کی جدوجہد میں کسی دوسری ملت سے پیچھے رہنے کو اپنے ملی وقار اور دیرینہ روایات کے خلاف سمجھتے ہیں۔

۲۔ ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی وہی قابل قبول ہوگا جو خود اہل ہندوستان نے بنایا ہوا ہو جو مجلس بالغ رائے دہندگان کے منتخب کردہ ہوں۔ اس میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ اسی طریقہ پر ہوگا جو اس جماعت کے مسلم نمائندے منظور کریں۔ ان نمائندوں کا انتخاب صرف مسلمان کریں گے۔

۳۔ اس کانفرنس کی رائے میں ہندوستان کو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کرنے کی تجویز ناقابل عمل اور بالعموم ملک کے مفاد اور بالخصوص مسلمانوں کے مفاد کے لئے مضر ہے۔ اس سے ہندوستان کی آزادی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں گی اور فرقہ بندی کی کیفیت اس سے زیادہ ہو جائے گی۔

۴۔ اس کانفرنس کی رائے میں یہ ضروری ہے کہ صوبہ بلوچستان کو آئینی طور پر بھی دوسرے صوبہ جات کے مساوی درجہ پر بہت جلد دیا جائے۔

۵۔ یہ کانفرنس بالخصوص مسلمانوں سے اور بالعموم اہل ہند سے درخواست کرتی ہے کہ وہ دستکاری کے بنے ہوئے کپڑے کا استعمال کر کے ہندوستانی پارچہ بافوں کی خستہ حالی دور کریں۔

۶۔ یہ کانفرنس ۲۵ ممبروں کا ایک بورڈ مقرر کرتی ہے جو فرقہ وارانہ مسائل کا حل تجویز کرے اور دو مہینے کے اندر اپنی رپورٹ آئندہ اجلاس کانفرنس میں پیش کرے۔

اس بورڈ کے متعدد جلسے ہوئے مگر کچھ تو بعض ممبروں کے جیل میں چلے جانے

(۵) ہندوستان میں رہنے والی دوسری قوموں اور جماعتوں سے مکمل آزادی کے حصول کے لئے سمجھوتہ کرنا جو حسب ذیل بنیادی اصولوں پر جو اس اجتماع نے اپنی قرارداد نمبر ۲ میں منظور کئے پہلی مجلس سے متفق ہوں۔

۱۔ ہندوستان بدستور ایک متحدہ ملک رہے۔

۲۔ ہندوستان کا نظام حکومت ہندوستانیوں ہی کا بنایا ہوا ہو۔

۳۔ کل ہندوستان کا ایک ہی وفاق ہو۔

۴۔ وفاق کے اجزا میں سے ہر جزو خود مختار ہو اور اختیارات باقی بھی انہیں کے پاس ہوں۔

۵۔ وفاق کا ہر جزو اس امر میں مختار اور آزاد ہو گا کہ وہ اپنی مجموعی آبادی کی کثرت رائے سے جس کا فیصلہ عاقل و بالغ کی رائے سے ہو۔

۶۔ وفاق سے جب چاہے الگ ہو جائے اور

۷۔ اقلیتوں کے مذہبی، معاشی و تہذیبی (کلچرل) حقوق بھی دستور کی رو سے کامل اور موثر طور پر محفوظ ہیں۔

اس جماعت کے پریسیڈنٹ مسٹر عبد المجید خواجہ بیرسٹر ایٹ لا رئیس علی گڑھ اور سکریٹری ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری دہلی قرار پائے۔

ہندوستان کے مختلف پیشوں کا تناسب

زمانہ سابق میں وہ روپیہ کے کاروبار بیمہ اور بینک کے سود کو ناجائز سمجھتے تھے مگر جب
سے مولانا مولوی مناظر احسن صاحب گیلانی نے اپنے مضمون میں مسئلہ "فی" کی توضیح
کی ہے جس کی رو سے ہندوستان میں ہر قسم کے کاروبار کا جواز ثابت کیا گیا ہے تب سے
مسلمانوں کے لئے تمام مالی منافع کے دروازے کھل گئے ہیں اور قریب وقت ہے کہ
کہ مسلمانوں کا مرتبہ مالی اعتبار سے بلند ہو۔

حق نمبر ۲ حفاظت ملک

جیسا کہ باب دوم میں ذکر کیا جا چکا ہے ملک میں زمانہ سابق میں ہر شخص منتخب رہنما اور فنون
جنگ سے واقف تھا اس لئے لڑائی چھڑ جانے کے وقت منصب داروں کو فوج
فراہم کرنا چنداں مشکل نہ ہوتا تھا مگر کمپنی کی عملداری میں فوج کی تعداد صرف مقررہ تنخواہ دار
سپاہیوں پر محدود کر دی گئی اور جس طرح تمام محکموں میں ہندوستانیوں کو بڑے بڑے عہدے
ملنے بند ہو گئے اسی طرح فوج میں ان کی حیثیت محض سپاہی اور زیادہ سے زیادہ جمعدار
اور صوبیدار کی رہ گئی پھر ۱۸۵۷ء کے بعد سے رعایا سے ہتھیار بھی لے لئے گئے
اور شمالی سرحد پر ایک مصنوعی دیوار قائم کر کے اور رعایا کو غیر مسلح کر کے اس ملک کے
مربع میل کے رقبہ کو گویا ایک حرم سرا کے اور دنیا کی آبادی کے پانچویں حصہ کو زنانہ
مثل ہیجڑوں اور خواجہ سراؤں کے بنا کر سمجھ لیا گیا کہ ملک بیرونی حملوں سے محفوظ اور
مامون ہو گیا۔

مگر گزشتہ جنگ میں حکومت کے ہاتھوں سے برما نکل جانے سے ثابت ہو
گیا کہ جب تک رعایا منتخب رہنما نہ ہو ملک کی حفاظت ہونا ناممکن ہے اسی لئے
حکومت نے اپنی فوجی پالیسی میں تبدیلی کر کے ہندوستانیوں کو ڈیفنس کونسل میں شامل کیا
اور انہیں کثرت کے ساتھ شاہی کمیشن اور وائسرائے کمیشن کے عہدے دینے
کر دیئے۔ اس سے ہندوستانیوں کو فوجی تربیت حاصل کرنے کے بہترین مواقع مل

دیئے گئے کہ اس سے وہ شش و پنج میں رہیں کہ اپنے مدارس علیحدہ ہوں۔ لیکن یہ مسئلہ کہ حکومت کے محاصل کی رقم کا بڑا حصہ تعلیم جیسے ضروری امور پر صرف ہو اس وقت ہندوستانیوں کے خاطر خواہ طے ہو سکتا ہے جب کہ فوری طور پر حکومت خود مختاری کا درجہ حاصل ہو جائے۔

موجودہ حالت یہ ہے کہ آئین ۱۹۳۵ء کی رو سے زبان کے متعلق پورے اختیارات صوبوں کے وزیروں کو مل گئے ہیں ان کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ حق بقدر نصف کے ہندوستانیوں کو مل گیا۔

حق نمبر ۶ ۔ تعلیم

انگریزی عملداری کو اس ملک میں ایک سو اسی سال ہوئے۔ تعلیم کے لحاظ سے اس زمانہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول پچاس سال میں تو حکومت کی طرف سے کسی قسم کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا گیا۔ دوسرے پچاس سال میں تعلیم کی غرض دو امور پر مشتمل رہی۔

(۱) مذہب عیسوی کی اشاعت

(۲) ہندوستانیوں کو ملازمتوں کے لئے تیار کرنا۔ یہ دوسرا دور ہنگامہ ۱۸۵۷ء پر ختم ہوا جس میں ہندو مسلمان متحد ہو کر حکومت سے لڑ رہے تھے۔

اس کے بعد انگریزوں کی توجہ اس طرف ہوئی کہ ان دونوں قوموں کو مختلف الخیال بنایا جائے۔ سر جارج پیٹ اور مسٹر کیمبل ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے بھی تاریخیں لکھیں جن سے ہندوؤں کے دلوں میں مسلمان بادشاہوں سے نفرت پیدا ہو۔ نیز لفظوں ذکر میں تعلیم کے ذریعہ درس گاہوں میں غداری کے خیالات پیدا کرنے کے طریقے اختیار رکھے گئے۔ اس تعلیم کے نتائج کو آج سے بہت پہلے ہندوستانیوں نے محسوس کر لیا تھا۔ اکبر الہ آبادی اس بارہ میں فرماتے ہیں[1]:

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

---

[1] سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی جسٹس ڈسٹرکٹ جج۔

یعنی جبکہ سنہ ۵۳ء کی مردم شماری کی رو سے ہندو یک سو میں سے ۲ء۷ خواندہ ہیں،
مسلمان صرف بقدر ۴ء۰ فی صدی کے ہیں۔ اس کمی کا موجب ایک حد تک زبان کا
مسئلہ ہے جس کی بحث برادرانِ وطن نے اٹھا کر اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار
دے دیا ہے اس سے فی الجملہ مسلمان مشکل میں پڑ گئے در آنحالیکہ مسلمانوں نے خود اپنی
زبان عربی اور فارسی کو چھوڑ کر ملک کی مشترک زبان اردو اختیار کی تھی۔ لیکن
اب صورتِ حال یہ ہے کہ مختلف صوبوں کے ہندو اپنے اپنے صوبوں کی زبان و حروف
اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں جو ان کے لئے سہل ہے اور تمام صوبوں کے مسلمان اپنے
صوبہ کی زبان اور حروف کو غیر سمجھ کر صرف اردو کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کا انتظام
ہر صوبہ کے چھوٹے مقامات میں نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس لئے وہاں کے بچے ابتدائی
تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں اور اس کا اثر مجموعی طور پر قوم کے خواندوں کی تعداد پر
پڑتا ہے۔ زمانہ سابق میں مختلف صوبوں کے مسلمان اپنے اپنے صوبوں کی زبانوں
میں اپنی مذہبی کتابیں اور اپنے تاریخی حالات لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ بنگلہ کی نسبت
معلوم ہے کہ اس زبان میں مسلمانوں کی روایات و حکایات کا ایک مکمل ذخیرہ تھا۔ مگر
درمیانی زمانہ میں جب کہ یہ سمجھا جانے لگا کہ بنگلہ زبان و حروف صرف ہندوؤں کی زبان
اور حروف ہیں تو اس سے مسلمانوں نے دستکشی اختیار کر لی اور اب تمام ہندوستان
کے صوبوں کے مسلمان اپنے بچوں کو اردو ہی پڑھانا چاہتے ہیں۔ قومیت اور یکجہتی
پیدا کرنے کے لئے یہ مبارک قدم اٹھایا گیا ہے مگر اس میں ایک مشکل بھی ہے وہ یہ کہ اردو
طریقہ تحریر ایک قسم کی مختصر نویسی ہے جس کے سیکھنے میں تو دیر لگتی ہے مگر سیکھ جانے
کے بعد اس کے لکھنے اور پڑھنے میں بمقابلہ ہندی اور انگریزی کے وقت کم صرف ہوتا
اس لئے وہ ابتدائی تعلیم کی ذریعہ کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ برخلاف اس کے
ہندی و انگریزی میں چونکہ اعراب کی جگہ حروف ہیں اور ہر حرف علیحدہ لکھا جاتا ہے

اس وجہ سے چھوٹے بچے اور پوری عمر کے لوگ اسے بہت جلد سیکھ جاتے ہیں اور
تھوڑے وقت میں کتابیں اور اخبارات پڑھنے لگتے ہیں۔ اس سے ہندوؤں میں خواندوں
کی تعداد بہت سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مسلمان بچے اور
پوری عمر کے لوگ برسوں میں بھی اردو کتابیں اور اخبارات پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے
اور اگر لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری نہ رہے تو جلد بھول جاتے ہیں۔ بڑی مصیبت یہ
ہے کہ اب ہر پیشہ میں خواندہ ہونے کی ضرورت ہے۔ پس جو قوم خواندوں کی تعداد
بڑھانے میں پیچھے رہے گی وہ دماغی نشوونما اور تہذیب و تمدن میں بھی لازمی طور
پر پسماندہ رہ جائے گی اور قومی کشمکش میں شکست کھائے گی۔ اسی ضرورت کو دیکھ
کر جدید ترکی نے اپنے قومی حروف کو چھوڑ کر یورپ کا رومن طریقہ تحریر اختیار کر لیا۔
بدقسمتی سے اس وقت قومی کشمکش اور منافرت کی وجہ سے کوئی صورت ایسی نہیں
معلوم ہوتی کہ ہندوستان کے مسلمان اردو کے موجودہ حروف چھوڑ کر رومن یا ناگری
حروف اختیار کریں۔ اس لئے بجز اس کے چارہ نہیں کہ اردو ہی کو اس حالت میں سے
نکالیں کہ اس کے اعراب کی جگہ حروف ہوں اور ہر حرف جدا جدا لکھا جائے تاکہ وہ بھی
تھوڑے وقت میں اپنی قوم میں زیادہ سے زیادہ خواندہ لوگ تیار کر سکیں جس پر
تمام مادی اور روحانی ترقی اور دماغی نشوونما کا انحصار ہے۔ سالہا سال سے
ہماری قوم کے قابل صاحب اردو رسم الخط کو سہل بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور
سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اس اہم مسئلہ کو حل کر لیا ہے مگر وہ حقیقت سے بہت دور ہیں
اور اندیشہ ہے کہ اس بارہ میں کوئی صحیح راستہ جلد سے جلد اختیار نہ کیا گیا تو وسیع پیمانہ
پر دماغی ترقی کے کام میں شکست کھا کر مسلمان خود مختار اس ملک میں اپنے مرتبہ پر
قائم نہ رہ سکیں گے اور پھر کوئی بہادری اور کسی قسم کی تنظیم و ادعائے فوقی
تفوق ہمیں قومی کشمکش میں کامیاب نہ بنا سکیں گی۔ ان حالات میں بجز اس کے

چارہ نہیں کہ جب تک کہ اردو رسم الخط سہل نہ بنایا جائے اس وقت تک تو صوبوں
کے مسلمانوں کو مجبور نہ کیا جائے کہ وہ لازمی طور پر اردو ہی پڑھیں بلکہ انہیں موقعہ دیا
جائے کہ وہ مثل زمانۂ سابق کے اپنے اپنے صوبوں کے مروجہ حروف میں ابتدائی
تعلیم حاصل کریں۔

(د) تعلیم نسواں

گزشتہ چند سالوں میں مسلمان لڑکیوں میں تعلیم کا شوق بہت
بڑھ گیا ہے، وہ لڑکوں سے کہیں زیادہ محنت سے پڑھتی
ہیں، یہ علمی ترقی کے بہت عمدہ آثار ہیں۔ مدارس نسواں کی تعداد بہت کم ہے۔
ضرورت ہے کہ اس طرف خاص توجہ کی جائے۔

حق تمیز - ملازمت

باب سوم کی فصل دوم میں دکھایا گیا ہے کہ لارڈ
کارنوالس کے عہد میں ہندوستانیوں پر تمام بڑے
عہدوں کے دروازے بالکل بند کر دیئے گئے تھے۔ گو ۱۸۳۳ء میں پارلیمنٹ
نے بذریعہ ایک قانون کے یہ طے کر دیا تھا کہ کالوں اور گوروں کو یکساں عہدے
دیئے جائیں گے۔ اس قانون کے پاس ہونے پر اس کی بہ نفسہ تعمیل تو نہیں ہوئی لیکن
اس کے دو برس بعد ۱۸۳۵ء میں لارڈ بینٹنک نے عدالت دیوانی کے لئے صدر امین
کا عہدہ اور مال و فوجداری میں کلکٹر ضلع کے نیچے ڈپٹی کلکٹری کے جدید عہدے
قائم کئے جو ہندوستانیوں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے اور یہ ان کے لئے بڑے سے
بڑے عہدے تھے۔ ان سے اوپر کے عہدے انگریزوں کے لئے مخصوص تھے اور
اس طرح کالوں اور گوروں کے درمیان باوجود پارلیمنٹ کے مذکورہ بالا قانون پاس
ہو جانے کے امتیاز قائم رہا۔ ۱۸۵۸ء میں ملکہ معظمہ کوئن وکٹوریہ کی طرف سے اعلان
ہوا کہ کالوں اور گوروں کو یکساں عہدے ملیں گے مگر چونکہ ہندوستان کی سول سروس
کا امتحان یہاں سے اس ملک سے سات ہزار میل کے فاصلہ پر انگلستان میں ہوتا تھا

کی تنخواہ علاوہ خرچ خوراک اور تجارت کرنے کے حق کے چونتیس روپیہ ماہوار کے
قریب ہوتی تھی۔ اس تجارتی حالت سے ترقی کرکے جب حکومت قائم ہوئی تب بھی
ابتدا میں تنخواہیں معمولی تھیں مگر اب وائسرائے کا جیب خرچ ۲۵ ہزار روپیہ ماہوار
ہے اس طرح وائسرائے اور گورنروں کے صرف جیب خرچ پر ہندوستانیوں کا
سولہ لاکھ روپیہ سالانہ سے زیادہ خرچ ہوتا ہے اور ان کا مکان، کھانا، آمد و رفت
سفر خرچ، ملازمان، مہمانان، غرضیکہ ہر قسم کے اخراجات ملک کے ذمہ ہیں۔ اسی
طرح سول سروس کے عہدہ داروں کو جو صوبوں میں پھیلے ہوئے ہیں بیش قرار تنخواہیں
ملتی ہیں جس کی نظیر دنیا کے دولت مند ملکوں میں بھی نہیں ملتی۔ ہندرہ بارہ عہدے
مرکزی حکومت کے تحت میں ہیں۔ البتہ موجودہ جنگ کے زمانہ میں فوج کے بڑے
عہدے ہندوستانیوں کے لئے کھول دیئے گئے ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً
ملازمت ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں بقدر نصف کے آ گیا ہے اور نصف باقی ہے
جو صرف تمام ہندوستانیوں کے متحدہ مطالبہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ بات ظاہر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کی تمام
تر توجہ ملازمتوں کی طرف اس وجہ سے ہوئی ہے کہ عہدوں کی تنخواہیں غیر معمولی طور پر
بڑی ہیں اور دیگر ذرائع معاش مفقود ہو گئے ہیں۔ اور چونکہ ہر قسم کے سرکاری ملازموں
کی تعداد بشمول فوج اور میونسپلٹی وغیرہ کے کل آبادی کا صرف ۲ فی صدی یا ۳ فی
ہزار ہے اس لئے تمام مخلوق اس طرح ٹوٹ پڑی اور ملازمتوں کے لئے کشمکش
حد درجہ بڑھ گئی۔

اب رہے مسلمان وہ انگریزی عملداری کے شروع میں تو ملازمتوں سے دیدہ و
دانستہ دور رکھے گئے۔ بعد میں جب تعلیم پا کر انہیں ملازمت کا موقع ملا تو قدرتی طور پر
وہ ہمہ تن اس طرف متوجہ ہو گئے۔ مگر چونکہ سرکاری محکموں پر ہندو ان سے پہلے سے

۹۔ حقوق ملکیت میں آزادی

ناظرین کو "اسباب بغاوت ہند" کے اقتباسات سے جو باب سوم میں دیئے گئے ہیں یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ جنگ ۱۸۵۷ء سے پیشتر کس بے دردی کے ساتھ اوقاف اور معافیات ضبط کی جاتی تھیں، مگر اس زمانہ کے مقابلہ میں آج کل کی بے اطمینانی کہیں زیادہ ہوگئی ہے ان دنوں اپنے واجبی حقوق طلب کرنے پر تحریکات ملکی بہبودی کے کام کرنے والوں کے جان و مال اور جائدادوں کی جو تباہی ہوتی رہی وہ ہر شخص پر عیاں ہے۔ سرسید کو اوقاف اور معافیات کی ضبطی کی شکایت تھی مگر پچھلے دنوں میں تو لوگوں کی ذاتی پیدا کی ہوئی جائدادیں یک چشم زدن میں ضبط کر لی گئیں بعض شہروں میں زنانہ مکانات کی تلاشیاں ہوئیں۔ ذاتی کتب خانے اور تصانیف برباد کی گئیں مساجد اور خانقاہوں نے محض سرکار کی سرپرستی کو، جو زیادہ تر حکومتوں اور افسروں کی شفاعت کے عوض میں عطا کی جاتی تھی، اپنی ہستی قائم رکھنے کا ذریعہ بنا لیا۔ اب جدید آئین کے نفاذ سے یہ اختیارات ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں آگئے ہیں۔ مگر چونکہ گورنروں کو اختیارات خصوصی حاصل ہیں۔ اور بعض صوبوں میں اب تک تقریباً وہی طریقے جاری ہیں اور جنگ کے زمانہ میں تو یہ اختیارات زیادہ تر صوبوں میں کلیتہً گورنروں کے ہاتھوں میں ہیں اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستانیوں کو بقدر نصف کے یہ حق حاصل ہوا ہے اور باقی ماندہ نصف کے حاصل کرنے میں کسی فرقہ کو جداگانہ کوشش کرنے سے کامیابی نہیں ہو سکتی۔

حق نمبر ۱۰۔ سیاسیات

یعنی "حکومت میں رعایا کا حصہ" ہے یہ حق در اصل گزشتہ نو حقوق کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ کمپنی کے زمانہ میں اہل ہند اس حق سے کلیتہً محروم تھے۔ بعد ازاں تاج برطانیہ کی عملداری میں ۱۸۶۱ء سے وائسرائے کی کونسل میں ایک ہندوستانی ممبر بطور مشیر کے شامل کیا گیا۔ ۱۸۹۲ء سے ہندوستانیوں کا داخلہ کونسلوں میں شروع ہوا۔ مگر

جس پر تمام لوگوں کی زندگی کا دارومدار ہے کہیں پتہ نہیں تھا ورنہ اس جدید آئین میں کوئی ایسی دفعہ تھی ہے جس کی رو سے ہندوستان سے دوسرے ملکوں کو روپیہ کی ڈھلائی بند کی جائے۔ اس آئین پر مندرجہ ذیل شعر صادق آتا ہے۔

تم جو دیتے ہو نوشتہ وہ نوشتہ کیا ہے
جس میں ایک حرفِ وفا بھی کہیں مذکور نہیں [illegible]

بہرحال اس جدید آئین کی رو سے صوبوں کی حکومتوں کا فیصلہ ہو چکا اور وہ سب کے سب ہندوستانیوں کے تحت میں آ گئے اور اب انہیں تعلیم، صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت غرض جملہ نفع رسانی کے صیغوں پر ان کا تسلط ہو گیا مگر کوئی ایسی سبیل آمدنی کی نظر نہیں آتی جس سے مندرجہ بالا صیغہ جات کو کامیابی کے ساتھ چلایا جا سکے۔ البتہ آمدنی بڑھانے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ رعایا پر مزید ٹیکس لگایا جائے مگر انتہائی غربت و افلاس کی وجہ سے ہر مدبر جماعت کا پہلا فرض یہ ہو جاتا ہے کہ کروڑوں ننگے بھوکے کاشتکاروں پر لگان کم کرے نہ کہ ان پر مزید صعوبت قائم کرے۔ صوبجاتی حکومتوں کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ انہیں آبکاری و آمدنی کے دیگر ناجائز ذرائع کو بند کرنا ہے اور امپیریل سروس یعنی بڑے عہدوں کی تنخواہیں گھٹانا ان کے اختیار سے باہر ہے۔ پس صوبوں کی حکومت سے ہندوستانیوں کی ذمہ داریاں تو بے حد بڑھ گئیں لیکن آمدنی کے وسائل اور کم ہو رہے ہیں۔

ب۔ فیڈریشن

صوبوں کی حکومت کے بعد مرکزی حکومت کا نمبر آتا ہے جس کی قانونی اصطلاح کا نام "فیڈریشن" یا وفاقی حکومت ہوگا۔ اس کی حالت موجودہ مرکزی اسمبلی سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ اب تک اس کے ممبروں کا انتخاب عوام ہی کرتے تھے۔ آیندہ سے مختلف صوبوں کی اسمبلیوں کے ممبر کریں گے۔ فیڈریشن میں ممبروں میں ایک ثلث تعداد ریاستوں کے

کی کنجی ہے اس لئے اس حق کے پورے طور پر مل جانے کے یہ معنی ہوں گے کہ ہندوستان سے تمام زر کشی بند ہو کر ملک میں دولت کے دریا بہنے لگیں گے جن سے ہر کس و ناکس بلا لحاظ مذہب و ملت یکساں سیراب ہوگا، ملک کی حفاظت کے لئے بری، بحری اور ہوائی طاقتیں ان کے ہاتھوں میں ہوں گی، نوے فی صدی آبادی خواندہ ہوگی اور ہر طرف ملک میں علوم و فنون اور صنعت و حرفت کی ترقی کے چرچے ہوں گے، اور سب سے آخر یہ کہ دنیا کی قوموں میں ہندوستانیوں کی یکساں عزت اور آبرو قائم ہو جائے گی

بنیادی حقوق کا محاسبہ

گزشتہ صفحات میں بنیادی حقوق کی نسبت دکھایا گیا ہے کہ وہ کس قدر حاصل ہوگئے اور کس مقدار میں حاصل ہونے باقی ہیں، ذیل کے نقشہ سے ان کی یکجائی کیفیت معلوم ہوگی۔

	حقوق	کتنا حصہ مل گیا	کتنا حصہ باقی ہے
۱	روٹی کا مسئلہ	۱/۴	۳/۴
۲	حفاظت ملک	۱/۲	۱/۲
۳	عدل و انصاف	۱/۴	۳/۴
۴	مذہبی حفاظت	۱/۲	۱/۲
۵	تہذیب و زبان	۱/۲	۱/۲
۶	تعلیم	۱/۲	۱/۲
۷	ملازمت	۱/۲	۱/۲
۸	شہری حقوق	۱/۴	۳/۴
۹	حقوق ملکیت	۱/۲	۱/۲
۱۰	سیاسیات	۱/۴	۳/۴
	میزان	۴	۶
	بحساب فی صدی	۴۰	۶۰

سنہ ۱۹۱۰ء میں انگریز پرنسپلوں کے چنگلوں سے نکل کر لکھنؤ کی نئی پود جب آئی اور ملکی سیاست
کی طرف اس کا قدم آگے بڑھنے لگا چند سال قبل جب مسلمانوں کو فرقہ وارانہ انتخاب
دیا جانا تجویز ہوا تھا تو اس وقت کے وزیر ہند لارڈ مارلے نے صاف صاف لفظوں میں
فرما دیا تھا :-

"اگر یہ خیال ہو کہ ان اصلاحات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ ہندوستان
میں پارلیمنٹری جمہوری حکومت قائم ہو سکتی ہے تو جہاں تک میرا تعلق
ہے مجھے اس سے واسطہ نہ ہوگا"

پھر اس لئے فرمایا تھا کہ ۱۹۰۹ء کی کونسلوں میں منتخب شدہ ممبر صرف مشیر
کے ہوتے تھے اور انہیں کسی قسم کے اختیارات نہ تھے ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم
لیگ کے درمیان سمجھوتہ ہوا جس کی رو سے مسلم اقلیت کے صوبوں کے ممبران کونسل ان کے
استحقاق سے زیادہ تعداد میں ممبریاں دی گئیں مگر پنجاب اور بنگال میں مسلم ممبران کی اکثریت
اقلیت میں تبدیل کر دی گئی اور فرقہ وارانہ انتخاب بدستور قائم رکھا گیا چونکہ وہ اختیار
کونسلوں کے لئے منافی تھا اسی لئے اس وقت کے وزیر مسٹر مانٹیگو نے فرما دیا تھا کہ :-

"ہم فرقہ وارانہ انتخاب کو حکومت خود اختیاری کے ارتقا میں سب سے
بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں"

مگر کونسلوں کو اختیارات ملنے میں ممبروں کا یہ حق تھا کہ انہیں میں سے وزیر منتخب
ہوتے تھے اس لئے بدی خواہ اس کے کہ اکثریت کے ہاتھ میں ہونے سے مسلم وزرا صوبہ
دیگر قوم کے لوگوں کے ہاتھوں کیسے ہی مظالم کیوں نہ ڈھائے جائیں تاہم یہ دوسری
ناقص قسم کی جمہوری حکومت بننے پر متفق ہو گئے اس کا نتیجہ ضرور دوسری بے شمار
خرابیوں کے ایک یہ ہوا کہ مذہبی بلوؤں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی جس کا تذکرہ دوسری
دوسری جگہ کیا گیا ہے۔ پھر ان اسی طبقہ کے ہندو مسلمانوں کے اتحاد عمل سے کانگریس

اور مسلم لیگ سات سال تک دوش بدوش چلیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب جنگ عظیم چھڑی ہوئی
تھی اور بعض ہندو مسلمان رہنما انگریزی حکومت سے معاونت کر کے اسے امداد دے
رہے تھے۔ مگر علماء کرام کی حالت مختلف تھی۔ ان کے رہنما حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن
اور ان کے ساتھیوں پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ حکومت ہند کے خلاف بیرونی غیر ممالک
میں جا کر ایک جمہوری حکومت قائم کرنے کا منصوبہ کر رہے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں خلافت
کمیٹی اور جمعیۃ علماء قائم ہو کر کانگریس کے ساتھ تھیں اور انہوں نے کانگریس کو عدم تعاون
تک پہنچا کر اسے ایک تیز جماعت بنا دیا۔ اس وقت ترک موالات اور سول نافرمانی کی
جنگ کا سبق مسلمانوں نے پوری نصف صدی کے بعد دہرایا۔ صرف فرق اتنا تھا کہ
۱۸۵۷ء تک وہ تشدد آمیز جنگ لڑا کرتے تھے اور اب پر امن۔ رابطہ مسلم لیگ اور
سرکاری پیش رو جماعتوں کی پرورش اور تربیت چونکہ حکام کی گودوں میں نہایت عیش و
آرام سے ہوئی تھی اس لئے وہ جنگ کی متحمل نہ ہو کر سات سال بعد ۱۹۲۱ء میں کانگریس
سے علیحدہ ہو گئی۔ اس کے سال بھر بعد سول نافرمانی ختم ہو گئی۔ "خلافت کمیٹی" بوجہ
زوال خلافت ترکی کے پست ہمت ہو چکی تھی اس پر جب ہندو مسلم بلوے
بڑھنے لگے تو کانگریس سے بھی علیحدہ ہو کر ۱۹۲۴ء میں اس کے کاموں سے دست
کش ہو گئی۔ اسی طرح ہندوؤں کی ذہنیت کا اثر جمعیۃ علماء پر پڑا جس سے دونوں
جماعتوں میں کشیدگی ہو گئی مگر جمعیۃ العلماء نے اپنی سیاسی جدوجہد کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنے
مقاصد میں "کامل آزادی" کا اضافہ کیا۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن آیا تو کانگریس اور
مسلم لیگ میں بات چیت ہوئی مگر سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ ۱۹۲۹ء میں جناح اور نہرو کی تجاویز
نا منظور ہوئیں اور ۱۹۳۰ء میں یہ دونوں جماعتیں اور جمعیۃ علماء کامل آزادی کے لئے سول
نافرمانی کی جدوجہد میں کانگریس کے شریک رہیں۔ پھر گول میز کانفرنس میں بات چیت
ہوتی رہی۔ ان تمام جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر اعظم کے فیصلہ کی رو سے مسلمانوں کو

تاریخی پس منظر

ناظرین کرام واقف ہیں کہ ۱۹۱۶ء کے میثاق کی رو سے جو کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مسٹر جناح کی وساطت سے طے ہوا صوبہ جات پنجاب اور بنگال کی کونسلوں میں مسلمان ممبروں کی تعداد ان کی آبادی کی نسبت سے بہت کم کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں منتقل ہو گئی۔ اس نقصان کا اثر اہل پنجاب کے قلوب پر بہت تھا۔ اس کی تلافی کے لئے ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ایک تدبیر نکالی اور اس کا تذکرہ الٰہ آباد کے جلسہ مسلم لیگ منعقدہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں اپنے خطبہ صدارت میں کیا۔ اس میں علامہ موصوف نے فرمایا تھا۔

”میری تمنا ہے کہ پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک سلطنت کے قیام کی کوشش کرنی چاہیئے۔ حکومت خود اختیاری سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر ہو یا اس سے باہر۔ ہندی مسلمانوں کے لئے مذکورہ بالا متحدہ سلطنت کی تعمیر مسلمانوں کا مقصد اعلیٰ ہونا چاہئے۔ اس تجویز کو نہرو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے اسے اس بنا پر رد کر دیا کہ اس پر عمل کرنے سے ایک ناقابل انتظام سلطنت ظہور پذیر ہو گی۔ یہ صحیح ہے جہاں تک کہ رقبہ کا تعلق ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کے بعض موجودہ صوبوں سے کمتر ہو گی۔ لیکن اگر انبالہ ڈویژن اور بعض دیگر غیر اسلامی اضلاع کو الگ کر دیا جائے تو اس کی وسعت بھی کم ہو جائے گی اور مسلم آبادی کا عنصر اور بھی بڑھ جائے گا۔ اس طرح غیر مسلم

عرضداشت کا مضمون بنایا تھا اور یورپ کے حربی انتخاب کو ناگفتہ بہ نتیجہ
تھا۔ اب ۱۹۳۸ء میں ہر وہ کوئی مذاہب رہتے ہوں، مگر ہندوستان کو مذہب کے
اعتبار سے تقسیم کرنے کی اسکیم ایک مسلمان طالب علم کے ذریعہ سے آئی۔ مگر غنیمت
ہے کہ اس وقت اس منصوبہ کی تبلیغ و اشاعت صرف چودھری رحمت علی تک محدود
رہی اور مسلمانوں کی سیاسی جماعت نے اسے لبیک نہیں کہا جس کی وجہ سے چودھری
صاحب نے مسلمانوں کے کسی لیڈر کو مذمت سے نہیں چھوڑا۔ اس زمانہ میں مسلم
لیگ اور اس کے پریذیڈنٹ مسٹر جناح سے بڑی شکایت تھی کہ وہ ہندوؤں سے مل
کر اتحادِ عمل کر رہے ہیں۔ مسلم لیگ جس قسم کا اتحادِ عمل کانگریس کے ساتھ کرتی رہی وہ تو
عیاں ہے اس نے کوئی موقع ایسا نہ ہونے دیا کہ کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ کر کے ملک
کو آزاد کرا دیا جاتا یا کوئی ایسی صورت نکالی جاتی جس سے مسلم عوام کا نفع ہوتا۔ اس
سے تو ہمیشہ گریز کیا گیا۔ البتہ اوپر کے طبقہ کے لوگوں کے نفع کا کام ہوتا تو فوراً کانگریس
سے کیا بلکہ ہندوؤں تک سے پورا اتحادِ عمل کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں صوبجاتی
کونسلوں کے انکشنوں میں مسلم لیگ کے امیدواروں نے کانگریس کے ہندوؤں سے خوب
خوب امدادیں لیں۔ البتہ وزارتوں کی تقسیم پر اختلاف ہوا تو ان ہی صاحب نے زمین و
آسمان کو ایک کر دیا۔ اور ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے جلسوں میں کانگریس کے خلاف
اپنے غصہ کا اظہار کیا۔

پاکستان بطور کوہ گراں کے

یہ بدیہی امر ہے کہ ۱۹۱۵ء سے لے کر اب تک جب انگریزوں سے ہندوستانیوں
کے ہاتھوں میں اختیارات منتقل ہونے کا مطالبہ کیا جاتا تو ہر موقع پر رجعت پسند مسلمان
آڑے آتے اور نت نئے مطالبات پیش کر کے حکومت کی امداد کرتے رہتے تھے
یہاں تک کہ ان مطالبات کی حد دستور تک پہنچا دی گئی تھی جن میں سے اتنے زیادہ

مطالبات منظور ہو چکے تھے کہ ان پر زور دینے کا موقع باقی نہ رہا تھا۔ کانگریس کے ساتھ
مشترکہ جدوجہد کے وقت جبکہ مطالبات کے ترکش میں کوئی تیر باقی نہ رہا تو مسٹر
جناح نے جن چودھری رحمت علی کے مجوزہ پاکستان کا مطالبہ انتخاب کر کے ۲۳ مارچ سنہ ۴۰ء
کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ لاہور میں پاس کر دیا اور اس طرح آزادی ہند کی راہ میں سنگ
گراں نہیں بلکہ مشکل کوہ گراں۔ اس لاہور ریزولیوشن کا خلاصہ یہ ہے۔

"مسلمانوں کے نزدیک کوئی آئین قابل منظوری نہ ہوگا جب تک کہ ہندوستان
کے شمال و مغرب اور شمال و مشرق میں ایسے خطے نہ بنا دیئے جائیں
جن میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہو۔ وہ خطے کامل آزاد ہوں گے۔ اور جن
صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے وہاں ان کا مذہب، کلچر، سیاست
اور دیگر حقوق بذریعہ قوانین محفوظ کئے جائیں گے"

یہی وہ اہم ریزولیوشن ہے جس کا نام پاکستان اسکیم رکھا گیا اور غیر مسلموں کی طرف
سے اس کی بے حد مخالفت ہوئی اور وہ ان کی چڑ بن گئی۔

مخالفت زیادہ تر اس وجہ سے ہوئی کہ اول تو ہندو مسلم لیڈروں میں پہلے ہی رنجش
ہو چکی تھی۔ اس کے بعد اکثریت کے صوبے بنانے کی تجویز کو پاکستان کا نام دے کر
ایک خوفناک شکل میں پیش کیا گیا۔ ورنہ گزشتہ ۲۵ سال کی تاریخ پر نظر ڈالنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ مسلمان لیڈروں کو اس پر اصرار تھا کہ ان کی اکثریت کے کوئی صوبے
بنائے جائیں اور نہ غیر مسلموں کی طرف سے ایسے صوبے بنائے جانے کی مخالفت تھی۔

پاکستانی علاقے مسلم اقلیت کے صوبے کس طرح بنے

کون نہیں جانتا کہ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی آبادی پچپن اور ترپن فی صدی
تھی۔ اگر ریاستوں کی آبادی کی نسبت سے ممبر لئے جاتے تو اس وقت پنجاب اور

ہمارے نزدیک جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ ملک کی دولت پیدا کرنے اور اس کے صرف کرنے میں مسلمانوں کا کیا حصہ ہوگا۔ شخصی حکومت کے زمانہ میں تو حکمران خواہ کیسا ہی مفلس اور نادار کیوں نہ ہو مگر اپنی قوت کے بل بوتے پر رعایا سے ٹیکس وصول کرکے اسے اپنی مرضی کے مطابق صرف کرسکتا ہے۔ برخلاف اس کے جمہوریت کا اصول یہ ہے کہ ٹیکس دینے والے لوگ ہی یہ تجویز کرتے ہیں کہ روپیہ کس طرح صرف کیا جائے

اس میں شک نہیں کہ پاکستانی علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد ساٹھ فیصدی ہوگی مگر سوال یہ ہے کہ ان ساٹھ فی صدی کی مالی حالت کیسی ہوگی اگر مالی اعتبار سے بھی مسلمانوں کا غلبہ ہوسکا تب تو وہ صحیح معنوں میں ملک پر حکمران ہوسکیں۔ برخلاف اس کے اگر ملک کا سرمایہ اور صنعت و حرفت و تجارت میں وہ پسماندہ رہیں گے اور ملک پر غیر قوموں کے سرمایہ داروں کا قبضہ ہوگا تو کیا اس حالت میں وہ صحیح معنوں میں پاکستان پر حکمرانی کرسکیں گے۔

اس بارہ میں مسلمانوں کی آئندہ حالت کا اندازہ ان کی موجودہ مالی حالت سے کچھ کچھ کیا جاسکتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ گزشتہ مردم شماری کی رپورٹیں بوجہ کاغذ کی قلت کے گورنمنٹ نے نہایت مختصر چھاپی ہیں اور ان میں مختلف پیشوں کے متعلق اعداد و شمار نہیں دیئے گئے ہیں۔ البتہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے اعداد ہمارے سامنے ہیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے صوبہ پنجاب میں ہندو مسلمانوں کی نسبتی مالی حالت معلوم ہوسکتی ہے۔ واضح رہے کہ پنجاب کے مسلمان نہ صرف صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کے مسلمانوں سے بلکہ دیگر صوبوں کے مسلمانوں سے کہیں زیادہ خوشحال ہیں۔ باوجود اس کے ان کی حالت دیگر اقوام پنجاب میں محنت کرنے اور تکلیف اٹھانے کے کام مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہیں اور ان کی محنت سے نفع اٹھانے کے کام غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

دستکاریوں کے سکولوں کو ملتا ہے۔ اور یہ حالت مسلمان وزیر تعلیم کے
زمانہ میں بھی رہی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم میں مسلمانوں کی اور بھی بدتر حالت
ہے۔ مسلم گرلس سکولوں کو سرکاری امداد بمشکل مل سکتی ہے۔ اور ضلع
راولپنڈی کے گورنمنٹ اور بورڈ کے سکولوں میں مسلم معلمات کو ہندوؤں
کی پرارتھنا میں شریک ہونا پڑتا ہے۔

"پنجاب میں صنعتی تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ اس سررشتہ کے
ڈائرکٹر کے تمام تر ہندو ہیں۔ ۲۲ ہیڈ ماسٹروں میں سے
صرف پانچ مسلمان ہیں۔ کسی زمانہ میں پنجاب کی صنعت پر مسلمان قابض
تھے۔ اب صنعتی تعلیم پانے والوں میں اُن کی شراکت برائے نام ہے۔ اس
لئے مسلمان صنعت سے خارج ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لدھیانہ
کے موزہ بنیان بنانے کے سکول سے مسلمان کاریگروں کا خروج ہوا
ہے۔ مسلمانوں کا کوئی معقول صنعتی بینک نہیں ہے۔ اس لئے اُن کے
کارخانے منتشر رہتے ہیں۔ ہندو اور سکھ اپنے بینکوں کی وجہ سے
صنعتی تجارت پر قابض ہیں۔ مسلمانوں کو صنعت میں بمشکل نوکریاں ملتی
ہیں۔ یہی حالت میڈیکل کالج میں ہے۔ مسلمان اپنی آبادی کے اعتبار سے
کم تعداد میں ہیں۔"

پنجاب کے تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کے مذہب اور کلچر کی جو ہتک ہو رہی
ہے اس کا اندازہ رپورٹ مذکور کے اس اقتباس سے ہوگا:

"کورس کی بعض کتابوں میں مسلمانوں کے اسماء دانستہ
بگاڑے گئے ہیں۔ ایک کتاب میں مسلمان کشمیریوں کو بزدل
بتایا گیا ہے اور انہیں دغا، مکر اور فریب کے فن میں ما-

اطمینان کے ساتھ روپیہ کا لین دین کرتا ہے اور وہ خونخوار غریب مسلمانوں کے
خون سے لکھ پتی نہ ہوا ہے اسے کیا ضرورت لاحق ہوگی کہ وہ بلا وجہ اپنی آسامیوں
کو اور اپنی چراگاہوں کو چھوڑ کر اور اپنی جائیدادیں بیچ کر دوسرے صوبہ میں جائے
بہر طرف یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ غریب مسلمانوں کو اپنا صوبہ چھوڑنا پڑا تو ان کا وہی حشر
ہوگا جو ۱۹۲۱ء کی ہجرت میں ہوا تھا۔ بات یہ ہے کہ اب بھی اگر بدقسمتی سے ایک
صوبہ کا مسلمان دوسرے صوبہ میں نوکری پا کر اس سلسلہ میں جا رہتا ہے تو مشہور یہی
ہے کہ غیر زبان ہونے کی وجہ سے وہاں کے لوگ اپنے صوبہ کے ہندو باشندوں کو جو
اُن کی زبان میں گفتگو کرتا ہے اس مسلمان بھائی پر ترجیح دیتے ہیں اور اسے غیر ملکی
قرار دے دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تبدیل آبادی کے طریقہ میں بھی غریب مسلمان
ہی ٹوٹے میں رہیں گے۔

پاکستان مرکزی حکومت کے نقطۂ نظر سے

مسٹر جناح کے مندرجہ بالا بیان سے قبل پاکستان
کے متعلق لوگ طرح طرح کے قیاسات کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں
کو مسلم اکثریت کے صوبوں کے پاکستان بن جانے سے نہ معلوم کتنے بے شمار
فوائد حاصل ہو جائیں گے۔ مگر اس بیان نے تو اس امر کو بالکل صاف کر دیا کہ جس طرح
پاکستان میں ہندو غیر مسلم ملک کی قانون سازی میں اور ملک کے انتظامات
میں مساوی طور پر شامل ہوں گے بجنسہ اسی طرح پاکستان میں بھی شریک کار رہیں گے اور
جیسا کہ کامل جمہوری حکومت ہوگی تو کیبنٹ یا ایگزیکٹو کونسل میں بھی ان کی شرکت
آبادی کی نسبت سے ہوگی۔ اب صرف مرکزی حکومت کا مسئلہ باقی رہ جاتا ہے
جس پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

مسٹر لیاقت [illegible] نظریہ یہ ہے کہ پاکستان کا تعلق ہندوستان کی مرکزی

کرتی ہے۔

مختصر یہ کہ اس پاکستانی سکیم کو جس نظر سے بھی دیکھا جاتا ہے وہ اسی قسم کی اسکیم معلوم ہوتی ہے جیسی کہ بنگالیوں کی شورش کے وقت لارڈ کرزن نے کھڑی کی تھی اور مسلم صوبہ بنانے کے لئے مسلمانوں کو اپنے ساتھ کر کے ہندوؤں کے مقابلہ میں کھڑا کیا تھا۔ پھر جب اس کی ضرورت نہ رہی اور ہندوؤں کی طرف سے زیادہ دباؤ پڑ گیا تو تقسیم بنگالہ کو منسوخ کر کے اسلامی صوبہ کا خاتمہ کر دیا اور مسلم لیڈران اس صدمہ سے مبہوت ہو گئے حتیٰ کہ نواب سلیم اللہ صاحب نواب ڈھاکہ سیاسی زندگی سے دستبردار ہو کر چند ماہ بعد انتقال کر گئے اور یہ صدمہ اپنے ساتھ لے گئے کہ غریب مسلمانوں کی ہندوؤں سے عداوت بھی ہو گئی اور اسلامی صوبہ بنا بنایا توڑ دیا گیا اور نواب وقار الملک بہادر جو چند سال قبل طلباء کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ اپنے کو مثل ایک انگریزی فوج کے سمجھ کر سلطنت برطانیہ کے استحکام کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

> "گورنمنٹ کی پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانہ کے تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گزر گیا بدوں اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں جان بھی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف ہوگی۔ [illegible]
>
> [illegible]"

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کے ذریعہ مسلمانوں کی علیحدگی سے ملک کی تحریک آزادی میں کمزوری آ جائے گی اور اسی نسبت سے ہندوستان کو بھی انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے میں دیر لگے گی۔ مگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اب بھی اس تحریک نے کافی قوت پکڑ لی ہے۔ بوجہ تعلیم یافتہ اور دولت مند ہونے کے اس وقت ان کا پروپیگنڈہ یورپ اور تمام دنیا میں ہو رہا ہے۔ ملک کی اقتصادی حالت بہتر

ان میں سب سے اوّل کرنل ڈنلاپ اسمتھ پرائیویٹ سکریٹری وائسرائے تھے جنہوں نے مسلمانوں کی عرضداشت کا مضمون بتایا تھا۔ اس کے بعد مسٹر آرچبولڈ پرنسپل علی گڑھ کالج تھے جنہوں نے کرنل اسمتھ کا مجوزہ مضمون نواب محسن الملک کو بذریعہ ایک چٹھی کے بتایا تھا۔ اس کے بعد ہز ہائی نس سر آغا خاں کا نمبر ہے جنہوں نے وائسرائے کے سامنے عرضداشت پیش کی۔ اور سب سے آخر لارڈ منٹو وائسرائے تھے جنہوں نے مسلمانوں کے سر پڑتے ہوئے مطالبہ کو تسلیم کر کے اسے انڈیا آفس سے منظور کرانے میں پوری چوٹی کا زور لگا دیا اور یہاں تک کہا کہ ہم نے تو اس سے ساٹھ ملین دو ہم انگریزوں کی حفاظت بجز فرقہ وارانہ انتخاب کے اور کس بات سے ہو سکتی ہے جب یہ مطالبہ منظور ہو گیا تو انگلستان میں خوشیاں منائی گئیں کہ اب ہندوستان ایک قوم نہ رہے گی بلکہ دو قومیں جو آپس میں لڑتی رہیں گی۔ آج چالیس سال بعد ہز ہائی نس سر آغا خاں کو عزت حاصل ہے کہ مذہبی انتخاب میں سے ایک سیاسی میدان میں موجود ہو کر اپنی سعی و عمل کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں اور فخر کر سکتے ہیں کہ جب کہ انگریزوں سے ہندوستان کی طرف سے "ہندوستان چھوڑ دو" کا مطالبہ کیا جا رہا ہے ہز ہائی نس کی بدولت کچھ مسلمانوں کی طرف سے اصرار کیا جا رہا ہے کہ حضور والا یہاں سے تشریف نہ لے جائیں بلکہ ہمیں ہندوؤں کی دست برد سے بچانے کے لئے مستقل طور پر ایک ثالث ہندوستان پر قابض رہیں۔

پاکستان بننے کے بعد کی حالت

ناظرین کو معلوم ہے کہ سنہ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے سمجھوتہ کی رو سے مختلف صوبوں کی کونسلوں اور اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نمائندگی میں جو کمی بیشی کی گئی تھی وہ حسب ذیل تھی:

	۲	۳	۴
نام صوبہ	مسلمانوں کی فیصدی آبادی	کونسل میں مسلم ممبروں کی فی صدی تعداد	آبادی کی نسبت سے مسلمانوں کی کمی یا بیشی
پنجاب	۵۵	۵۰	۵
بنگال	۵۳	۴۰	۳
بمبئی	۲۰	۳۳	۱۳
صوبہ متحدہ	۴	۳۰	۲
بہار	۱۰	۲۵	۱۵
مدراس	۷	۱۵	۱
صوبہ متوسط	۴	۱۵	۱۱

اس نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس سمجھوتہ کی رُو سے اکثریت کے دو صوبوں پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی نمائندگی بقدر ۵۰ و ۴۰ کے گھٹا دی گئی تھی اور پاکستان ہونے پر وہ بڑھا کر مسلم آبادی کے مطابق ۵۵ اور ۵۴ فی صدی کر دی جائے گی۔ اس کے ساتھ مسلم اقلیت کے پانچ صوبوں میں مسلم ممبروں کی نمائندگی گھٹا کر اُن کی آبادی کے رُو سے نقشہ نمبر ۳ کے مطابق کر دی جائے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ اس تبدیلی سے پنجاب و بنگال میں تو مسلمانوں کی برائے نام اکثریت ہو گی مگر مسلم اقلیت کے صوبوں میں بعض جگہ نصف کے قریب مسلم نمائندگی..... کاش مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی قربانی سے مسلم اکثریت کے صوبوں کو معتد بہ فائدہ پہنچ جاتا تو نہیں کچھ ضرر آتا۔

چارہ کار اور علاج

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے یہ ٹھان لی ہے کہ مسلمانوں کو پاکستان دے کر کم سے کم اس حصۂ ملک پر

[illegible] کی صحت عامہ کو ترقی دینے کے لئے تعمیری کاموں پر کثیر رقم صرف
کرنا تاکہ دیہات تک میں امراض کے جراثیم کو ہلاک و رفع کیا جا سکے۔
یہ کام بھی اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملک سے روپیہ
باہر جانا بند نہ ہو۔ موجودہ حالت میں تو ہندوستان میں زمین اور روپیہ
کی کمی نہیں۔ مگر جب کہ خود ہندوستان میں کروڑوں آدمی فاقے سے مرتے
ہیں افسوس کہ یہاں کی زرعی پیداوار سے اہل یورپ کی نسل پروری کر کے
ان کی صحت عامہ کو ترقی دی جاتی ہے اور ان کا معیار زندگی مسلسل
بڑھایا جاتا ہے۔

۴۔ سب سے آخر میں اس اعتبار سے کہ اس کے بغیر مندرجہ بالا تدابیر پر عمل کرنا
مشکل ہے موجودہ طریق انتخاب کی تبدیلی ہے۔ انگلستان کے ایک
مشہور لبرل خیال کے انگریز مسٹر ہیلس فورڈ نے ہندوستان کی کونسلوں
اور اسمبلیوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ یہاں تو وزیروں اور ممبروں کا کام یہ ہے کہ
وہ عہدوں اور منافع کے کاموں کو آپس میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ نیز
فرقہ وارانہ انتخاب نے نفع عامہ کے کاموں سے مستغنی و بے پروا کر دیا
ہے وجہ یہ ہے کہ موجودہ حالت میں ہندو امیدوار ممبری کو اس وقت زیادہ
ووٹ ملتے ہیں جب وہ یہ ثابت کرے کہ وہ ان کے مذہب اور کلچر کی حفاظت
کے لئے مسلمانوں سے لڑے گا۔ اسی طرح مسلمان امیدوار ممبری کو زیادہ
ووٹ یہ کہہ کر ملتے ہیں کہ وہ ہندوؤں سے لڑے گا۔ یہ حالت اس قدر بڑھتی
ہے کہ امیدواروں کی خواہش ہوتی ہے اگر انتخاب کے قریب کوئی ہندو مسلم
فساد ہو جاتا ہے تو دونوں کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وزیروں
اور ممبروں کے درمیان فرقہ وارانہ یا جداگانہ طریق انتخاب کی وجہ سے

میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریباً ہر قسم کی کاروباری زندگی میں موجود ہیں اور قرینہ ہے کہ ہر پیشہ کے کاروبار اور پیشوں میں بھی وہ دیگر قوم کے دوش بدوش چلنے لگیں۔

۱۔ مسلم عوام کی پوچھ گچھ

۱۹۳۵ء سے کانگریس دیہات کے لوگوں میں بیداری پیدا کرنے اور انہیں ابھارنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر مسلم عوام اس سے مستفید نہ ہوتے تھے۔ کانگریس کے ہندو کارکن انہیں مسلمان سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے اور مسلم لیگ کی تبلیغ دیہات تک نہ پہنچتی تھی۔ اس وجہ سے مسلمانوں کا غریب طبقہ بالکل بے بسی کی حالت میں پڑا رہتا۔ البتہ جہاں جہاں جمعیۃ العلماء اور احرار کا اثر تھا وہاں لوگوں کے کانوں میں کچھ سیاسی باتیں پڑ جاتی تھیں۔ گزشتہ چند سال سے کانگریس اور مسلم لیگ میں مقابلہ ہوا تو مسلم لیگ بھی غرباء کی طرف متوجہ ہوا اور دو دو آنے کے ممبر بنانے لگی۔ اس طریقہ پر کثیر تعداد میں مسلم عوام کی شرکت سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ اُن میں اپنے حقوق حاصل کرنے کا احساس پیدا ہوگا۔ وہی وقت ہوگا جب کہ فرقہ وارانہ ووٹوں کا حق غرباء کے ہاتھ سے نکلے گا اور وہ بھی ووٹ کے حق کے اعتبار سے ممبروں کے برابر ہو جائیں گے۔

۲۔ مسلم لیگ کی ذہنیت میں تبدیلی

باوجود حکومت کی صد سالہ نازبرداری اور سخت گیری کے ۱۹۰۶ء تک مسلمانوں

کی یہ کیفیت رہی کہ مسٹر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ نے اُن کی نسبت فرمایا کہ مسلمان
بمنزلہ ایک زخمی شیر کے ہیں۔ چنانچہ قدیم تعلیم یافتہ مسلمان بوجہ اپنی مجاہدانہ سیرت
کے اسی زمرہ میں شمار ہوتے رہے۔ البتہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تربیت چونکہ
انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی اس لئے اُن پر کمزوری اور بزدلی طاری ہو گئی اور اُن کی
سیاسی جماعت مسلم لیگ ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی رہی اور اس نے
آئینی جدوجہد سے کبھی سرمُو تجاوز نہیں کیا مگر کچھ عرصہ سے پاکستانی منصوبہ نے
اس جماعت کے لوگوں کی ہمت وجرأت میں یہاں تک اضافہ کیا ہے کہ ۱۹۴۶ء
کے اجلاس دہلی میں آزاد پاکستان کے حصول کے لئے ہر قربانی پیش کرنے
کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے بعد سے مسلم لیگ کے لیڈر تو اپنے نوجوانوں
سے آزاد خیال جماعتوں کے رہنماؤں کی جگہ جگہ توہین کراتے رہے۔ مگر ۱۹۴۶ء
کے الیکشنوں میں مذہبی پیشواؤں کی توہین اور آبرو ریزی سے گزر کر اُن پر جسمانی
حملے کرا کر اپنے سابق لیڈروں کی اس توقع کو پورا کر دکھایا کہ مسلمان بہادری کی دنیا
میں مثل انگریز سولجروں کے کشت وخون کریں۔ مگر اُن کے اس فعل سے مایوسی کی
کوئی وجہ نہیں بلکہ پوری اُمید ہے کہ اپنے بزرگوں دینی علماء پر ہاتھ صاف کرنے
کے بعد اُن میں اس قدر جرأت ہو جائے گی کہ وہ قریب وقت میں اپنی قوم و ملک
کے حقیقی دشمنوں کے مقابلہ میں آ سکیں گے۔

۴۔ علماء دین کی شرکت سیاسیات میں[۲]

ہندوستان کی تاریخ صاف بتا رہی ہے کہ مذہبی طبقہ نے بالعموم ملوکیت اور
سرمایہ داری کے قیام و ترقی میں امداد کی۔ یورپ میں پادریوں اور برہمنوں نے مل کر

غرباً کو مجبور تھا۔ اس لئے بار بار کی تحریک ان دونوں کے خلاف رہی تھی۔ ٹرکی میں سلطنت و جدید مدنی اور سیاسی تجاویز نے مل کر نوجوان ترکوں کو پیدا کیا اور سلطنت کی تائید میں شیخ الاسلام قسطنطنیہ نے فتویٰ دیا کہ جو لوگ مصطفیٰ کمال اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کردیں گے وہ جنّت میں جائیں گے۔ مگر مسلمانانِ ہند کی انتہائی خوش نصیبی ہے کہ اُن کے علماء دین ابتدا سے ملکی تحریکات کے نہ صرف حامی ہیں بلکہ اُس پر اپنی جانیں فدا کرتے رہے ہیں۔

چنانچہ کانگریس کے قائم ہونے کے وقت سے علماء نے اس کی شرکت کے لئے فتوے دیئے۔ پھر مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو سیاست کی طرف راغب کیا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے کامل جمہوری حکومت کا منصوبہ قائم کیا۔ اور اب مسلسل پانچ سال سے مولانا ابوالکلام آزاد بہ حیثیت صدر کے کانگریس کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ غرض جس طرح ٹرکی کی نوجوان پارٹی نے کامل جمہوری حکومت تجویز کرکے ٹرکی کا مسئلہ حل کیا تھا اسی طرح علماء ہند نے کامل جمہوری سلطنت کا منصوبہ قائم کرکے ہندوستان کے پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے مسئلہ کو بڑی خوبی سے سُلجھا دیا اور مذہب و سیاست کی دونوں دھاروں کو خدا کے حکم سے یکجا دریا میں بہا دیا۔ اس طرح کہ وہ ایک دوسرے میں مخلوط بھی نہیں ہوتے اور دونوں ساتھ ساتھ بہے جا رہے ہیں:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ	اسی نے دو طرح کے دریا بہتے
بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ فَبِأَيِّ	دو سمندر بنائے کہ آپس میں ملتے ہیں درمیان
آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ يَخْرُجُ مِنْهُمَا	ہیں دونوں میں ایک پردہ حائل رہتا ہے
اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ فَبِأَيِّ آلَاءِ	ایک دوسرے کی طرف بڑھ نہیں سکتے تو
رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۔	پھر تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے

مکروگے دونوں سمندروں سے موتی بھی نکلتے ہیں اور مونگے بھی تو تم اپنے پروردگار
کی کون کون سی نعمتوں سے مکروگے۔

مختصر یہ کہ ہمارے ہند کی اس قدر وسیع اخلاقی اور عملی سیاست ہے۔ صحیح بنیاد سے
ضروری مسلمانوں کا مستقبل نہایت روشن نظر آرہا ہے۔
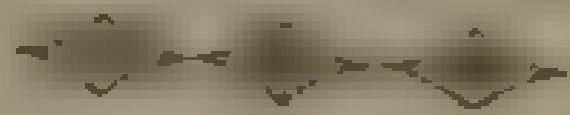
روشن مستقبل

از مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی

لو وہ گہن سے نکلا سورج ۔ برجِ فتن سے نکلا سورج

روشن اپنا مستقبل ہے

لال بھبوکا اس کی کرنیں ۔ کیسی پیاری پیاری کرنیں

روشن اپنا مستقبل ہے

تاریکی کا اب نام نہیں ۔ مایوسی کا کچھ کام نہیں

روشن اپنا مستقبل ہے

سوئی ہوئی سب خلقت جاگی ۔ ہندوستان کی قسمت جاگی

روشن اپنا مستقبل ہے

اہلِ وطن کا شکوہ کیوں ہو ۔ مقصد ایک ہے جھگڑا کیوں ہو

روشن اپنا مستقبل ہے

مسلم کی ذہنیت بدلی! ۔ ہندوستان کی حالت بدلی!

روشن اپنا مستقبل ہے

مسلم میں ہے قوم پرستی ۔ حبِ ملک سیاست اس کی

روشن اپنا مستقبل ہے

ناؤ قریبِ ساحل آئی! ۔ آزادی کی منزل آئی

روشن اپنا مستقبل ہے

ضمیمہ نمبر ۲

سیر آزادیٔ ہند!

میں مزاحمتوں کے بتدریجی ارتقاء کا تاریخ وار نقشہ

نمبر ترتیبی	تفصیل مزاحمت	سال	نام جماعت
۱	دنیا نے ملک کو سرپرست بنا کر ایک یوروپین ایڈیٹر کے ذریعہ سے کانگریس کی مخالفت۔	سنہ ۱۸۸۸	بذریعہ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن علی گڑھ بدیر سٹر تھیوڈور بیک۔
۲	جمہوری ریاستی سلطنت کے موجودہ قانون کے خلاف عرضداشت۔	سنہ ۱۸۹۲	
۳	حفاظت و استحکام سلطنتِ برطانیہ کے لئے تدابیر۔	سنہ ۱۸۹۳	بذریعہ محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن بدر سکرٹری مسٹر بیک
۴	ہندوستان میں سول سروس کا امتحان ہونے کی مخالفت	سنہ ۱۸۹۳	

سال	انڈین نیشنل کانگریس: مقام	انڈین نیشنل کانگریس: پریسیڈنٹ	مسلم لیگ: مقام	مسلم لیگ: پریسیڈنٹ
سنہ ۱۹۰۶ء	کلکتہ	دادا بھائی نوروجی	ڈھاکہ	نواب وقار الملک
سنہ ۱۹۰۷ء	سورت	رش بہاری گھوش	کراچی	آدم جی پیر بھائی
سنہ ۱۹۰۸ء	مدراس	رش بہاری گھوش	امرتسر	مسٹر سید علی امام
سنہ ۱۹۰۹ء	لاہور	پنڈت مدن موہن مالویہ	دہلی	ہز ہائی نس سر آغا خاں
سنہ ۱۹۱۰ء	الہ آباد	سر ولیم وڈر برن	ناگپور	سید نبی اللہ
سنہ ۱۹۱۱ء	کلکتہ	پنڈت بشن نرائن در	کلکتہ	نواب سلیم اللہ
سنہ ۱۹۱۲ء	بانکی پور	آر این مدہولکر	لکھنؤ	مسٹر میاں محمد شفیع
سنہ ۱۹۱۳ء	کراچی	نواب سید محمد بہادر	آگرہ	سر ابراہیم رحمت اللہ
سنہ ۱۹۱۴ء	مدراس	بھوپندر ناتھ باسو	؍؍	؍؍
سنہ ۱۹۱۵ء	بمبئی	سر ایس پی سنہا	بمبئی	مسٹر مظہر الحق
سنہ ۱۹۱۶ء	لکھنؤ	امبکا چرن مزمدار	لکھنؤ	مسٹر محمد علی جناح
سنہ ۱۹۱۷ء	کلکتہ	مسز اینی بیسنٹ	کلکتہ	راجہ محمد علی محمد خاں
سنہ ۱۹۱۸ء	دہلی	پنڈت مدن موہن مالویہ	دہلی	اے کے فضل الحق
سنہ ۱۹۱۸ء	بمبئی خاص اجلاس	سید حسن امام	؍؍	؍؍

سال	انڈین نیشنل کانگرس — مقام	انڈین نیشنل کانگرس — پریسیڈنٹ	مسلم لیگ — مقام	مسلم لیگ — پریسیڈنٹ	خلافت کمیٹی — مقام	خلافت کمیٹی — پریسیڈنٹ	جمعیۃ العلماء ہند — مقام	جمعیۃ العلماء ہند — پریسیڈنٹ
سنہ ۱۹۱۹ء	امرتسر	پنڈت موتی لال نہرو	امرتسر	مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں	امرتسر	مولانا شوکت علی	امرتسر	مولانا عبدالباری فرنگی محلی
سنہ ۱۹۲۰ء	کلکتہ	لالہ لاجپت رائے	..	..	..	..	..	..
سنہ ۱۹۲۰ء	ناگپور	سی. وجے راگھو چاریہ	ناگپور	ڈاکٹر مختار احمد انصاری	ناگپور	مولانا عبدالماجد بدایونی	دہلی	شیخ الہند مولانا محمود الحسن
سنہ ۱۹۲۱ء	احمد آباد	مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں	احمد آباد	سید فضل الحسن حسرت	احمد آباد	مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں	لاہور	مولانا ابوالکلام آزاد
سنہ ۱۹۲۲ء	گیا	سی. آر. داس	..	..	گیا	ڈاکٹر مختار احمد انصاری	گیا	مولانا حبیب الرحمن دیوبندی
سنہ ۱۹۲۳ء	دہلی	مولانا ابوالکلام آزاد	..	..	..	..	..	..
سنہ ۱۹۲۳ء	کوکناڈا	مولانا محمد علی	لکھنؤ	غلام محمد بھرگری	کوکناڈا	مولانا شوکت علی	کوکناڈا	مولانا حسین احمد مدنی
سنہ ۱۹۲۴ء	—	—	لاہور	مسٹر محمد علی جناح	—	—	—	—
سنہ ۱۹۲۴ء	بلگام	مہاتما گاندھی	بمبئی	سر سید رضا علی	کلکتہ	مولانا محمد علی	..	..
سنہ ۱۹۲۵ء	کانپور	مسز سروجنی	علی گڑھ	سر عبدالرحیم	کانپور	مولانا ابوالکلام آزاد	مراد آباد	مولانا سید محمد سجاد
سنہ ۱۹۲۶ء	گوہاٹی	سرینواس آئینگر	دہلی	سر شیخ عبدالقادر	دہلی	مولانا سید سلیمان ندوی	کلکتہ	مولانا سید سلیمان ندوی
سنہ ۱۹۲۷ء	مدراس	ڈاکٹر مختار احمد انصاری	کلکتہ	سر مولوی محمد یعقوب	مدراس	مولوی محمد شفیع داؤدی	پشاور	مولانا سید انور شاہ

۲۶۔ خطوط بنام باشندگانِ ہند

زیر پریس

۲۷۔ ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش۔ از خالدہ ادیب

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔